پاکستان میں دکنیات کی تحقیق: روایت اور امکانات

(سخاوت مرزا، افسر صدیقی امروہوی اور جمیل جالبی کے حوالے سے)

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار:

روبینہ تبسم

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۲

پاکستان میں دکنیات کی تحقیق: روایت اور امکانات

(سخاوت مرزا، افسر صدیقی امروہوی اور جمیل جالبی کے حوالے سے)

مقالہ نگار:

روبینہ تبسم

یہ مقالہ

پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۲

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **پاکستان میں دکنیات کی تحقیق: روایت اور امکانات**

پیش کار:ر **روبینہ تبسم**

رجسٹریشن نمبر ٦٨٦ /P/U/F١٧

:شعبۂ اردو زبان وادب

ڈاکٹر شفیق انجم: ---------------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی: ---------------

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

میجر جنرل شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز ملٹری (ر): ---------------

ریکٹر

تاریخ-----------------

اقرارنامہ

میں، روبینہ تبسم حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی۔ ایچ۔ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر شفیق انجم کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

____

روبینہ تبسم

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۲ء

فہرست ابواب

نمبر	عنوان
II	مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم
III	اقرار نامہ
IV	فہرست ابواب
VII	Abstract
VIII	اظہار تشکر

باب اوّل: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف) موضوع کا تعارف اور اصولی مباحث	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۱
iii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۲
iv۔ تحقیق کی اہمیت	۳
v۔ تحدید	۳
vi۔ مقاصد تحقیق	۳
vii۔ تحقیقی سوالات	۳
viii۔ نظری دائرہ کار	۴
ix۔ پس منظری مطالعہ	۵
x۔ تحقیقی طریقہ کار	۵
ب) دکنی ادب کی ابتدائی تحقیقات	۶
ج) پاکستان میں دکنیات کی تحقیق: ابتدائی کاوشیں	۱۲
د) پاکستان میں دکنیات کے اہم محققین: تعارف اور کام کا مختصر جائزہ	۳۲
ا۔ سخاوت مرزا	۳۲

۲۔ افسر صدیقی امروہوی ۴۲

۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ۴۶

حوالہ جات ۴۹

باب دوم: تحقیق دکنیات میں سخاوت مرزا کا کردار: تجزیاتی مطالعہ بحوالہ کتب ۵۴

الف) من لگن از محمود بحری ۵۶

ب) مخزن اسرار حقیقت از سخاوت مرزا ۶۶

ج) تذکرہ حدیقہ المرام از مہدی واصف ۷۹

د) دیوان قاسم از سخاوت مرزا ۸۵

حوالہ جات ۱۰۳

باب سوم: تحقیق دکنیات میں افسر صدیقی امروہوی کا کردار: تجزیاتی مطالعہ ۱۰۷

الف) تذکرہ عروس الاذکار از نصیر الدین نقش ۱۰۸

ب) بیاض مراثی از افسر امروہوی ۱۱۶

ج) سنگھاسن بتیسی از فقیر دکنی ۱۲۸

د) نوسرھار از شاہ اشرف بیابانی ۱۴۲

حوالہ جات ۱۵۸

باب چہارم: تحقیق دکنیات میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا کردار: تجزیاتی مطالعہ ۱۶۳

الف) کدم راؤ پدم راؤ از فخر دین نظامی ۱۶۶

ب) دیوان حسن شوقی از جمیل جالبی ۱۸۳

ج) دیوان نصرتی از ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۹۵

د) قدیم اردو کی لغت از ڈاکٹر جمیل جالبی ۲۱۴

حوالہ جات ۲۲۲

باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات ۲۲۷

الف) مجموعی جائزہ ۲۲۷

ب)	نتائج	۲۳۵
ج)	سفارشات	۲۳۶
	کتابیات	۲۳۸
	ضمیمہ	۲۴۲

ABSTRACT

Title of my Thesis: Research on Deccan Literature in Pakistan: Tradition and Possibilities (With reference to Sakhawat Mirza, Afser Siddiqui Amrohvi, and Jamil Jalbi)

Hyderabad Deccan has been the caution Culture, Civilization and Literature. "Liarsan Datasi" a renowned orientalist, was the first peron who made an Organized and authentic research on Deccan Literature. A larg number of researchers participated in the research of this great literary heritage and made great contributions in Urdu.

In this thesis has been introduced the contribution of those researchers, they were the foremost Dolkors of Hyderabad Daeean, whose articles were published in famous Journals of Ind. o Pak. The made great contribution in the field of Daccaniyat by editing books, manoskipts and articles.

The name of Dr. Mohiuddin Qadri 2or, Professor Abdul Qadir Sarwari, Naseer Uddin Hashmi and Molvi Abdul Haq and worth mentioning in relation to recovery of Deceami Literature. We are highly indebted to the great men with whose efforts, a permanent foundation was marked in Urdu literature which covers more or less there centuries. The process of recovery and editing of Deccami literature, which started with Garsan Datasi, was initiated by various researchers in the last quarter of the twentieth century and sevral texts were compiled and published in which the literary importance of the text and the linguistic awareness were highlighted. Some texts were unique manuscripts whose editing filled the linguistic gap of Urdu literature in the ancient literature. In ancient literature, there is literary capital on topics such as mentions, biographic, religious issues, manusripts of Sufis, Masnavis, Marathi and ancient gemres of Speech.

The names of Afser Siddiqui Amrohawi and Dr. Jameel Jalbi are important. In this paper, we have presented on overview of the work of these three researchers on Deccani literature. Their works include books of poets, biographies, dhikrs, masnavis and dictionaries.

اظہار تشکر

سب سے پہلے میں سپاس گذار ہوں خدائے بزرگ و برتر کی جس کی دی ہوئی ہمت اور توفیق کی بدولت اس کام کو بروقت پایہ تکمیل تک پہنچا پائی۔ اللہ پاک نے اپنے خاص کرم اور عطا سے تحقیق کے اس مشکل کام کو میرے لیے آسان بنایا۔

ازاں بعد اپنے تمام محترم اساتذہ کرام کی ممنونِ احسان ہوں جنھوں نے ہر قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور ہر آن مجھے نئے عزم سے نوازا۔ مزید بر آں میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کے صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ اور رابطہ کار ڈاکٹر صائمہ نذیر صاحبہ کی بھی تہہ دل سے ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی ہر قدم پر میری شامل حال رہی۔

مقالے کی تکمیل میں کلیدی کردار میرے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر شفیق انجم کا رہا جن کے علم، رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے ہر آن کارزارِ تحقیق میں سرگرداں رکھا۔ موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہر ہر مرحلے پر ان کی رہنمائی حاصل رہی۔

تہہ دل سے شکر گذار ہوں میرے رفیق حیات رانا شہباز خالد، عزیز از جان بہن رخشندہ تبسم، فارحہ خالد اور تمام احباب جن کا تعاون اور پر خلوص حوصلہ افزائی ہر قدم پر میرے شامل حال رہی۔ اللہ پاک ان تمام سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

روبینہ تبسم

پی ایچ۔ ڈی اسکالر

باب اول

موضوع کا تعارف اور اصولی مباحث

الف: تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

اس مقالے کا موضوع "پاکستان میں دکنیات کی تحقیق: روایت اور امکانات" ہے۔ جیسا کہ صاحبان اردو ادب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ دکن کی سرزمین کو ادبی اور لسانی حوالے سے اردو ادب کا اولین مرکز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ دکنی دور، اردو ادب کی تاریخ کا اولین باب ہے۔ اس کے تفصیلی مطالعے کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل تصور کی جاتی ہے۔ دکنی ادب سے مراد اردو ادب کا وہ اولین اور قدیم ادبی سرمایہ ہے جو فتح دکن سے قبل لکھا گیا۔ اس ضمن میں گلبرگہ، بیدر، گولکنڈہ، اورنگ آباد، کڑپہ، کرنول اور احمد آباد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں کے شعرا و ادبا نے خصوصاً اسلامی ترویج و تبلیغ اور ثقافتی مظاہر کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔

صدیوں کے عبور و مرور کے بعد بھی اس ادب کا کچھ حصہ کتابوں، رسالوں یا قلمی شکل میں محفوظ ہے۔ دکنی ادب کا یہ دور تقریباً دو سو سال کی وسعت کا حامل ہے۔ دکنی ادب کے اس دور کے تحقیقی، تنقیدی مطالعہ کے بغیر موجودہ اردو زبان ک و ادب کا مطالعہ ثمر آور نہیں ہو سکتا۔ دکنی ادب کا یہ سرمایہ ہم تک کئی محققین کی انتھک کوششوں اور محنتوں کے بعد پہنچا ہے۔ ان محققین نے دکنی ادب کے متون کو پڑھنے، سمجھنے اور معاصر اردو میں دنیا تک پہنچانے میں قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ پس یہ جاننا بے حد اہم ہے کہ یہ کوششیں کیا تھیں اور مذکورہ محققین کا متعلقہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا کردار رہا ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر پاکستان میں دکنیات کی تحقیق کے بارے میں زیرِ نظر موضوع منتخب کیا گیا ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ:

دکنی ادب کی تحقیق کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس سے تاریخی و لسانی مسائل کو سمجھنے کے لیے مفید اور کارآمد مواد سامنے آتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے اس روایت کو حکیم شمس اللہ قادری، محی الدین قادری زور، مولوی عبدالحق اور نصیر الدین ہاشمی نے آگے بڑھایا۔ قیام پاکستان کے بعد مولوی عبدالحق کی تحریک پر کئی دیگر محققین نے نمایاں اور قابل قدر کام کیے۔ ان میں سخاوت مرزا، افسر امروہوی اور جمیل جالبی کی تحقیقات معیار

اور مقدار کے لحاظ سے نہایت قابل ذکر ہیں۔ ان تحقیقات کا اختصاص کیا ہے اور مذکورہ محققین نے کن ماخذ کی بنیاد پر کس تکنیک واسلوب کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے، یہ جاننے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے ایک وسیع تر تحقیقی تجزیے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ زیر نظر موضوع "پاکستان میں دکنیات کی تحقیق: روایت اور امکانات" کے ذریعے ان تحقیقات کے تجزیاتی مطالعے کی کوشش کی گئی ہے۔

iii.موضوع پر ماقبل تحقیق:

دکنی ادب پر تحقیق بیسویں صدی کے پہلے حصے سے شروع ہو چکی تھی جس میں سر کردہ محققین میں گارساں دتاسی کا نام شامل ہے۔ جس نے ۱۸۳۳ء میں پیرس سے "دیوان ولی" مرتب کر کے شائع کیا۔ شمس اللہ قادری نے دکنی اردو کے موضوع پر پہلا تعارفی مضمون ۱۹۱۰ء میں لکھنو کے رسالے "لسان العصر" میں لکھا۔ ۱۹۱۱ء میں مولوی عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری نے دکنی شعرا کا ضخیم تذکرہ "محبوب ذی المنن تذکرہ شعرائے دکن" شائع کیا۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں مولوی عبدالحق نے "کلیات محمد قلی قطب شاہ" پر ایک مبسوط عالمانہ تحقیقی مضمون رسالہ اُردو میں لکھا جو کہ اورنگ آباد سے شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں حکیم شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم" ۱۹۲۳ء میں نصیر الدین ہاشمی کی تاریخ ساز کتاب "دکن میں اردو" اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی اردو شہ پارے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔

دکنی ادب کے محققین میں مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، افسر امروہوی اور سخاوت مرزا کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ ان محققین کے تحقیقی کارنامے ناقابل فراموش ہیں لیکن قیام پاکستان کے بعد کے دکنیاتی محققین کی خدمات پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ راقمہ نے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد کے تحت ایم فل کا ایک مقالہ لکھا جو کہ سخاوت مرزا کے مقالات کی تدوین پر مشتمل تھا۔ یہ پاکستان میں سخاوت مرزا کے حوالے سے پہلا تحقیقی کام تھا۔ اسی کام کو آگے بڑھاتے ہوئے دیگر محققین دکنیات کے مطالعے کے لیے زیر نظر موضوع کیا گیا۔

مجوزہ تحقیقی موضوع اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس تحقیق میں ہم پاکستان کے تحقیق دکنیات کے نمائندہ محققین کے حالات و کردار اور دستیاب تالیفات و تخلیقات کا جدید تحقیقی اصولوں کے مطابق مطالعہ کیا گیا ہے۔ یوں اپنی اہمیت وانفرادیت کے اعتبار سے پاکستان میں یہ اولین تحقیق ہے۔

iv۔ تحقیق کی اہمیت:

قیام پاکستان کے بعد جب حیدر آباد کے نامور محققین ہجرت کر کے پاکستان پہنچے تو اکثر نے کراچی کو اپنا مسکن بنایا اور تحقیق دکنیات کی وہ روایت جو حیدر آباد میں جاری تھی یہاں بھی برقرار رکھا۔ ان سرکردہ علمائے ادب نے نہایت وقیع اور قابل ذکر تحقیقی کام سرانجام دیئے۔ ایک زمانے تک تحقیقات کا یہ سلسلہ جاری رہا مگر زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے مخالف صورتحال سامنے آنے لگی اور تحقیق کا یہ تواتر و تسلسل سست روی کا شکار ہو گیا۔ مستزاد یہ کہ وہ بزرگ محققین جو کہ بجائے خود علم و تحقیق کا مخزونہ تھے۔ آہستہ آہستہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر وہ ادارے جو دکنی تحقیق اور اشاعت وترویج کا مرکز تھے۔ رفتہ رفتہ ارباب اختیار کی عدم توجہی کا شکار ہو گئے اور تحقیق دکنیات سست روی کا شکار ہوتی ہ چل ی گیئ م۔ یہ مقالہ تحقیق کی اس روایت کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش ہے۔ لہٰذا اس تحقیق کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

v۔ تحدید:

زیر نظر موضوع کے تحت کی جانے والی تحقیق میں ہم نے ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک کی جانے والی اہم تحقیقات کا جائزہ لیا ہے جبکہ سخاوت مرزا، افسر امروہوی اور جمیل جالبی کے تحقیق دکنیات کے انداز کار کے استناد پر روشنی ڈالتے ہوئے مذکورہ محققین کی اہم تالیفات بھی مرکز تحقیق رہی ہیں۔

vi۔ مقاصد تحقیق:

تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ پاکستان میں دکنیات کی تحقیق کے ضمن میں اب تک ہونے والی تحقیق کا اجمالی جائزہ لینا۔

۲۔ پاکستانی محققین سخاوت مرزا، افسر امروہی اور جمیل جالبی کی تحقیق دکنیات کا متن، ماخذات، اسلوب و تکنیک کے حوالے سے جائز لینا۔

۳۔ پاکستانی محققین کی تحقیقات کے تناظر میں امکانات کی وضاحت کرنا۔

vii. تحقیقی سوالات:

۱۔ تاریخ اردو ادب میں تحقیق دکنیات کی کیا اہمیت ہے؟

۲۔ پاکستان میں دکنیات کی تحقیق کے ضمن میں ہونے والے تحقیقی کام کون سے ہیں اور ان کی اہمیت وافادیت کیا ہے؟

۳۔ سخاوت مرزا، افسر امروہوی اور جمیل جالبی کی تحقیق دکنیات کے حوالے سے نمایاں تحقیقات، تالیفات و تخلیقات کے خصائص کیا ہیں۔

۴۔ سخاوت مرزا، افسر امروہوی اور جمیل جالبی کی تحقیق دکنیات کے نظری و عملی مسائل، مضمرات اور امکانات کیا ہیں؟

viii۔ نظری دائرہ کار:

زیر نظر تحقیقی کام پاکستان میں دکنیات کی تحقیق سے متعلق ہے۔ دکن کی سرزمین پر تقریباً چار سو سال قبل تخلیق ہونے والے اردو ادب کا سرمایہ کن خصائص کا حامل تھا۔ نیز ان ادبیات کو پرکھنے کے لیے کن اصولوں کی پاسداری لازم ہے۔ اس تحقیقی منصوبے کے تحت قدیم ادبیات کے مطالعہ کے لیے حافظ محمود شیرانی کے تدوینی اصولوں کو بنیاد بنایا گیا۔

شیرانی کے اصولِ تدوین میں:

۱۔ واقعاتی شہادت

۲۔ اسالیب ایامی

۳۔ اسالیب مقامی

۴۔ اسلوب خصوصی

کو بروئے کار لا کر سخاوت مرزا، افسر صدیقی امروہوی اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی دکنی ادبیات کی مرتب و مدون کتب کا مطالعہ کیا گیا۔ شیرانی واقعاتی شہادت کے علاوہ متن کی داخلی شہادتوں سے بھی نتائج کا استخراج کرتے ہیں۔ اس ضمن میں لسانی ارتقا اور تاریخی حوالوں سے واقفیت بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ بعد ازاں ایک مفروضہ قائم کر کے اس کے ردو قبول کے لیے بتدریج دلائل سے اپنے موقف کو ثابت کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں جزم و احتیاط، دلائل کی مضبوطی اور زیر بحث مطالعہ سے اخذ نتائج میں شیرانی قابل تقلید سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے مقلدین میں امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس حوالے سے جن کتب سے استفادہ کیا گیا ان میں پروفیسر نذیر احمد کی کتاب "تصحیح و تحقیق متن"، "قواعد تحقیق اور تدوین" از شفیق انجم، تحقیق کا فن از گیان چند اور خلیق انجم کی "متنی تحقیق" قابل ذکر ہیں۔

اس سلسلے میں ادبی تواریخ جن میں "تاریخ اردو ادب" از ڈاکٹر جمیل جالبی، "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند" از پنجاب یونیورسٹی، "تاریخ ادب اردو" ڈاکٹر تبسم کاشمیری، "تاریخ فرشتہ" از محمد قاسم فرشتہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

مزید برآں قدیم تذکرے، لغات اور رسائل وجرائد کا مطالعہ بھی بہتر تحقیقی نتائج کے استخراج میں معاون رہا۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

تحقیق دکنیات ایک نہایت دلچسپ موضوع ہے مگر اس کی دلچسپی میں سقم وہاں آتا ہے جہاں بنیادی ماخذ کا حصول مشکل اور کبھی کبھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ ادارے جو تحقیق دکنیات کے مراکز ہوا کرتے تھے آج اپنے مخزونے کو عجائب گھروں کی زینت بنا چکے ہیں۔ جہاں تحقیق کے وہ وسائل میسر نہیں ہیں جو ان اداروں میں تھے۔ لہٰذا ابتدائی زمانے میں جو تحقیق ہو گی آج کی تحقیق اس معیار کا دعویٰ کرنے سے قاصر ہے۔ دکنیات پر تحقیق میں موجود دور میں چند صاحبانِ علم کی ذاتی کوششوں کا بہت عمل دخل ہے۔ ورنہ حکومتی سرپرستی کے بغیر اب اس کام کا جاری رکھنا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مگر پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو اس شمع کو روشن رکھے ہوئے ہیں اور ہمیں انہی وسائل پر اکتفا کرنا پڑا ہے۔

x۔ تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ موضوع کے تحت تحقیق کے لیے تاریخی ودستاویزی طریقہ تحقیق اپنایا گیا۔ جو استقرائی طریقہ تحقیق کے زمرے میں آتا ہے۔ اس طریقہ کے پیش نظر دستیاب مواد کی جمع آوری، نامہ نگاری، تجزیہ اور نتائج کا استخراج شامل تھا۔

مجوزہ تحقیق کا محور ومرکز وہ دکنی ادبیات تھیں جن کو مختلف پاکستانی مدونین نے مرتب ومدون کیا۔ ان کے خصائص، تسامحات اور طریقہ ہائے تحقیق کا مطالعہ کیا گیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ اس تحقیق کی بنیاد موضوع سے متعلق ماخذات ہیں۔ لہٰذا ماخذ تک رسائی کے لیے مختلف جامعات (نمل، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) کے کتب خانوں کے علاوہ اکادمی ادبیات، قومی ادارہ برائے فروغ زبان وادب، نیشنل بک فائونڈیشن، انجمن ترقی ادب (کراچی)، بیدل لائبریری

(کراچی) اور غالب لائبریری (کراچی) کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں اہم ویب گاہوں اور آن لائن کتب خانوں جن میں "ریختہ" پر دستیاب مواد سے بھی استفادہ کیا گیا۔

ب۔ دکنی ادب کی دریافت اور ابتدائی تحقیقات:

دکنیات کی ابتدائی تحقیقات کے ضمن میں سرفہرست نام گارساں دتاسی کا ہے۔ انھوں نے ۱۸۲۵ء سے دکنی ادبیات پر تحقیق کا کام شروع کیا اور کلیات ولی کو متعدد قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا۔ جو ۱۸۳۴ء میں پیرس سے شائع ہوا۔

اس کتاب کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔

گارساں دتاسی نے دکنی زبان کے ایک مثنوی "کام روپ و ملا" کا بھی فرانسیسی میں ترجمہ کیا تھا۔ "کام روپ و ملا" کے مصنف تحسین الدین نے یہ مثنوی ۱۱۷۰ھ میں تصنیف کی۔ دتاسی نے اس مثنوی کا اردو متن بھی شائع کیا تھا اور یہ مثنوی فرانسیسی کے علاوہ جرمنی زبان میں ترجمہ ہوئی۔ ضمیر نیازی نے اس مثنوی کے فنی محاسن پر تحقیقی مقالہ لکھا جو رسالہ "نیا دور" کے شمار ۶۹۔ ۷۰ میں کراچی سے شائع ہوا۔

مولوی عبدالحق، مقدمات عبدالحق میں گارساں دتاسی (مضمون) میں لکھتے ہیں:

> ”تاریخ ادب ہندوستانی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے لیے گارسا دتاسی نے بہت بڑا سامان جمع کیا، اس زمانے میں اور پھر پیرس میں بیٹھ کر اس قدر مطبوعہ نسخوں اور قلمی تذکروں کا فراہم کرنا اور معلومات کا بہم پہنچانا فی الواقع حیرت انگیز ہے۔“ (۱)

اس کتاب کی اولاً دو جلدیں اور بعد ازاں تین جلدیں شائع ہوئیں۔ خطبات گارساں دتاسی میں بھی دکن سے تعلق رکھنے والے شعرا اور مصنفین کو نہ صرف متعارف کروایا بلکہ ان کی ادبی خدمات کو بھی از سر نو زندہ کیا۔

دکنی ادب کی تحقیق نے بیسویں صدی میں زور پکڑا اور پہلی مرتبہ مستقل موضوع کے تحت دکنی ادب کے مطالعے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس حوالے سے شمس اللہ قادری نے ایک مضمون تحریر کیا: ”حکیم شمس اللہ قادری نے دکنی اردو پر پہلا تعارفی مضمون ۱۹۱۰ء میں لکھا جو لکھنؤ کے رسالے "لسان العصر" میں شائع ہوا۔“ (۲)

اس تحقیقی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے ۱۹۱۱ء میں مولوی عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری نے "محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن" کے نام سے دکنی شعرا کا مفصل تذکرہ لکھا۔ پھر ۱۹۲۲ء میں مولوی عبدالحق نے "کلیات محمد قلی قطب شاہ" پر ایک مفصل تحقیقی مضمون لکھا جو رسالہ "اردو" (اورنگ آباد) میں شائع ہوا۔

جہاں تک دکنی ادبیات کی اشاعت کا تعلق ہے تو انیسویں صدی کے ربع دوم میں قدیم ادبیات کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان ادبیات کی اشاعت سے پہلی مرتبہ دنیائے ادب اس حقیقت سے آگاہ ہوئی کہ دلی سے صدیوں پہلے دکن میں بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کے زیر سرپرستی بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ اور گلبرگہ میں باقاعدہ شعر وادب کا ایک مستقل دبستان موجود ہے۔

اس حوالے سے حکیم شمس اللہ قادری کی کتاب "اردوئے قدیم" کی اولین اشاعت ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی جس میں دکنی نثر و نظم کی مفصل تاریخ اور عہد بہ عہد دکنی ادب کی نشوونما کا حال، نیز ابتدائی زمانے سے اورنگ زیب کی فتح تک کے مصنفین اور شعرا کے حالات درج کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی شہرہ آفاق تصنیف "اردو شہ پارے" ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی اور نصیر الدین ہاشمی کی تاریخ ساز "دکن میں اردو" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

ان کتابوں کی اشاعت نے دکنی ادب کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی۔ جس کے نتیجے میں دو سو سال کے ادبی دور کی نشاندہی ہوئی اور دکنی ادب کو اولین اردو ادب کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔

ا۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور(۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۲ء):

تحقیق دکنیات کے ذیل میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے دکنی ادب کی تحقیق وترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں ان کی کتاب "اردو شہ پارے" ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں دکنی ادیبوں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے بھی شامل ہیں۔ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ۱۹۴۰ء میں مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے محمد قلی قطب شاہ کی سیاست، بادشاہت اور شاعری کی تعریف کی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا اردو کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ میں تمام اصناف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے حیدر آباد کے چند شعرا کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ جن میں "فیض سخن" سید شمس الدین محمد فیض کے کلام کا انتخاب ہے جو مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ "کیف سخن" سید رضی الدین حسن کیفی کے کلام کا انتخاب ہے جو اعظم اسٹیم پریس، چارمینار، حیدر آباد دکن سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ "بادۂ سخن" ڈاکٹر احمد حسین مائل کے منتخب کلام پر مشتمل ہے۔ جو فاضل مصنف نے ۱۹۳۵ء میں مرتب کیا اور اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ "متاعِ سخن" نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے کلام کا انتخاب ہے جو شاعر کے تعارف کے ساتھ مرتب کیا گیا۔ ان چاروں متذکرہ انتخاب کلام سے قبل ہر کتاب کے دو مقدمے ہیں۔ پہلے مقدمے میں

"دکن میں اردو شاعری" کے عنوان سے دکنی شعر وادب پر وقیع تبصرہ ہے۔ جو ہر کتاب میں شامل ہے جب کہ دوسرے مقدمے میں متعلقہ انتخاب کے حوالے سے شاعر اور اس کے حالات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے "مثنوی طالب وموہنی از سید محمد موسوی کو مرتب کیا جو ۱۹۵۷ء میں سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی۔

"کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ کے کلام کا انتخاب "معانی سخن" کے نام سے ۱۹۵۸ء میں مرتب کیا جو ادارہ ادبیات اردو، نیشنل پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، دکن سے شائع ہوا۔

"داستان ادب حیدر آباد" میں انھوں نے قطب شاہی دور سے جامعہ عثمانیہ کے قیام تک دکنی ادب کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" کے عنوان سے لکھی اور ۱۹۶۰ء میں ان کی کتاب "دکنی ادب کی تاریخ" کراچی سے شائع ہوئی۔ انھوں نے ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطات کی فہرستیں پانچ جلدوں میں شائع کیں۔

۲۔ شمس اللہ قادری:

شمس اللہ قادری ایک سربر آوردہ محقق ہیں جنھوں نے تاریخ اور اردو ادب میں نمایاں تحقیقی کام سرانجام دیئے۔

شمس اللہ قادری نے "لسانی العصر" کے تین نمبروں میں (اپریل، مئی، جون ۱۹۱۷ئ) میں "قدیم شعرائے اردو" کے عنوان کے تحت مضامین لکھے۔ یہ ہی مضامین رسالہ "تاج" کے مدیر کی جانب سے "اردوئے قدیم" کے نام سے دسمبر ۱۹۲۵ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ "اردوئے قدیم" میں دکنی ادب کی ابتدا سے لے کر اورنگ زیب کے عہد تک کے شعرا اور مصنفین کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں سلطنت بہمینہ، سلطنت قطب شاہی، سلطنت عادل شاہی کے علاوہ سلطنت گجرات اور اورنگ آباد کے شعرا اور مصنفین کے حالات اور ادبی کارناموں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ شمس اللہ قادری نے پہلی بار دکنی ادب کی تاریخ مرتب کی اور دنیائے ادب کو جنوبی ہند کے اس قدیم سرمایہ ادب سے متعارف کرایا جو اب تک دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا۔ بلوم پارٹ نے انڈیا آفس لائبریری لندن کے اردو مخطوطات کی جو وضاحتی فہرست ۱۹۲۶ء میں مرتب کی تھی۔ شمس اللہ قادری نے اس کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ "عین الدین گنج العلم اور شاہ میراں جی شمس العشاق کے رسالوں "جل ترنگ" اور "گل باس" کا ذکر سب سے پہلے شمس اللہ قادری نے کیا۔" (۳)

اگرچہ اردو قدیم کتابی شکل میں ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی مگر "لسان العصر" میں ۱۹۱۷ء میں یہ کتاب قسط وار شائع ہو چکی تھی اس لحاظ سے "اردو قدیم" کو نصیر الدین ہاشمی کی "دکن میں اردو" پر تقدیم حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ادبی اور تاریخی موضوعات پر انھوں نے جو مضامین لکھے وہ مختلف رسائل جن میں "ادیب"، "زمانہ"، "نقاد" اور "تاج" شامل ہیں، میں چھپتے رہے۔ ان کا سب سے اہم کام دنیائے ادب میں دبستان دکن کو متعارف کروانا ہے۔

۳۔ نصیر الدین ہاشمی (۱۸۹۵ء تا ۱۹۶۵ء):

نصیر الدین ہاشمی ماہرین دکنیات میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے "دکن میں اردو" لکھ کر اردو کی علاقائی تاریخیں لکھنے کا ایک رواج قائم کیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی مگر بعد ازاں اس کے دیگر ایڈیشن مختلف اضافوں کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ آج بھی یہ کتاب دکنیات کے طالب علموں کے لیے ایک ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ "مدراس میں اردو" اور "یورپ میں دکھنی مخطوطات" قیام پاکستان سے قبل شائع ہو چکی تھیں۔ آخر الذکر بالخصوص اعلیٰ تحقیقی کارنامہ ہے۔ "مقالات ہاشمی" اور "دکھنی کے چند تحقیقی مضامین" بھی نصیر الدین ہاشمی کا علمی و تحقیقی کارنامہ ہے جو ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوئیں۔

۴۔ پروفیسر عبد القادر سروری (۱۹۰۶ء تا ۱۹۷۱ء)

عبد القادر سروری بھی تحقیق دکنیات کے قافلہ میں سرکردہ حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ترتیب متن کے ضمن میں جو نمایاں کام کیے ان میں ابن نشاطیکی مثنوی "پھول بن" قابل ذکر ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں "کلیات سراج" مرتب کیا اور ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ "انتخاب سراج" کے نام سے سراج اورنگ آبادی کا منتخب کلام بھی شائع کیا۔ صنعتی کی "قصہ بے نظیر" کو مرتب کر کے شائع کیا۔ ۱۹۴۴ء میں شاہ صدر الدین کے رسالے "مراۃ الاسرار" کو بھی مرتب کر کے بنگلور سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ "اردو مثنوی کا ارتقا" کے نام سے لکھی گئی کتاب دکنی مثنوی کی تاریخ میں اہم اضافہ ہے۔

۵۔ عبد الجبار ملکاپوری:

تحقیق دکنیات میں عبد الجبار ملکاپوری کو بھی خاص اہمیت حامل ہے۔ ان کی تصانیف اردو ادب میں تذکرہ نویسی کی ابتدا ہیں۔ "تذکرہ اولیائے دکن" میں انھوں نے شعرا اور مصنفین کے حالات اور کارناموں کا جائزہ تاریخی پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے جو ان کے تاریخی شعور کا پتہ دیتا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد ۱۹۱۲ء میں اور دوسری جلد ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔ اول الذکر میں الف سے ش تک جب کہ آخر الذکر

میں ص سے ی تک حروف تہجی کے اسما والے بزرگوں کا تعارف شامل ہے۔ جن میں اہل قلم بھی شائع ہیں اور بزرگان دین بھی۔

> "۱۹۱۰ء میں "محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن" منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل تھی۔ اس میں سے صرف پہلا حصہ شائع ہو سکا۔ باقی دو صفحے موسیٰ لذی کی طغیانی میں بہہ گئے۔" (۴)

ان کی تصنیف "محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن" جلد اول ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سلطنت آصفیہ کے آصف ششم میر محبوب علی خان کی مالی اعانت سے کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ اس لیے کتاب کے نام میں "محبوب" کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی جلد دوم میں محمد قلی سے لے کر ولی کے دور تک کے دو سو چوبیس شعرا کا ذکر ہے۔ یہ کتاب تمام تر تسامحات کے باوجود دکنی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی تحقیق پر نظر ثانی کی گنجائش موجود ہونے کے باوجود ان کی محققانہ اولیت سے انکار ممکن نہیں۔

مولوی عبدالحق کے بعد ڈاکٹر محی الدین زور نے بھی "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" کے تحت "محمد قلی قطب شاہ" کا کلیات مرتب کیا۔

ڈاکٹر محمد علی اثر اپنی کتاب "دکنی شاعری: تحقیق و تنقید" کے دکنی ادب کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

> "جب مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی تشکیل عمل میں آئی تو... اس مجلس کے زیر اہتمام ڈاکٹر زور نے "کلیات محمد قلی قطب شاہ" مرتب کیا۔ پروفیسر سروری نے ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" مقیمی بیجاپوری کی "قصہ بے نظیر اور سراج اورنگ آبادی کا کلیات مرتب کیا۔ پروفیسر سید محمد (جو اس مجلس کے صدر تھے) نے نصرتی کی گلشن عشق، وجدی کرنولی کی "پنچھی باچھا" فائز کی "رضوان شاہ اور روح افزا" اور "عبداللہ قطب شاہ کا کلیات" مرتب کر کے شائع کیا۔" (۵)

معین الدین عقیل لکھتے ہیں کہ "ابن نشاطی کی "پھولبن" کو پروفیسر عبدالقادر سروری نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس وقت تک مصنف کے حالات تاریکی میں تھے حتیٰ کہ مصنف کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔"

چاند ابن حسین نے اس مثنوی کو انڈیا آفس کے نسخے کو بنیاد بنا کر انجمن ترقی اردو کے مخزونہ "پھول بن" کے نسخوں سے مقابلہ کر کے اپنا نسخہ ترتیب دیا جو کراچی سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس نسخے میں چاند ابن حسین نے پہلی مرتبہ پھولبن کے مصنف کے نام کا انکشاف کیا یہ پھولبن کا مصنف شیخ محمد مظہر ابن فخر الدین ہے۔ مزید

یہ کہ اس نسخے کی اشاعت سے بعض اشعار کی تکمیل و درستی بھی ہو گئی جو کہ پروفیسر سروری کے نسخے میں نامکمل تھے یا قرات و وزن میں درست معلوم نہ ہوتے تھے۔

اس حوالے سے معین الدین عقیل نے بھارت میں مرتب ہونے والے "پھولبن" کے ایک نسخہ جیسے دیوی سنگھ چوہان نے ہندی میں مرتب کیا ہے پونا سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس نسخے میں اشعار کی تعداد ۱۷۴۴ء ہے جبکہ پروفیسر سروری کے نسخے میں عنوان کے ۱۴۷ اور مثنوی کے ۱۹۱۹ء اشعار ہیں۔ ابن نشاطی نے اشعار کی تعداد ۱۷۴۴ بتائی ہے اور دیوی سنگھ چوہان کے مرتبہ نسخے میں ۱۷۴۴ اشعار ہیں اور وجہ یہ بتائی ہے کہ مدح محاجہ، مناجات اور سراپا سمت بعض اشعار اطاقی ہیں۔ اکبر الدین صدیقی نے ۱۹۷۸ء میں تمام نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک درست ترین ایڈیشن دہلی سے شائع کیا ہے۔

سید سعادت علی رضوی نے غواصی کی دو مثنویوں "سیف الملوک وبدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" کو مرتب کیا۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے نصرتی کی "علی نامہ" کو مرتب کیا۔ جبکہ اکبر الدین صدیقی نے مقیمی کی "چندربدن ومہیار" کو اور خواجہ حمید الدین شاہد نے شفیق اورنگ آبادی کی مثنوی "تصویر جاناں" کو مرتب کر کے شائع کیا۔

مولوی عبدالحق کے بارے میں ڈاکٹر محمد علی اثر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق نے "حضرت خواجہ بندہ نواز کے رسالے "معراج العاشقین، وجہی کی سب رس اور قطب مشتری کو مرتب کر کے شائع کیا۔ ملک الشعر انصرتی، پر ایک تحقیقی کتاب بھی لکھی۔ مولوی عبدالحق نے اس کے علاوہ متعدد تحقیقی مضامین لکھے جو "قدیم اردو" نامی مجلے میں شائع ہوتے رہے۔ معراج العاشقین کو بعد ازاں گوپی چند نارنگ اور خلیق انجم نے بھی مرتب کیا۔

۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے "دکنی ادب کی تاریخ" لکھی جو کہ ۱۳۵۰ء سے ۱۷۵۰ء تک کی زمانی وسعت کا احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو زبان کے قدیم مراکز گلبرگہ، بیدر، گولکنڈہ، بیجاپور، حیدرآباد اور اورنگ آباد کے شعراء مصنفین کی ادبی خدمات کی تفصیلی تاریخ رقم کی ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے اردو مخطوطات کی فہرست مولوی افسر صدیقی امروہوی نے سید سرفراز علی رضوی کے تعاون سے چھ جلدوں میں ضروری تفصیلات کے ساتھ شائع کیں۔

مشفق خواجہ "جائزہ اردو مخطوطات" کے نام سے پاکستان میں موجود مخطوطات کا مفصل تحقیقی جائزہ کتابی شکل میں شائع کرایا۔

دکنی قواعد اور فرہنگ نویسی پر بھی قابل قدر کام ہوا ہے۔ دکنی ادب کے ضمن میں اب تک سات فرہنگیں مرتب ہو چکی ہیں:

۱۔ دکن کی زبان، مرتبہ: عارف العلائی

۲۔ دکنی لغت، مرتبہ: سید ابو تراب خطائی

۳۔ دکنی لغت، مرتبہ: سید شعار احمد ہاشمی

۴۔ دکنی فرہنگ، مرتبہ: امیر عارفی

۵۔ = دریائے معانی، مرتبہ: ڈاکٹر جاوید ششٹ

۶۔ قدیم اردو کی لغت، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

۷۔ دکنی اردو کی لغت، مرتبہ: ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر غلام عمر خان"

دکنی قواعد کے ضمن میں ڈاکٹر حبیب ضیاء کی کتاب "دکنی زبان کے قواعد" کے نام سے کراچی سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔

دکنی ادب کی تحقیق میں ادبی رسائل و جرائد نے بھی ترسیل ادب کا اہم کام سرانجام دیا۔ اس حوالے سے انجمن ترقی اردو کا رسالہ "سب رس" (حیدر آباد)، نوائے ادب (بمبئی)، معارف (اعظم گڑھ)، ماہ نو (کراچی)، ہماری زبان (علی گڑھ)، ہندوستانی ادب (حیدر آباد)، صحیفہ (لاہور)، بصائر (کراچی)، برہان (دہلی)، النور (حیدر آباد، دکن)، اردو ادب (علی گڑھ)، اردو (اورنگ آباد)، قابل ذکر ہیں۔

ج۔ پاکستان میں دکنیات کی تحقیق: ابتدائی کاوشیں:

پاکستان میں ہی شائع ہونے والے قدیم ادب کے متون میں سب سے اہم فخر دین نظامی کی "کدم رائو پدم رائو" ہے۔ اولاً اس مثنوی کا تعارف نصیر الدین ہاشمی نے اکتوبر ۱۹۳۲ء میں کرایا تھا۔ بعد ازاں اس نسخے کو جمیل جالبی نے انتہائی عرق ریزی سے پڑھا اور سمجھا مزید بر آں اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں شائع کرایا۔

نصرتی کی مایہ ناز مثنوی "گلشن عشق" کو مولوی عبد الحق نے ۱۹۵۲ء میں مرتب کیا اور کراچی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع کرایا۔ دکنی شاعر محمود بحری کی منثوی "من لگن" کو سخاوت مرزا نے مرتب کیا اور یہ مرتبہ مثنوی ۱۹۵۵ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ ’’تتمہ پھولبن" کا ۱۹۶۸ء میں رسالہ اردو میں دو اقساط میں شائع ہوا۔‘‘(۶)

"قدیم عہد کی ایک مثنوی منشی اجے چند سکندر آبادی نے ۹۶۰ھ میں "خالق باری" کی طرز پر تصنیف کی تھی۔ اسے افسر امروہوی نے "مثلِ خالق باری" کے نام سے مرتب کیا۔" (۷)

سخاوت مرزااور مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق یہ مثنوی اردو کی پہلی نصابی کتاب مانی جاتی ہے۔ اسی طرز کا ایک قدیم منظوم نصاب "واحد باری" بھی ہے جو ۱۰۲۸ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ داغ احسان الٰہی کے پاس تھا جس کو انھوں نے دستیاب شدہ سات قلمی اور دو مطبوعہ نسخوں کی مدد سے مرتب کیا۔ سخاوت مرزا نے شاہ عبدالقادر کرنولی کے مشہور زمانہ "ارشاد نامہ" کا متن مرتب کیا۔ "ارشاد نامہ" کا اب تک دستیاب ادب میں واحد نسخہ تھاجو انجمن ترقی اردو، علی گڑھ کا مخزونہ ہے۔(۸)

بات ہو رہی ہے قدیم دکنی ادب کی تو ایک اہم متن "دیوان تراب" بھی ہے جس کو سلطانہ بخش نے ۱۹۸۲ء میں مرتب کیا۔ یہ دیوان انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود ہے۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش نے اسے جامع مقدمے کے ساتھ مرتب کیاجو کتابی شکل میں کراچی سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔

سخاوت مرزا نے "شاہ قاسم اورنگ آبادی" کا دیوان مرتب کیا۔ مقدمے میں شاہ قاسم کے حالات اور شاعری کے خصائص کا احاطہ کیاہے۔ یہ کتابی شکل میں ۱۹۷۵ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ شاہ قاسم کے ہم عصر فقیر دکنی کی ایک مثنوی ہے جس میں مشہور نظم "سنگھاسن بتیی" کو (منظوم کیا گیا ہے)۔ افسر صدیقی امروہوی نے ۱۹۸۴ء میں مرتب کرکے کراچی سے شائع کیا۔ افسر امروہوی کی ایک اور مرتبہ کاوش "بیاض مراثی" ہے جس کا بیشتر کلام دکنی ہے۔ مگر گاہے بگاہے فارسی کلام بھی موجود ہے۔ مراثی اور نوحوں پر مشتمل یہ بیاض مرثیہ کی روایت میں اہم ماخذ کی حیثیت اور اس وقت اختیار کر جاتی ہے جب افسر امروہوی نے نہایت وقیع تحقیق کے ساتھ ہر شاعر کے کلام کے ساتھ شاعر کے حالات زندگی بھی تحریر کیے۔ یہ تالیف ۱۹۷۵ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ سراج اورنگ آبادی کے شاگردوں میں خواجہ عنایت اللہ فتوت کا ایک تذکرہ "ریاض حسنی یا تذکرہ فتوت" اور ایک مثنوی "دُرِّ معنوی" مشہور ہیں۔ مثنوی کا واحد نسخہ انجمن ترقی اردو میں موجود ہے۔ پروفیسر شفقت رضوی نے شاعر کے حالات کے ساتھ شائع کرایا۔"(۹) جہاں بات ہے مطبوعہ قدیم ادب کی... وہاں قیام پاکستان کے بعد دریافت ہونے والا قدیم ادب نہایت اہم ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عالی جعفری اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی کاوشوں سے اغماز ممکن نہیں۔ قاضی احمد میاں نے انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود "دیوان ولی" کے قدیم نسخے سے (جو ۱۱۳۵ھ کا کتابت شدہ ہے) "کلیات ولی" مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی طبع سوم، کراچی ۱۹۵۴ء سے کر کے متعدد اشعار اور چھ مکمل غزلوں کی نشاندہی کی ہے جو کلیات ولی میں موجود نہیں۔ کلیات کے ضمیمہ اول میں

۱۴۱ ایسی غزلیں ہیں جو ولی کے ہر دیوان میں موجود نہیں۔ جبکہ قاضی میاں احمد نے ۱۵ ایسی غزلوں کی نشاندہی کی ہے۔

محمد اکرم چغتائی نے بھی انجمن ترقی اردو کی مختلف بیاضوں اور پنجاب پبلک لائبریری لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود دیوان ولی کے ساتھ قلمی نسخوں سے ولی کا غیر مطبوعہ کلام دریافت کیا ہے۔[۱۰] مزید معین الدین عقیل کے مملوکہ "دیوان ولی" کے ایک قلمی نسخے میں بھی ولی کا غیر مطبوعہ کلام دریافت ہوا۔ "دیوان ولی" کے اس نسخے میں ولی کا فارسی زبان میں پان کی تعریف پر ایک قطعہ ملتا ہے۔ اس نسخے کے علاوہ ولی کا فارسی کلام اور کہیں دستیاب نہیں۔ معین الدین عقیل نے اپنے ایک مقالے میں ولی کے غیر مطبوعہ کلام کا تعارف کرایا ہے۔[۱۱]

معین الدین عقیل کی تصنیف "پاکستان میں اردو تحقیق" کی رو سے چاند ابن حسین نے "پھولبن" کے انڈیا آفس کے نسخے کو بنیاد بنا کر اور انجمن ترقی اردو کے کتب خانے کے نسخے سے موازنہ کر کے اپنا نسخہ مرتب کیا۔ اس نسخے سے پہلی مرتبہ مصنف ابن نشاطی کے اصل نام کا علم ہوا۔ ابن نشاطی کا اصل نام شیخ محمد مظہر ابن فخر الدین تھا۔ قبل ازیں عبد القادر سروری نے ۱۹۳۷ء میں مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات کے زیر اہتمام "پھولبن" شائع کی تھی مگر چونکہ مصنف کے حالات پردہ اخفا میں تھے۔ لہٰذا اس کی اتنی اہمیت نہیں۔ چاند ابن حسین نے باقاعدہ تحقیق کے بعد اپنا نسخہ ۱۹۵۵ء میں کراچی سے شائع کیا۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ نے تیرھویں صدی کی قدیم مثنوی "نل دمن" جس کے مصنف احمد سرادی تھے، ۱۹۴۱ء میں مرتب کی جو اورینٹل کالج میگزین میں نومبر کے شمارے میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں ۱۹۷۸ء میں اسے کتابی شکل میں کراچی سے شائع کیا گیا۔

"کلیات چاند پوری" کو ڈاکٹر اقتدار حسین نے ۱۹۶۵ء میں مرتب کیا جس میں قائم کی زندگی اور اس کے عہد کے احوال و آثار پر سیر حاصل مقدمہ درج کیا ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل اس پر مغز تخلیق کی بنیاد انڈیا آفس کے مخطوطے کو بنایا ہے۔ مگر مختلف مطبوعہ اور قلمی نسخوں سے تقابل کر کے بڑی دل جمعی سے اختلاف کی نشاندہی کی ہے۔

ترتیب و تصحیح متن کے حوالے سے خلیل الرحمن داؤدی نے تحقیق کے اعلیٰ معیار کو پیش کیا۔ انھوں نے دکنی ادب کے جن نوادرات کی تحقیقی عمل سے گزار کر قابل فہم بنایا ان میں ۱۹۶۷ء میں "اردو کی قدیم منظوم داستانیں" جن میں "قصہ لعل گوہر، قصہ لیلیٰ مجنوں، قصہ نازنین و خان والدشان جعفر خان، قصہ قاضی اور چوہے

کا، قصہ چوہے اور بلی کا، قصہ لڑائی بیر الالم کا، قصہ جمجمہ بادشاہ، زیتون و محمد حنیف، قصہ تنبولی کی عورت کا، قصہ تمیم انصاری کا، وفات نامہ حضرت خاتون، قصہ کالی اور گوری کا شامل ہیں۔

جہاں تک قدیم متون کی دریافت اور تعارف کا سوال ہے تو اس ضمن میں پاکستان میں سب سے زیادہ کام سخاوت مرزا نے کیا ہے۔ یہاں ہم ان کی صرف دکنی ادبیات کی تحقیق تک محدود رہیں گے۔

اس ضمن میں سخاوت مرزا کی متعارفہ مثنوی "بہارستانِ عشق" اہم ہے۔ جس کا مصنف سرور نامی شخص تھا۔ جس کے احوال وآثار مجہول ہونے کے باعث مثنوی کی داخلی شہادتوں سے کچھ حالات اخذ کر کے مقالہ کی صورت میں شائع کرائے۔"(۱۲) اس تعارف کی بنیاد انھوں نے کتب خانہ آصفیہ کے نسخے کو بنایا۔ مقدمے میں "سام ناموں" کا تحقیقی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

مثنوی "جامع الحقائق" مصفنہ سید احمد قادری الحسینی سبز پوش مرتب کرتے ہوئے سبز پوش خاندان کے تاریخی سوالوں کا سہارا لے کر مصنف کے حالات زندگی متعارف کرائے۔ یہ مقالہ "اردو" جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں شامل تھا۔

اسی طرح ایک اور مثنوی "من موہن" ہے جس کے مصنف عین الحق آزاد حیدر آبادی تھے۔ مصنف کے حالات اور مثنوی کا تعارف ایک مقالہ میں پیش کیا۔(۱۳)

اس مثنوی کے بنیادی نسخے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ کے مملوکہ ہیں۔

> "ریاض الحنین" مصنفہ عشرت بریلوی کی گمنام مثنوی تھی جس کا تعارف پہلی مرتبہ سخاوت مرزا نے کرایا اور تحقیق سے ثابت کیا کہ عشرت بریلوی، مرزا علی لطف کے شاگرد تھے اور صاحب دیوان تھے۔ ان کی یادگار کاوش "پدماوت" کا منظوم ترجمہ ہے۔ جو انھوں "شمع و پروانہ" کے نام سے کیا۔" (۱۴)

"مثنوی جگت روپ" کا تعارف بھی سخاوت مرزا کی تحقیقی کاوشوں کا مظہر ہے۔ جس کا مصنف نول سنگھ ہے۔ یہ مقالہ اردو نامہ ہی اپریل ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ فاضل مصنف کا ایک اور مقالہ "حنا لکھنوی کا نایاب دیوان" صحیفہ، اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ جس میں سخاوت مرزا نے حنا لکھنوی کے تعارف کے ساتھ ساتھ نمونہ کلام بھی جابجا درج کیے ہیں۔ اب تک اس کا صرف ایک نسخہ دریافت ہوا ہے جو کہ کتب خانہ آصفیہ کی ملکیت ہے۔ ان کا ایک اور مقالہ "بلوان سنگھ راجا کا نایاب قلمی دیوان"(۱۵) ہے۔ یہ بنارس کے حکمران تھے اور انتزاع ریاست کے بعد گوالیار چلے گئے تھے۔ ان کے تین دیوان اور ایک مثنوی دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ مقالہ میں بلوان سنگھ راجا

کے حالات و تعارف پر تحقیقی سند ہے۔ مثنوی "سراپا سوز" مصنفہ قاضی محمد صادق اختر بنگالی ثم لکھنوی کا تعارف بھی مقالے کی صورت اردو نامہ جولائی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔

سخاوت مرزا کے علاوہ دیگر محققین نے بھی قدیم دکنی ادب کی تحقیق میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

قلی قطب شاہ کے معاصر شاعر شیخ احمد دکنی کی مثنوی "یوسف زلیخا" کا تعارف ڈاکٹر محمد اقبال جاوید نے مقالے کی صورت اردو نامہ، جولائی ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں شائع کرایا۔ شیخ احمد دکنی قطب شاہی دور کا اہم شاعر تھا اس کی یہ مثنوی قطب شاہی دور کی پہلی منظوم تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود ہے۔ نثر میں اردو کے جرمن شاعر فراسو کا تصنیف کردہ "قصہ عشق افزا" اور "مجموعہ بارہ قصہ" جو کہ چند مثنویوں پر مشتمل مقالہ کا تعارف بھی اول اول محمد باقر نے ہی کروایا۔

دکن کے اہم شاعر ولی دکنی کا کلام صرف اس کے ایک دیوان میں موجود ہے جس میں مختلف دستیاب نسخوں کے حوالے سے اضافے ہوتے رہے ہیں۔ محمد اکرم چغتائی نے اس حوالے سے اپنے مبسوط مقالے بعنوان "دیوان ولی کے قلمی نسخے" کا تعارف "اردو" جولائی، اکتوبر ۱۹۶۶ء میں شائع کیا جس میں ۱۳۳ ایسی بیاضوں کا ذکر کیا جس میں ولی کا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔ اس کے علاوہ ۱۱۸ مزید "دیوان ولی" کے نسخوں کی نشاندہی کی۔ مشفق خواجہ نے بھی "دیوان ولی" کے ۱۹ مزید نسخوں کی نشاندہی "جائزہ مخطوطات اردو" کی جلد اول میں کی ہے۔ اسی حوالے سے معین الدین عقیل نے اپنے ذاتی مملوکہ نسخے کا تعارف بھی کرایا ہے جس میں ولی کا کچھ ایسا کلام موجود ہے جو نہ صرف غیر مطبوعہ ہے بلکہ کسی اور نسخے میں نہیں ملتا۔ اس پر معین الدین عقیل نے ایک مقالہ تحریر کیا ہے جو "غالب" میں ۲ جنوری ۱۹۸۷ء کو کراچی سے شائع ہوا۔

سخاوت مرزا نے نثری متون پر بھی خاص توجہ کی ہے۔ ان کا ایک مقالہ "خوان یغما دکھنی" کے عنوان سے ہے۔ یہ سید شاہ طاہر حموی کرنولی کا لکھا ہوا ایک نصاب جہان ہے۔ اس مقالے کو رسالہ اردو میں دو اقساط میں شائع کیا گیا۔(۱۶)

حسب دستور مصنف کے احوال و آثار، داخلی شواہد اور عصری و تاریخی مآخذ سے یکجا کیے گئے ہیں۔

قدیم دکنی ادب کی ایک کتاب "انوار العاشقین از سید حسین علی شاہ قادری" ہے۔ اس کا ایک نایاب نسخہ کتب خانہ آصفیہ ہی موجود ہے جس کا مکمل تعارف اور اقتباسات کا حوالہ نہایت تحقیقی انداز میں دیا ہے۔ سخاوت مرزا نے یہ مقالہ ۱۹۷۲ء میں تحریر کیا جو سہ ماہی "اردو" کے جولائی ۱۹۷۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

مولانا شاہ محی الدین کی تالیف کردہ لغت "کثیر الفوائد"[۱۷] کو متعارف کرانے کا سہرا بھی سخاوت مرزا کے سر ہے۔ یہ دکن کے عالم فاضل شخص تھے۔ اس تالیف کا نادر مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے سید محمد باقر آگاہ کی مثنوی "راحت جان" (غیر مطبوعہ) کا تعارف کرایا۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

سخاوت مرزا کے علاوہ قدیم اردو کے متعدد اہم متون کی دریافت و تعارف کے ضمن میں ڈاکٹر محمد باقر کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کی ایک کتاب اردو کے کمیاب اور نایاب غیر مطبوعہ متون پر مشتمل ہے۔ جس کا نام "اردوئے قدیم" ہے۔ لاہور سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے مخطوطے ہیں جنہیں پہلی مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر نے دریافت کیا جن میں "احسن القصہ" (یوسف زلیخا) کا نسخہ برٹش میوزیم سے دریافت ہوا جس کے بارے میں خود میوزیم والے بھی لاعلم تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مملوکہ "اردو مجموعہ کلام مصفنہ عہد یوسف علی خان" کا واحد نسخہ ہے جس کا تعارف بھی ڈاکٹر صاحب نے کرایا۔ بھگونت رائے راحت کی مثنوی "زہرہ و بہرام" کا مکمل تعارف کرانے میں بھی ڈاکٹر باقر کی تحقیقی صفت نمایاں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر باقر ہی نے "قصہ دلآرام" مصنفہ غوث ابن عظیم اور میر صادق علی کا قصہ "مہتاب شاہ دشر زادہ صف شکن" کا جامع تعارف کرایا۔ پیر مراد شاہ لاہوری کی مثنوی "مراد المحبتین" جو غلام دستگیر مرحوم کے کتب خانے سے دریافت ہوا۔ ڈاکٹر محمد باقر نے اس کا مکمل متن ۱۹۴۲ء میں "اردو" میں شائع کروایا تھا۔ بعد ازاں غلام دستگیر صاحب کی وفات کے بعد اصل نسخہ ضائع ہو گیا مگر شائع شدہ نسخہ محفوظ رہ گیا۔ اس کے علاوہ "جنگ نامہ بنگی خان" جو کہ ۱۷۰۳ء کی تصنیف ہے۔ مزاحیہ دکنی نثر پر مبنی ہے جس کا تعارف سخاوت مرزا نے لکھا اور تصنیف کے خصائص کا ذکر تحقیقی انداز میں کیا ہے۔ یہ مقالہ، اردو نامہ میں جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔

سخاوت مرزا نے "توضیحی فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ" از سید نصیر الدین ہاشمی کے تحقیقی و تنقیدی جائزہ پر مشتمل مقالہ "ایک طالب علم" کے فرضی نام سے تحریر کیا۔ اس طرح کا ایک اور مقالہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی "فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات اردو" ج اول پر بھی لکھا ہے۔ جس میں نصیر الدین ہاشمی کے کچھ تسامحات کی نشاندہی کے علاوہ دیگر مخطوطات و مصفین پر نہایت ماہرانہ و محققانہ معلومات فراہم کی ہیں۔ اول الذکر مقالے کی اشاعت سہ ماہی "اردو"، اپریل ۱۹۵۷ء میں جبکہ آخر الذکر مقالے کی اشاعت رسالہ ہندوستانی ادب، حیدر آباد دکن میں جنوری ۱۹۴۶ء میں عمل میں آئی۔

سخاوت مرزا نے نقش حیدر آبادی کے تذکرے "عروس الاذکار" کا بھی تعارف کرایا ہے۔ یہ ان تذکروں کے مختصر ذکر کا مجموعہ ہے جو دکن میں لکھے گئے۔ باقی سخاوت مرزا کی یادداشتوں پر مشتمل بھی ایک حصہ اس مقالے میں موجود ہے۔ یہ مقالہ بھی رسالہ اردو میں جنوری ۱۹۵۸ء کی اشاعت کا حصہ بنا۔

انجمن ترقی اردو کے مملوکہ ذخیرہ کتب و مخطوطات میں "تذکرہ بشیر" از بہاء الدین بشیر بھی موجود ہے۔ جسے مشفق خواجہ نے مرتب کیا ہے۔ اس کے علاوہ "تذکرہ بے جگر" از خیراتی لعل جگر کا مکمل تعارف ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مقالے میں کرایا۔ جو نقوش کے جولائی ۱۹۷۳ء کے رسالے میں شائع ہوا۔

سخاوت مرزا نے مختلف اصناف سخن، شخصیات اور قدیم تصانیف پر لکھے گئے مقالات کی تعداد سینکڑوں ہے جو مختلف رسائل میں منتشر ہے۔ باقی مقالات کا ذکر ہم سخاوت مرزا کے باب کے ذیل میں کریں گے۔

قدیم دکنی ادب کے بارے میں بعض ناکافی عصری شواہد کی بنیاد پر کچھ تصانیف کا زمان و مکان یا مصنف کا درست تعین نہ ہو سکا۔ جیسا کہ بہتری اور تبدیلی و درستی کے امکانات ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ ایسے ہی گزرتے وقت میں بہت سی مشہور تصانیف کے بارے میں کچھ ابتدائی تصورات میں تبدیلی نظر آتی ہے۔ مختلف محققین نے اپنی تحقیق سے پیرانہ تصورات کو رد کر کے مضبوط شواہد کی روشنی میں نئے تصورات سے آشنا کیا۔ ہم ذیل میں چند ایسی ہی تصانیف کا ذکر کرنے جا رہے ہیں کہ یہ ہی رد و قبول ادبی فن پاروں کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔

سب سے پہلے ہم بات کریں گے "صراط مستقیم" کی جسے ایک عرصے تک وجہی کی تصنیف سمجھا جاتا رہا۔ سخاوت مرزا کی تحقیق سے ثابت کیا کہ یہ وجہی کی نہیں بلکہ کسی "خورشاہ" کی تصنیف ہے جو قندھار کا رہنے والا تھا۔ اس موضوع پر سخاوت مرزا نے ایک مقالہ تحریر کیا ہے جس کا عنوان ہے "صراط مستقیم: کیا وجہی کی تصنیف ہے"۔ اس مقالے میں فاضل مصنف نے ٹھوس شواہد اور مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ تصنیف وجہی کی نہیں ہے۔ یہ مقالہ اورینٹل کالج میگزین کے شمارہ ۱۴۳ میں نومبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔

وجہی کی تصنیف "تاج الحقائق" کے بارے میں بھی محققین میں کچھ غلط فہمیاں رہی ہیں۔ اس کتاب کے نسخے کتب خانہ جامع ممبئی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی، ادارہ ادبیات و کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں موجود ہیں۔ اس کتاب کو بعض مفروضات کی وجہ سے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف مان لیا گیا جس کی وجہ ترقیمہ میں موجود یہ عبارت ہے۔ ہمیں ہاتف العاشق، ہمیں ہادی العشاق، ہمیں عش قالعشاق، شمس العشاق۔ (۱۸)

تاج الحقائق کی اس عبارت کے آخر میں شمس العشاق کے الفاظ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ یہ شمس العشاق کی تصنیف ہے۔ دوسری غلط فہمی یہ تھی کہ اس کتاب کو وجہی کے بجائے وجیہ الدین گجراتی کے کسی مذہبی رسالے کا ترجمہ سمجھا گیا۔ اس ضمن میں سخاوت مرزا اپنے مقالے میں اس تسامح کی صراحت یوں کرتے ہیں کہ:

"سب اس زیر بحث کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں میری نظر سے گزرا تھا۔ متن میں مصنف کا نام اور سن کتابت درج نہیں ہے۔ ابتدا میں یہ نسخہ ناقص معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ایک دوسرا مخطوطہ پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی ثم حیدر آبادی کے پاس تھا اور موصوف کا ایک مضمون بھی اس پر سالہا سال قبل رسالہ "النور" جلد ۲، شمارہ ۶، ۱۳۴۳ھ حیدر آباد دکن میں بعنوان "سب رس میراں جی شمس العشاق" شائع ہوا تھا۔" (۱۹)

اس مقالے میں سخاوت مرزا نے مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ تصنیف "تاج الحقائق" ملا وجہی کی تصنیف ہے۔

ملا وجہی کی تصنیف "سب رس" نہ صرف زمانی بلکہ ادبی نقطہ نظر سے بھی اہم ہے۔ اس کے مآخذ کا کچھ پتہ نہیں کیونکہ خود وجہی نے اس کے ماخذ کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ اس حوالے سے عزیز احمد نے اپنے مقالے میں "سب رس" کا مآخذ شاصی نیشاپوری کی تصنیف "دستور العشاق" کو بتایا ہے۔ مقالے کا عنوان ہے "سب رس کے مآخذ اور مماثلات"۔ "دستور العشاق" کو گرین شیلڈز نے برلن سے ۱۹۲۶ء میں مرتب کیا تھا جبکہ مولوی عبد الحق کا مرتب کردہ نسخہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ عزیز احمد نے شیلڈز کے نسخے سے استفادہ کیا ہے اور سب رس کے درست ماخذ اور مماثلات پر نہ صرف بحث کی ہے بلکہ اس کے فنی محاسن بھی اجاگر کیے ہیں۔

"خاور نامہ" جو کہ رسمتی بیجاپوری کی تصنیف ہے، کو شیخ چاند ابن حیف نے مرتب کیا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے مرتبہ نسخے پر کوئی مقدمہ نہیں لکھا تھا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کی تاریخی اہمیت اور فنی محاسن اجاگر کیے جائیں۔ اس ضمن میں خاور نامہ کا ایک ترجمہ ناطق لکھنوی نے بھی کیا۔ "خاور نامہ کا ایک اور ملخص ترجمہ مروجہ اردو میں ناطق لکھنوی نے بھی کیا تھا۔ جس کا حصہ اول ۱۹۰۰ء میں لکھنو سے بھی شائع ہوا۔"(۲۰)

سخاوت مرزا نے اپنے مقالے میں ناطق لکھنوی کے مقدمے سے اقتباسات نقل کر کے "خاور نامہ" کا مکمل تعارف کرایا اور اس کا لسانی تجزیہ بھی پیش کیا۔"(۲۱) بعد ازاں خواجہ حمید الدین شاہد نے بھی "خاور نامہ" پر ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا جو کہ فنی و تاریخی خصائص کے علاوہ دکنی اور فارسی کے تقابلی جائزہ پر مشتمل ہے۔ یہ مقالہ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں رسالہ "صحیفہ" میں شائع ہوا۔

سخاوت مرزانے خیال ظاہر کیا کہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں "لوری نامہ دائم" کے نام سے جو رسالہ موجود ہے وہ شیخ محمود چشتی خوش دیاں بیجاپوری کا ہے۔ جو شاید "دائم" تخلص کرتے تھے۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنے ایک مقالے میں اس کا تعارف بھی کرایا ہے جو "اردو نامہ" میں مارچ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ مگر ان کی کسی اور تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

گارساں دتاسی نے دکنی زبان کی اس مثنوی کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا تھا۔ کام روپ وملا کے مصنف کا نام تحسین الدین تھا اور مثنوی کا سن تصنیف ۱۱۷ھ تھا۔ فنی محاسن کو تحقیقی انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ مقالہ "نیا دور" رسالے میں کراچی سے شائع ہوا۔

محترمہ سلطانہ بخش نے ایک تحقیقی مقدمے کے ساتھ دیوان تراب کو مرتب کر کے پاکستان سے ۱۹۸۴ء میں انجمن ترقی اردو سے شائع کرایا۔ شاہ تراب کی ہی ایک اور مثنوی "مہ جبین وملا" بھی دکن میں لکھی گئی۔ اس کے بارے میں سخاوت مرزا کا خیال تھا کہ یہ میر کی "دریائے عشق" کی مماثل ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل "اردو تحقیق" میں تحریر کرتے ہیں کہ:

اس موضوع پر ان کا ایک مقالہ "دریائے عشق کا ایک مآخذ" ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو ایک نجی کتب خانے سے ایک نامعلوم شاعر کی نامعلوم مثنوی "قضا وقدر" کا نسخہ ملا جس کا قصہ سوائے چند معمولی اختلافات کے بالکل "دریائے عشق" کا ہے "قضا وقدر" اورنگ زیب کے ایک صوبے دار شائستہ خان کے ایک ملازم کی داستان عشق ہے۔ مخطوطے کا سن کتابت ۱۱۱۳ھ ہے۔

اب چونکہ دریائے عشق کا سن تصنیف معلوم نہیں ہے۔ لہٰذا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاہ تراب کی یہ مثنوی "دریائے عشق" کا مآخذ ہو سکتی ہے۔

ا۔ انجمن ترقی اردو کی پاکستان منتقلی:

انجمن ترقی اردو کا قیام ۱۹۰۳ء میں عمل میں آیا۔ نواب محسن الملک نے یہ ادارہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ کی حیثیت سے قائم کیا تھا۔ اس کے بنیادی مقاصد اردو زبان وادب کی ترویج، تراجم، تحقیق واشاعت تھے۔

انجمن کے پہلے صدر سر تھامس آرنلڈ تھے جبکہ مصدقہ علامہ شبلی نعمانی تھے۔ دیگر عہدے داران میں مولانا الطاف حسین حالی اور نذیر احمد دہلوی جیسے لوگ شامل تھے۔ انجمن کی سرپرستی کرنے والوں میں قائداعظم

محمد علی جناح، علامہ اقبال، سردار عبدالرب نشتر، لیاقت علی خان اور معاونین میں مولانا ظفر علی خان، حسرت موہانی، پیر الٰہی بخش اور دیگر بزرگان کے نام شامل ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کے چوتھے معتمد تھے۔ ان سے قبل مولانا شبلی نعمانی کے بعد مولوی حبیب الرحمن خان شیروانی پھر مولوی عزیز مرزا کے یکے بعد دیگرے انتقال کے بعد مولوی عبدالحق کا بطور معتمد ۱۹۱۲ء میں تقرر ہوااور اس تقرری کے ساتھ ہی انجمن کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہو گیا۔

"جس وقت مولوی صاحب نے انجمن کی ذمہ داری قبول کی اس وقت انجمن کا مجموعی سرمایہ رسی سے کسے ہوئے ایک صندوق، ایک رجسٹر اور چند پرانے و غیر مرتب مسودات کے سوا کچھ نہ تھا۔" (۲۲)

یہاں آکر انجمن میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ۱۹۲۱ء میں مولوی صاحب کی ادارت میں ایک رسالہ "اردو" کا اجرا ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں انجمن کی باقاعدہ "مجلس ناظمین" بنی اور اسی سال (مقبرہ رابعہ درانی) باغ اردو میں انجمن نے اپنا چھاپہ خانہ قائم کیا۔ ۱۹۲۸ء میں رسالہ "سائنس" کا اجرا ہوا۔

یہیں سے مولوی عبدالحق نے قدیم ادب کے نایاب نسخوں کو بازیافت کر کے ان پر تحقیق کا سلسلہ شروع کیا۔

اردو ہندی تنازع کے رد عمل میں انجمن ترقی اردو کے کارکنان اور مولوی صاحب نے مختلف علاقوں کے دورے کیے۔ کتب خانے اور مدرسے قائم کیے۔ انجمن ترقی اردو کی تقریباً ۱۰۸ شاخیں اور ذیلی دفاتر قائم کیے گئے۔ ناگ پور اور مدراس میں اردو کو اس قدر پذیرائی ملی کہ ریاست کو مڈل کا امتحان اردو میں منعقد کرانا پڑا۔

انجمن کے تحت اچھوتوں کے اسکول قائم کیے گئے اور اردو کی تدریس کے لیے لیکچرار مقرر کیے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاک خانوں اور ریل کے ڈبوں پر نام اور ضروری احکامات اردو میں لکھے جانے لگے۔ دلی منتقلی کے دوران بھی انجمن کی سرگرمیاں جاری رہیں۔

اس وقت تک انجمن میں کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ اکٹھا ہو چکا تھا جو ہر قسم کی ادبیات پر مشتمل تھا۔ خصوصاً قدیم ادب کی نایاب ادب پارے جو صرف انجمن ترقی اردو میں واحد نسخہ تھے۔ اگر ہم دلی منتقلی کے بعد، انجمن کے نو سالہ دور پر نظر ڈالیں تو یہ بات نہایت حیران کن ہے کہ اس درجہ نامساعد حالات، سیاسی یورش اور با مخالف کے باوجود انجمن نے نو سال کے قلیل عرصے میں ڈیڑھ سو سے زائد کتب شائع کیں۔ جبکہ قیام اورنگ آباد کے دوران تصانیف و تالیفات کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔ اس طرح انجمن ترقی اردو کی مطبوعات کی مجموعی تعداد تقریباً اڑھائی سو تک جا پہنچی ہے۔ اصطلاحات اور زبان کی ترویج کی مساعی اس کے علاوہ تھیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے نتیجے میں فسادات پھوٹ پڑے۔ جہاں بلوائیوں نے بالخصوص مسلمانوں کے قیمتی اثاثوں کو لوٹ لیا۔ کسی کی جان ومال محفوظ نہ رہی۔ ایسے میں انجمن کے دفتر بھی بلوائیوں کی زد میں آ گیا۔ بلوائیوں نے کتابیں، مسودات، اہم کاغذات اور وہ نوادرات جو انجمن کا مخزونہ تھے برباد کر دیئے۔ مخطوطات کو آگ لگا دی۔

مولوی صاحب ہندوستان میں رہ کر کام کرنا چاہتے تھے مگر حالات انہیں پاکستان کی طرف دھکیل رہے تھے۔ مولوی عبدالحق نے سردست انجمن کا دفتر محفوظ مقام پر منتقل کرنے کی غرض سے متعدد اربابِ اختیار سے معاونت چاہی۔ مگر ممکن نہ ہو سکا۔ بالآخر ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو مولوی صاحب نے بادل نخواستہ پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کی بنیاد کراچی میں رکھی گئی۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب مجلس نظامت نے مولوی صاحب کو تقریباً غیر فعال کر دیا۔ پاکستان میں مولوی صاحب کی خاطر خواہ پزیرائی نہ ہوئی ان تمام حالات نے انہیں نہایت دل شکستہ کر دیا اور وہ محض اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے۔

> "بالآخر ۱۹۵۶ء میں صدر مملکت پاکستان نے ایک ضابطے کے تحت مولوی صاحب کو انجمن کا مستقل اور بااختیار صدر قرار دیا اور اس طرح ایک مجلس انتظامیہ کی تشکیل ہوئی۔" (۲۳)

انتظامی امور اور اختیارات کی جنگ کے باوجود مولوی صاحب اپنے مقصد سے منحرف نہ ہوئے۔ مولوی عبدالحق ایک مستند و جامع لغت تالیف کرنا چاہتے تھے جو اسقام سے پاک ہو۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پنڈت کیفی اور سید ہاشمی فرید آبادی شامل تھے۔

مولوی صاحب نے ہندوستان میں اس لغت کا ایک بڑا حصہ تیار کر لیا تھا۔ مگر فسادات میں مسودہ تلف ہو گیا۔ لہٰذا دوبارہ اسی عرق ریزی سے کام کرنا پڑا۔

> "کراچی آنے کے بعد جب انجمن کا ٹھکانہ ہو گیا تو میں نے پھر لغات کا کام شروع کیا۔ اس زمانے میں لغت کی تالیف تنہا شخص کا کام نہیں اس کے لیے عملے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انجمن کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ ایک آدھ مددگار اور کاتب ملازم رکھے۔ ناچار یہ کام مجھے خود ہی کرنا پڑا۔" (۲۴)

انجمن کے زیر انتظام اردو کالج کا قیام بھی انجمن کا ایک قابل ذکر کارنامہ ہے۔ اردو کی ترویج واشاعت کے لیے مولوی صاحب نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور آخری دم تک اردو کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔ اس کی چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور باقی بھی شائع ہونی تھیں مگر بعض حالات کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔

اردو کی تمام مطبوعات پر مشتمل اس کا "قاموس الکتب" کا منصوبہ بھی اردو کے علمی سرمائے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں موضوعاتی فہارس کا منصوبہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس حوالے سے مذہب، عمرانیات اور تاریخ کے موضوع پر مطبوعات کی فہرست پر مشتمل جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ باقی موضوعات پر کام جاری ہے۔ اس کی پہلی جلد بابائے اردو کی وفات سے دو ماہ قبل ان کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔

دکنی ادب کے جو متون انجمن ترقی اردو سے جو متون تصحیح کے بعد شائع کیے گئے ان میں "پھولبن"، "من لگن"، "گلشن عشق"، "کدم راؤ پدم راؤ"، "دیوان حسن شوقی"، "دیوان شاہ تراب" اور "دیوان" قاسم قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ "مآخذات شعرا و مشاہیر" تین جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ جس میں کلاسیکی اور قدیم ادب کے شعرا کے تذکرے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دکنی ادب کی تصانیف، نثری کتب اور منظوم داستانیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ یوں تو مختلف موضوعات پر کثیر کتابیں شائع کرنے کا سہرا انجمن کے سر ہے۔ مگر ہم بالخصوص دکنی ادب کی بات کر رہے ہیں۔

انجمن سے جاری ہونے والے رسائل کا بھی دکنی ادب کی ترویج و تحقیق میں اہم کردار رہا ہے۔ سخاوت مرزا، افسر امروہوی، فرمان فتح پوری کے مقالات "رسالہ" اردو میں تواتر سے شائع ہوتے رہے جس میں سے زیادہ تر دکنی اور قدیم ادب سے متعلق تھے۔

پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے قیام کے بعد تحقیق کو فروغ دینے میں جو محققین قابل ذکر ہیں ان میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فتح پوری، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا اور اسلم فرخی شامل تھے۔ مگر نامساعد حالات کی وجہ سے اردو میں تحقیق کو حسب سابق برقرار نہ رکھ سکے۔ ان کے بعد مشفق خواجہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر شفقت رضوی، سخاوت مرزا وغیرہ نے تحقیق کا علم بلند کیے رکھا۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ گزرتے وقت کے ساتھ محققین کی وہ نسل ختم ہوتی گئی اور تحقیق کا وہ معیار رفتہ رفتہ معدوم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ انجمن کا تحقیقی مجلہ "اردو" بھی اپنا معیار کھوتا چلا گیا۔

انجمن ترقی اردو سے شائع ہونے والے زیادہ تر ادب پارے عمدہ تحقیق کا بین ثبوت ہیں۔ جن میں "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" اور "قدیم اردو" دکنی قدیم ادب کی بازیافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ مولوی عبد الحق کی کاوشیں:

اردو تحقیق کی جس روایت نے پاکستان میں جنم لیا وہ سر سید احمد خان اور تحریک علی گڑھ کے ہمہ گیر اثرات کا ثمر ہے۔ اردو تحقیق کے ضمن میں جن بزرگان ادب نے وقیع خدمات انجام دیں ان میں محی الدین قادری زور، نصر الدین ہاشمی، محمود شیرانی، مسعود حسن روی، امتیاز علی عرشی، غلام رسول سہر، قاضی عبد الودود، مالک رام اور جمیل جالبی کے نام اگرچہ اہمیت کے حامل ہیں مگر ایک ایسی شخصیت جو اس پورے عہد پر چھائی رہی وہ بابائے اردو مولوی عبد الحق کی۔

مولوی عبد الحق نے اردو ادب میں ہمہ جہت تحقیق کی روایت استوار کی۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۶۱ء تک وہ انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے۔ اس نصف صدی کی وابستگی میں نہ صرف خود بے شمار تحقیقی کام سر انجام دیئے بلکہ دوسروں کو بھی ترغیب دی۔

پاکستان آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا جبکہ ہندوستان میں تحقیق کی جو روایت مولوی صاحب نے قائم کی تھی وہ ان کے بعد بھی جاری وساری رہی۔

مولوی عبد الحق کی اردو کے ضمن میں کثیر الجہات خدمات ہیں جن کا ہم ذیل میں مختصر ذکر کریں گے۔ یوں تو مولوی عبد الحق کے لغات نویسی، قواعد ولسانی افکار، خطبات، مقدمات، تبصرے اور تنقید و تحقیق کا دائرہ وسیع ہے مگر چونکہ ہمارا موضوع دکنی ادب سے متعلق ہے لہٰذا اس مقالے میں ہم صرف ان کے شعور دکنیات کے تحت انجام شدہ کاموں کا ذکر کریں گے۔

کسی بھی زبان میں ادب کا مطالعہ کرنے پر نظم کو ادبی سطح پر اولیت حاصل رہی ہے۔ لہٰذا ہم بھی نظم سے ہی بات شروع کرتے ہیں۔

پاکستان کے ماہر دکنیات معین الدین عقیل کی کتاب "اردو تحقیق" کے حوالے سے اب تک کی دستیاب تصانیف میں "کدم راؤ پدم راؤ" کو قدیم ترین مثنوی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ تقریباً چار سو سال قبل کی زبان کا لسانی نمونہ ہے۔ یہ مثنوی ۱۴۲۱ء سے ۱۴۳۵ء کے درمیان لکھی گئی۔

فخر دین نظامی کی مثنوی کا یہ نام شاعر کا تجویز کردہ نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں جب نصیر الدین ہاشمی کو یہ مسودہ دستیاب ہوا تو اس کے شروع آخر اور درمیان کے کچھ صفحات ضائع ہو چکے تھے۔ لہٰذا نصیر الدین ہاشمی نے نظم کے مرکزی کرداروں کی مناسبت سے یہ نام "کدم رائو پدم رائو" تجویز کیا۔

اس مثنوی کا تعارف ۱۹۳۳ء میں نصیر الدین ہاشمی نے رسالہ "معارف" (اعظم گڑھ) میں کرایا۔ بعد ازاں یہ مخطوطہ انجمن ترقی اردو، ہند پہنچا اور جب بابائے اردو نے پاکستان ہجرت کی تو یہ مخطوطہ پاکستان پہنچ گیا۔ سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے خود اس مخطوطے پر تحقیق کی مگر بعض مصروفیات کی بنا پر یہ ذمہداری سخاوت مرزا کے سونپی گئی۔ انھوں نے تقریباً تیس (۳۰) صفحات پر تحقیق کی تھی کہ بعض ارباب اختیار، حکومتی ارکان کی مداخلت اور اعتراض کے نتیجے میں وہ اس کام سے دستبردار ہو گئے۔

> "مثنوی جس املا میں لکھی گئی ہے اس وجہ سے اس کا پڑھنا دشوار تھا، چنانچہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے اس مخطوطے کے چند صفحات کا عکس علی گڑھ، حیدر آباد اور لندن کے مخطوطات شناسوں کو بھیجا گیا تھا، لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے انتہائی دیدہ ریزی و محنت سے پڑھنے میں کامیابی حاصل کر لی اور ایک جامع وبسیط مقدمے کے ساتھ اس کے متن کو مخطوطے کے عکس کے ساتھ شائع کر دیا۔" [۲۵]

"کدم راؤ پدم راؤ" کو کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔

ملا وجہی کی وہ مثنوی جو اس کی شہرت کا باعث بنی "قطب مشتری" ہے۔ "قطب مشتری" دکنی ریاست گولکنڈہ کے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی داستانی عشق پر مبنی ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۱۸ء میں لکھی گئی۔ اگرچہ مثنوی کے تمام تر واقعات حقیقی نہیں بلکہ کچھ اضافہ رنگینی بیان بھی ہے۔ مگر حقیقتاً محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کا قصہ عشق ہی اس مثنوی کی بنیاد ہے۔

اس مثنوی کی تاریخی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ فخر دین نظامی کی "کدم رائو پدم رائو" اور فیروز بیدری کی "پرت نامہ" کے بعد "قلب مشتری" کو لسانی ارتقا کی اہم کڑی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں الفاظ وبزان اور تراکیب لفظی کے علاوہ اظہار کے جو پیرائے بیان کیے گئے ہیں وہ اردو زبان کے ارتقا کے درجہ بدرجہ مراحل کا پتہ دیتے ہیں۔ اس مثنوی میں نیم تاریخی واقعات کو افسانوی انگ میں پیش کیا گیا ہے۔ ورنہ شاید یہ ایک تاریخی دستاویز بن کر رہ جاتی ہے۔ البتہ اس مثنوی سے اس زمانے کے تاریخی واقعات، عوام الناس کا طرز معاشرت، عقائد اور تہذیبی میلانات اہم ہیں۔ جہاں تک اس مثنوی کے حصے کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے کا تعلق ہے تو تاریخ فرشتہ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستان عشق جو ان کے ملن پر ختم ہوئی۔ ایک بازاری عورت نے ملکہ بن کر "حیدر محل" کا لقب پایا اور اسی کی مناسب سے بھاگ نگر کا نام "حیدر آباد" قرار پایا۔

مثنوی کے تمام اجزاء یعنی ابواب کے نام فارسی میں ہیں جبکہ مثنوی کی زبان اردو سے بابائے اردو مثنوی کی تدوین کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

"یہ مثنوی میں نے دو نسخوں سے مرتب کی ہے۔ ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے جو بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ناقص اور نامکمل ہے وآخر اور بیچ سے ورق غائب ہیں۔ دوسرا نسخہ برٹش میوزیم لندن کا ہے جس کا عکس منگوا لیا تھا۔ ان دونوں نسخوں سے مقابلہ کر کے یہ نسخہ ترتیب دیا گیا ہے۔ چونکہ میرا نسخہ ناقص ہے اس لیے بعض مصرعے صاف نہیں ہوئے اور جسے برٹش میوزیم کے نسخے میں تھے ایسے ہی لکھ دیئے گئے۔ جہاں تک میرے نسخے نے ساتھ دیا تصحیح میں وقت نہیں ہوئی۔" (۲۶)

بابائے اردو خود اپنی تدوین کے بارے میں بعض خصائص، تفرق وماثلات کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میرے نسخے میں دو خصوصیتیں قابل ذکر ہیں ایک تو یہ کہ وہ زیادہ بڑا ہے یعنی اس میں بعض بیان ایسے ہیں جو برٹش میوزیم کے نسخے میں نہیں مثلاً سفر میں شہزادے کو جو مہات پیش آئی ہیں وہ لندن والے نسخے میں صرف دو ہیں اژدھے اور دیو کی لڑائی۔ لیکن میرے نسخے میں سیمرغ کا بھی مقابلہ ہے اس طرح کئی اور مقامات میں اضافہ ہے۔ اگر یہ بیانات مکمل ہوئے تو میں مثنوی کے متن میں شامل کر دیتا۔ اس لیے مجبوراً جتنا حصہ موجود ہے وہ ضمیمے کے طور پر اضافہ کر دیا گیا ہے۔ بعض بعض مقامات پر اشعار زیادہ ہیں وہ شعر داخل کر دیئے گئے ہیں اور ان کے شروع میں (ن) لکھ دیا گیا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ میرے نسخے سے لیے گئے ہیں۔ میرے نسخے میں ایک غزل بھی زائد نکلی جو داخل کر دی گئی ہے۔ کتاب کے حاشیہ میں جو لفظ دیئے گئے ہیں وہ میرے نسخے میں ان لفظوں کا بدل ہے جو برٹش میوزیم کے نسخے میں ہیں اور پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ میرے نسخے کے لفظ زیادہ مناسب اور برمحل ہیں۔ ایک دوسری خصوصیت میرے نسخے کی یہ ہے کہ اس کا رسم الخط عجیب قسم کا ہے۔ خط نسخ ہے لیکن الفاظ میں اکثر حروف علت کا کام اعراب سے لیا گیا ہے۔ خصوصاً ان حرف علت کے لیے جو لفظ کے آخر میں آتے ہیں مثلاً اس مصرع کو

جو بے ربط بولے تو بہتان پچیس

یوں لکھا ہے

جوب ربط بول تو بہتان پچیس

میں نے اس رسم الخط کا عکس نمونہ بھی کتاب میں دے دیا ہے۔" (۲۷)

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابائے اردو نے دستیاب رسائل میں کس قدر بیدار بینی کا ثبوت دیتے ہوئے نہایت عرق ریزی سے تدوین کر کے قدیم نسخہ ہائے دکنیات کو قابل فہم بنا کر پیش کیا۔ "در شعر گوید" کے عنوان کے تحت وجہی نے چار اشعار لکھے ہیں جن کی لسانی طور پر بڑی اہمیت ہے مگر برٹش میوزیم کے نسخے میں ایک شعر کا اضافہ ہے۔ یعنی وہاں پانچ اشعار درج ہیں۔ بابائے اردو نے تقابل کر کے اضافی شعر کو اصل متن سے خارج کر دیا ہے اور حاشیہ میں اس کی توضیح بھی کر دی ہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ بھی دی ہے جس سے الفاظ کے معانی کی تفہیم سہل ہو گئی ہے۔

مولوی عبد الحق کی مرتبہ مثنوی "گلشن عشق" جو نصرتی کی طبع زاد تھی۔ مولوی عبد الحق نے اسے مرتب کر کے اپنے نہایت دقیع اور جامع مقدمے کے ساتھ ۱۹۵۲ء میں کراچی، انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع کرایا۔

"گلشن عشق" ۱۰۶۸ھ میں لکھی گئی اس میں منوہر اور مدمالتی کا عشقیہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ قصے کے مآخذ کے بارے میں نصرتی نے کوئی وضاحت نہیں کی کہ یہ کیونکر لکھا گیا یا کسی کی فرمائش پر...؟ بس صرف اتنا لکھا ہے کہ اس کے ان کے مصاحب بنی ابن عبد الصمد نے اس قصے کے لکھنے کی ترغیب دی۔ جبکہ مولوی عبد الحق کے مطابق یہ قصہ کسی ہندی قصے سے مشتق ہے۔ مولوی عبد الحق اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "تحقیق سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس سے قبل بھی تحریر میں آچکا ہے۔ ایک صاحب شیخ منجھن نامی نے اسے ہندی میں لکھا تھا۔ یہ کتاب اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ اس کا حوالہ ایک دوسری کتاب مسمی "قصۂ کنور منوہر و مدمالت" میں ملتا ہے۔ یہ فارسی مثنوی ہے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا۔ البتہ سنہ تصنیف ۱۰۵۹ھ ہے۔ اس میں مصنف نے شیخ منجھن کی ہندی کتاب کا ذکر کیا ہے اور اپنے قصے کی بنیاد اس پر رکھی ہے۔ تیسری کتاب عاقل فان دازی عالمگیری کی مثنوی "مہر وماہ" ہے جو ۱۰۶۵ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں بھی یہ ہی قصہ ہے۔ رازی نے منوہر کو مختصر کر کے مہر کر دیا ہے۔ یہ تینوں کتابیں "گلشنِ عشق" سے پہلے کی تصنیف ہے۔ بعض شعرا نے اس کے بعد بھی اس افسانے کو نظم کیا ہے۔ ان میں سے ایک حسام الدین حصار کا رہنے والا عالمگیر کے عہد میں ہوا ہے۔ اس کی کتاب کا نام "حسن و عشق" اور سنہ تصنیف ۱۰۷۱ء ہے۔"(۲۸)

بابائے اردو نے اس مثنوی کو مرتب کرتے ہوئے کسی نسخے کو بنیاد بنایا اس کی صراحت نہیں ملتی البتہ آپ فرماتے ہیں: "میرے پاس اس کتاب کے کئی نسخے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم ۱۰۹۳ھ کا ہے۔ یعنی تصنیف سے ۲۵ سال بعد کا۔" (۲۹)

کتاب کے آخر میں بابائے اردو نے تقریباً تیس (۳۰) صفحات کی فرہنگ بھی شامل کی ہے۔ الفاظ کی فرہنگ کی بدولت معانی کی رسائی میں سہولت ہو گئی ہے۔ یہ تدوین متن کی بہترین صورت ہے۔

بابائے اردو نے نصرتی کی گلشن عشق کے علاوہ "علی نامہ" اور "تاریخ سکندری" کو بھی اپنے جامع کے ساتھ متعارف کرایا۔ اس کے ساتھ ساتھ نصرتی کے قصائد اور غزلیات کو بھی یکجا کر کے نہایت تحقیق کے ساتھ نصرتی کے ادبی مقام کا تعین کیا ہے۔

نصرتی کے حوالے سے ایک غلط العام تصور یہ بھی تھا کہ نصرتی ہندو برہمن تھا۔ اس ضمن میں گارساں دتاسی کے لکھے "گلشن عشق" کے ایک قلمی نسخے کی سند پر جو کام نجی ورم میں لکھا گیا تھا نصرتی کو برہمن بتایا گیا تھا۔ اس حوالے سے بابائے اردو اپنی کتاب "نصرتی" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

"گارساں دتاسی نے "گلشن عشق" کے ایک قلمی نسخے کی سند پر جو کانجی ورم میں لکھا گیا تھا، اسے برہمنی بتایا ہے۔ یہ بیان بھی مبہم ہے اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ خود کتاب میں اس قسم کا کوئی اشارہ ہے یا کاتب نے آخر میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے اور بعد کے بعض تذکرہ نویسوں نے بھی گارساں دتاسی کے اس بیان پر اسے برہمن لکھ دیا ہے۔ اس کتاب کے متعدد نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں کہیں اشارتاً بھی ایسی کوئی بات نہیں کہ جس سے یہ استنباط کیا جائے کہ نصرتی برہمن تھا۔ بلکہ خود نصرتی نے اپنے متعلق "گلشن عشق" میں جو سرسری ساذکر کیا ہے اس سے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی مدح لکھتے لکھتے ایک شعر یہ لکھا ہے:

محمد اللہ کرسی بہ کرسی مری
چلی آتی ہے بندگی میں تری

یہاں کرسی سے مراد نسل ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس کے باپ دادا مسلمان تھے۔" (۳۰)

نصرتی کی ادبی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولوی عبدالحق کے بعد جمیل جالبی نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا اور اس میں مزید اضافے کیے۔

اردو نثر میں بھی دکنی ادب کے حوالے سے جو تحقیق امور انجام دیئے ہیں ان میں سرفہرست ملا وجہی کی "سب رس" کی تدوین ہے۔ بابائے اردو نے اسے جامع مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۲ء میں انجمن ترقی اورنگ آباد سے شائع کیا۔

ملا وجہی نے "سب رس" نامی کتاب بادشاہ عبداللہ قلی قطب شاہ کی فرمائش پر ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء میں لکھی۔ یہ اردو کی قدیم ترین تصانیف میں سے ایک ہے۔ "اس میں موجود قصے کے بارے میں بابائے اردو کا خیال تھا کہ اس کا قصہ محمد یحیٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کے قصہ حسن ودل سے ماخوذ ہے۔" [۳۱]

چونکہ اس کے ماخذ کے بارے میں مصنف نے خود کچھ نہیں لکھا لہٰذا اس حوالے سے بابائے اردو نے اپنے فاضلانہ مقدمے میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

سب رس کے مآخذ کے حوالے سے دیوی سنگھ چوہان نے میراٹھی ساہتیہ پتر کا، اپریل ۱۹۶۹ء میں یہ انکشاف کیا کہ سب رس کا ماخذ بہار کے کرشن مشر کا سنسکرت ڈرامہ "پربودھ چندرودے" ہے جو ۱۰۶۵ء میں لکھا گیا۔ اس تحقیق کو ڈاکٹر نور السعید اختر نے اپنے ایک مضمون میں پیش کیا۔ ڈاکٹر منظر اعظمی کی رائے کو گیان چند یوں پیش کرتے ہیں "حسن ودل" اور "پربودھ چندرودے" میں کوئی اشتراک نہیں، لیکن فتاحی نے مجرد صفحات اور جذبات کو مجسم کرنے کا طریقہ "بربودھ چندرودے" ہی سے لیا ہے۔" [۳۲]

اس قصے میں وجہی نے اخلاقی خصائص کو تمثیلی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس نے "سب رس" کو تمثیل نگاری کا نقطہ آغاز بنادیا۔ اردو ادب میں اس سے قبل تمثیل نگاری کی ایسی مثال نہیں ملتی۔

مولوی عبدالحق نے "معراج العاشقین" مرتب کر کے ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد دکن سے شائع کرائی۔ مگر اس کے مصنف کے بارے میں بابائے اردو مطمئن نہ تھے۔ ان کی کئی تحاریر اس سلسلے میں حوالے کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن میں انھوں نے "معراج العاشقین" کے انتساب کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے۔ مگر اب جبکہ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے "معراج العاشقین کا مصنف" لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف ہے۔ قطعہ نظر اس کے کہ "معراج العاشقین" کا مصنف کون ہے۔ اس کی دریافت اور اشاعت کا سہرا بہر حال بابائے اردو کے سر جاتا ہے۔ اگرچہ "معراج العاشقین" دکنی ادب میں ملا وجہی کی "سب رس" کے بعد کی تصنیف ہے اور یہ کوئی ادبی تصنیف نہیں بلکہ ایک مذہبی تصنیف ہے جس کا موضوع اختلاف و تصوف ہے۔

بابائے اردو اس کے انتساب پر کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے۔ اپنے مضمون "اردو زبان وادب" میں جو ماہنامہ "ہم قلم" کراچی، میں اگست ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ لکھتے ہیں کہ:

"دیگر کتابوں میں جس میں حضرت کا تذکرہ ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ دکنی یا قدیم اردو میں بھی ان کی کوئی تصنیف ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ان کے فارسی اور عربی رسالوں کے ترجمے ہیں جو ان کے نام سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ اس قسم کی بدعت ہماری زبان میں ہوتی رہتی ہے۔"(۳۳)

مولوی عبدالحق کے تحقیقی خدمات میں ان کی چند کتابوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو دکنیات سے متعلق ہیں۔

اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام:

مولوی صاحب کی یہ تخلیق ۱۹۳۲ء میں اورنگ آباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مصنف نے زبان وادب کی نشو و نما کے سلسلے میں صوفیا کرام کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کے حوالے سے کچھ اشعار پر بحث ہے جس میں ناقدین کی آرا بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں جن بزرگان کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں "ان بزرگوں میں امیر خسرو، سراج الدین عثمان، شیخ شرف الدین، حضرت برہان الدین غریب وغیرہ کے اشعار واقوال پیش کر کے بابائے اردو نے اردو زبان کے ابتدائی نقوش کی نشاندہی کی ہے۔"(۳۴)

اسی کتاب کے ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۷ء کے ایڈیشن میں بعض صوفیائے کرام کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے شائع ہوئی۔

جن صوفیائے کرام کے ناموں اور خدمات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ان میں شیخ احمد کھٹو، شیخ لطیف الدین دریا نوش، شیخ علی متقی اور شیخ رزق اللہ کے ناموں کا اضافہ ہے۔

مولوی عبدالحق نے قدیم شعرائے دکن اور ادباء پر مضامین و مقالات تحریر کر کے انہیں گمنامی کے اندھیروں سے نکالا۔ اس کام کا آغاز انھوں نے ایک مقالے سے کیا جس کا عنوان تھا "بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان" یہ مقالہ رسالہ اردو میں اپریل ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ اس سلسلے میں شاہ میراں جی الشمس العشاق، حضرت شاہ برہان الدین جانم اور شاہ امین الدین اعلیٰ کا تذکرہ کیا گیا اور ان کی تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے ان کی شاعرانہ اہمیت بیان کی گئی ہے۔

شمس العشاق کی تاریخ وصال ہمیشہ سے صاحبان علم کے درمیان بحث بنی رہی ہے۔ اس حوالے سے بابائے اردو نے قدیم اردو میں لکھا ہے کہ:

"تذکرہ اولیائے دکن میں ان کی تاریخ وفات ۹۱۰ھ لکھی ہے مگر یہ درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ "شمس العشاق" سے ان کی وفات کی تاریخ نکلتی ہے جو ۹۰۲ھ ہے اور یہ مادہ شاہ حسین ذوقی کا کیا ہوا ہے... البتہ مجھے ایک پرانا مرثیہ ملا ہے جو کسی نے حضرت میراں جی کی وفات پر لکھا ہے۔ اس سے ان کی وفات کی تاریخ ۲۵ شوال ۹۰۲ معلوم ہوتی ہے۔"(۳۵)

اسی طرح شاہ برہان الدین جانم کی تاریخ وفات پر محقق دلائل دیئے۔

"جانم کی ۹ طویل و مختصر نظموں اور ڈھائی ہزار اشعار کی ایک طویل نظم "ارشاد نامہ" کا تعارف کرایا اور اس پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔"(۳۶)

قدیم اردو نامی کتاب میں مولوی عبدالحق نے قدیم شعرا اور قدیم ادب پر تحقیقات مقالات لکھے ہیں۔ جن کا مجموعہ "قدیم اردو" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا۔ قدیم ادب کے مطالعے کے لیے یہ کتاب ایک اچھا ماخذ ہے۔

مخزن الشعرا (تذکرہ شعرائے گجرات)

قاضی نور الدین حسین خان رضوی "فائق کا یہ تذکرہ پہلی بار ۱۹۳۳ء میں مولوی عبدالحق نے مرتب کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کیا۔(۳۷)

یہ تذکرہ گجرات کے بارہویں اور تیرہویں صدی کے ۱۱۲ الشعرا کے احوال پر مبنی ہے۔ جس میں شعرا کے کلام کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۸۵۱ء میں لکھا گیا۔

بابائے اردو کے پیش نظر اس تذکرے کے دو قلمی نسخے تھے۔ ایک نسخہ فائق کے پوتے نے انہیں دیا تھا جبکہ دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی کا تھا۔ ان دونوں سے مقابلہ کر کے بابائے اردو نے یہ تذکرہ مرتب کیا۔

تذکرہ مخزن الشعراء کے مقدمے میں بابائے اردو لکھتے ہیں کہ ": اگرچہ صاحب تذکرہ نے ازراہ انکسار محاورہ شعرائے گجرات کے متعلق اہل دہلی اور لکھنو سے معذرت کی ہے لیکن حق یہ ہے کہ ان شعرا نے زبان اردو کو بڑی خوبی سے لکھا اور ان کی زبان کسی طرح دہلی اور لکھنو کے عام شعرا سے کم نہیں بلکہ بعض ان میں استادانہ حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی زبان کی فصاحت اور صفائی میں کلام نہیں ہو سکتا۔"(۳۸)

د۔ پاکستان میں دکنیات کے اہم محققین: تعارف اور کام کا مختصر جائزہ:

سخاوت مرزا:

سخاوت مرزا اعلیٰ ذوق کے حامل ایک وسیع النظر اور غیر جانبدار محقق تھے۔ اعلیٰ پائے کی تحقیق اور مستند حوالہ جات کی تلاش و جستجو ان کا خاص مزاج تھا۔

"سخاوت مرزا رمضان ۱۳۱۵ھ میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔"(۳۹)

آپ کا خاندان یوپی کے مشہور شہر آگرہ سے تعلق رکھتا تھا۔ احمد خان شیفتہ آپ کے جد امجد ہی سے تھے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی بعد ازاں بغور نصاب عربی، نامی کی تحصیلی کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۷ء میں بی اے جبکہ ۱۹۲۹ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

عملی زندگی کا آغاز نظایت اضلاع پولیس کی ملازمت سے کیا۔ بعد ازاں سر رشتہ دار عدالت اور منتظم عدالت فوجداری کی خدمت انجام دیں اور ۱۹۵۲ء میں نیک نامی کے ساتھ وظیفہ یاب ہوئے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مرزا صاحب نے مستقل طور پر کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ کراچی میں مختلف اداروں میں خدمات انجام دیتے رہے جن میں انجمن ترقی اردو، ترقی اردو بورڈ، ایجوکیشنل کانفرنس، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور اقبال اکادمی شامل ہیں۔

۲۲ جنوری ۱۹۷۷ء کو کراچی میں انتقال ہوا اور کراچی میں ہی مدفون ہوئے۔

مرزا صاحب نے ۱۹۳۸ء سے لکھنا شروع کیا۔ مولوی عبدالحق اور عمر الیافعی کی تحریک و ترغیب پر لکھنے لکھانے کی طرف راغب ہوئے۔

سخاوت مرزا کے مضامین انجمن ترقی اردو کے رسالے "اردو" میں شائع ہونے لگے۔ اعلیٰ تحقیقی معیار نے ادبی حلقوں میں سخاوت مرزا کی پہچان بنا دی۔ ان کے تحقیقی مقالات "اردو"، معارف (اعظم گڑھی)، قومی زبان (کراچی)، آج کل (دہلی)، برہان (دہلی)، اورینٹل کالج میگزین (لاہور)، اردو نامہ (کراچی)، صحیفہ (لاہور)، سب رس (کراچی)، العلم (کراچی) اور الولی (حیدر آباد سندھ) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔

وہ دکنیات سے متعلق تواریخ، تبصروں، صوفیائے دکن اور ان کے شجرہ و سوانح کے متعلق گہرا علم رکھتے تھے۔ دکن کی بعض شخصیات کے بارے میں ان کی تحقیق اولین تحقیق کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے بیشتر مقالات گم نام تصانیف یا شخصیات کے تعارف پر مبنی ہیں۔

نادر ونایاب مخطوطات سے مواد حاصل کرنے کے ضمن میں ان کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ تاریخ اوقات میں مطالعہ کا شغل کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ کے نایاب کتب کی نقل، تلخیص اور کارآمد حصوں تک رسائی کا باعث بنا۔ جو آگے چل کر تحقیق و تالیف میں کام آیا۔ بالخصوص قدیم شعراو مصنفین اور صوفیا کے حالات پر ان کے بے شمار مقالات مختلف رسائل و جرائد میں اب تک منتشر پڑے ہیں۔

تصانیف:

ا۔ من لگن:

یہ مثنوی شیخ محمود بحری کی تصنیف ہے جو دکنی زبان میں ہے۔ اس کا موضوع تصوف ہے۔ اسے سخاوت مرزا نے نہایت دقتِ نظر سے مرتب کر کے ۱۹۵۵ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے شائع کیا۔

۲۔ تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت:

سخاوت مرزا نے مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے حالاتِ زندگی، شجرہ نسب، اولاد اور ملفوظات پر جامع تذکرہ کیا ہے۔ جو کتابی شکل میں انڈو والیٹ کلچر انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد نے... میں شائع کیا۔

۳۔ مکتوبات ابو العلا اکبر آبادی:

نقشبندی سلسلے کے مشہور بزرگ کے مکتوبات بھی انھوں نے مرتب کیے جس کو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے شائع کیا۔

۴۔ مختصر تذکرہ مخدوم عبد الحق ساوی:

مرزا صاحب نے ۱۹۴۱ء میں ایک مختصر تذکرہ عبد الحق ساوی کے حالات و تعارف پر لکھا جو حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ جبکہ بعد میں عبد الحق ساوی کے حالات کے ساتھ ساتھ ملفوظات کے افسانے کے ساتھ مفصل کتاب لکھی جو "العلم" (کراچی) میں بالاقساط شائع ہوئی مگر کہیں سے کتابی شکل میں شائع نہ ہو سکی۔

۵۔ معراج العاشقین:

دکنی ادب کے اردو کا نمونہ، اس قدیم کتاب کو مرزا صاحب نے مروجہ اردو میں منتقل کیا اور ۱۳۸۸ھ میں دکن دار الاشاعت (کراچی) سے شائع ہوئی۔

۶۔ تذکرہ حدیقہ المرام:

مہدی واصف کے عربی تذکرے کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا جو پہلے رسالہ "اردو" میں شائع ہوا جبکہ بعد ازاں کتابی شکل میں ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔

۷۔ مخزن اسرارِ حقیقت:

شاہ کمال الدین کٹرپوی کے حالات، ملفوظات وتعلیمات پر مشتمل یہ کتاب کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ دراصل ایک طویل مقالہ تھا جو بعد ازاں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

۸۔ دیوانِ قاسم:

شاہ قاسم اورنگ آبادی کے حالات اور نمونہ کلام پر مفصل معلومات پر مشتمل یہ کتاب انجمن ترقی اردو کراچی سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اٹھارویں صدی کے لسانی تجزیہ پر مشتمل اہم اور قابل قدر کاوش ہے۔

۹۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند کا دسواں اور گیارہواں باب سخاوت مرزا نے مشفق خواجہ اور فیضان دانش کے اشتراک سے لکھا۔

۱۰۔ تاریخ ادب اردو مرتبہ عبدالقیوم (جلد اول) میں سخاوت مرزا کے لکھے ہوئے تین ابواب ہیں۔ اگرچہ یہ تاریخ مکمل نہ ہوسکی مگر اس کی پہلی جلد ۱۹۶۱ء میں پاکستان ایجوکیشنل پریس سے شائع ہوئی جس میں ۷۰۷ اء سے ۱۲ ۷ ۱ء تک کی اردو کی ادبی تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۱۱۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو: جلد اول میں چھٹا باب سخاوت مرزا نے ظہیر الدین مدنی کے اشتراک سے لکھا ہے جس میں ولی کے حالات وکلام کا مفصل حاصل درج ہے۔ یہ کتاب شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔

اس کے علاوہ سخاوت مرزا کی کچھ غیر مطبوعہ کتب بھی ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۲۔ اقوام ہند دکن

۱۳۔ تذکرہ اولیائے دکن

۱۴۔ گجرات میں اردو

۱۵۔ تذکرہ مبلغین ومجاہدین [۴۰]

سخاوت مرزا کے اہم مقالات:

سخاوت مرزا دکنی ادبیات پر وقیع معلومات اور گہری نظر رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی خدمات کا بڑا حصہ مضامین اور مقالات پر مشتمل ہے جو مختلف رسائل میں طویل عرصے تک ایک تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے نہ صرف قدیم صوفیا، شعرا، ادبا اور مشاہیر کو اپنے مضامین ومقالات کا موضوع بنایا بلکہ متروک اصناف سخن اور مختلف مبہم مباحث کو بھی شواہد وتحقیق کے معیار پر پرکھا ہے۔

لغات کے سلسلے میں سخاوت مرزا کا ایک مقالہ "تحقیقات الفاظ ہندی غرائب اللغات"[41] لکھا۔ اس مقالے کی اہمیت اس اعتبار سے فزوں تر ہو جاتی ہے کہ اس میں اردو کے بعض قدیم لغات اور لغت نگاروں کا ذکر شامل ہے جو کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ سخاوت مرزا کے اس مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے بعض ادبا نے اس بات پر تحقیق کی ہے کہ ایک قدیم لغت میں اردو الفاظ کون سے ہیں۔ نیز ہندی اور فارسی الفاظ کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے "تحقیقاتِ الفاظ ہندی اور اردو غرائب اللغات" نامی مخطوطے سے استفادہ کیا جس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

ادبی تحقیق کے سلسلے میں بھی سخاوت مرزا کا کام دکنی ادب کے حوالے سے نمایاں ہے۔ انھوں نے ہی اول اول حسن شوقی کی تین غزلیں ایک قلمی بیاض میں تلاش کر کے "اردو کی ایک قلمی بیاض"(۴۲) کے عنوان سے رسالہ "اردو" میں شائع کیں۔

نئے نئے متون کی دید و دریافت کے ضمن میں سخاوت مرزا کے دو مقالات کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پہلا قدیم اور دکنی شعرا کا تعارف اور کلام کے نمونے پر مشتمل "قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض"(۴۳) کے نام سے رسالہ اردو میں شائع ہوا جبکہ دوسرا مقالہ دکن کے معروف شعرا کے غیر مطبوعہ مراثی پر مشتمل ہے جو ماہنامہ "اردو" میں "قدیم دکنی شعرا کے چند نایاب مرثیے"(۴۴) کے نام سے شائع ہوا۔ یہ تمام معلومات انھیں کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد دکن کے نایاب قلمی مراسلوں اور بیاضوں سے دستیاب ہوئیں۔

جہاں تک منظوم دکنی ادب کی بازیافت کا تعلق ہے تو پاکستان میں شائع ہونے والے متون میں سے اہم مثنوی "من لگن" ہے جس کے شاعر قاضی محمود بحری ہیں۔ اس مثنوی کو سخاوت مرزا نے مرتب کر کے ۱۹۵۵ء میں کراچی سے شائع کرایا۔ سخاوت مرزا نے اردو کی پہلی نصابی مثنوی پر جامع تحقیق کی اور ایک مقالہ تحریر کیا جس کا عنوان "خوان یغما دکنی"(۴۵) ہے۔ جس میں انھوں نے "خالق باری" نامی مثنوی کو اردو ادب کی اولین نصابی تصنیف قرار دیا جبکہ مولوی عبدالحق نے بھی اس ضمن میں سخاوت مرزا کی تائید کی۔ اہم متون میں ایک قابل ذکر "ارشاد نامہ" ہے جو شاہ عبد القادر کرنولی کا تصنیف کردہ ہے۔ سخاوت مرزا نے اس کا متن مرتب کیا جو کہ علی گڑھ سے رسالہ "اردو ادب"(۴۶) میں شائع ہوا۔ اب تک "ارشاد نامہ" شاہ عبد القادر کا صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے جو کہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ میں موجود ہے۔ سخاوت مرزا نے اسی واحد نسخے کو پیش نظر رکھا ہے۔

شاہ قاسم اورنگ آبادی کا دیوان اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں ایہام گوئی کے رد میں چلائی جانے والی تحریک کی نمائندہ شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ اس قسم کے شاعروں کے نمونے یا تو سراج اورنگ آبادی کے

یہاں ہیں یا شاہ قاسم کے دیوان ہیں۔ سخاوت مرزا نے "دیوان قاسم" مرتب کرتے ہوئے متعدد نسخوں سے استفادہ کیا اور مبسوط و مقدم شاہ قاسم اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور شاعرانہ خصوصیات کا احاطہ کرنے کی قابل تعریف سعی ہے یہ کراچی سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔

اگر قدیم اردو نثر کی بازیافت و تحقیق کی بات کریں تو اس حوالے سے ایک اہم تذکرہ نصیر الدین ہاشمی نقش کا "تذکرہ عروس الاذکار" ہے۔ یہ ۱۲۸۹ھ کی تصنیف ہے۔ اس تذکرے کی صرف تین نسخے معلوم ہیں جن میں سے دو کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں اور ایک ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں موجود ہیں۔ سخاوت مرزا نے سب سے پہلے اس تذکرے کا تعارف لکھا اور اس کی ادبی اہمیت اور قدامت پر نظر کی ان کا یہ مقالہ ماہنامہ "اردو"(۴۷) میں شائع ہوا۔ اس تذکرے میں پہلی مرتبہ نقش حیدر آبادی کے آبائو اجداد، وطن، مذہب، تلمذ اور تلامذہ کے بارے میں مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ نقش حیدر آبادی، فیض کے شاگرد تھے۔ مقالے کے آخر میں تذکرے میں جن شعرا کا ذکر ہوا ان کے نام بھی دیئے ہیں۔ یہ مقالہ ۳۲صفحات پر مشتمل ہے۔

سخاوت مرزا نے قدیم مصنفین کے تعارف کے لیے مختلف کتب خانوں سے استفادہ کیا اور قدیم شعراا ور ادبا کے حالات زندگی وکلام کی بازیافت کی اور ضروری وضاحتوں کے ساتھ انہیں مختلف رسائل میں شائع کراتے رہے۔ جیسا کہ اردو کے اولین غزلوں کی تحقیق کے ضمن میں محمود شیرانی نے امیر خسرو کی غزل زحال مکین... الخ کو اردو کا پہلا ریختہ قرار دیا تھا۔ سخاوت مرزا نے اپنے ایک مقالے میں یہ ثابت کیا کہ امیر خسرو کا یہ ریختہ قدیم ضرور ہے مگر شیخ فرید الدین گنج شکر کا ایک دستیاب ریختہ قدیم تر ہے۔(۴۸) اور غالباً اردو کا پہلا ریختہ ہے۔ اسی حوالے سے نویں صدی ہجری کے اوائل کے صوفی شیخ بدر الدین جونپوری کا ایک ریختہ سخاوت مرزا کو ملک محمد جائسی کے مجموعہ رسائل میں سے رسالہ سوم "اکھروتی" سے دستیاب ہوا۔ انھوں نے اس ریختہ کو تعارف کے ساتھ شائع کرایا۔(۴۹) یہ مجموعہ رسائل گلبرگہ کے کتب خانے میں مخزون ہے۔

> کتب خانہ آصفیہ میں موجود ایک مثنوی "بہاستان عشق" ہے جس کے مصنف کا نام مسرور ہے۔ مگر اس کے حالات زندگی مفقود تھے۔ انھوں نے مثنوی کی داخلی شہادتوں کی مدد سے کچھ حالات اخذ کیے اور مثنوی اور شاعر کے مکمل تعارف کے ساتھ شائع کیا۔"(۵۰)

اسی طرح مثنوی "جامع الحقائق" کے مصنف سید احمد قادری الحسینی سبز پوش کے حالات پردہ اخفاء میں تھے اس ضمن میں سخاوت مرزا نے خانوادہ سبز پوش کے تاریخی حوالے اور واقعات کا بہترین انسلاک پیش کیا

ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے قیاس کیا ہے کہ شاعر شاہ عظمت اللہ کے مرید تھے اور پھر شاہ عظمت اللہ کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے مثنوی کے مندرجات کا ذکر کیا ہے۔ "مثنوی جامع الحقائق"(۵۱) نامی مقالہ جنوری ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔

مثنوی "من موہن" جس کے شاعر عین الحق آزاد حیدر آبادی ہیں۔ اس مثنوی کو بھی شاعر کے تعارف کے ساتھ سخاوت مرزا نے بنام "مثنوی من موہن" (۵۲) شائع کرایا۔ اس مثنوی کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔ ایک اور مثنوی "ریاض الحسنین" مصنفہ عشرت بریلوی کا تعارف بھی سخاوت مرزا نے کرایا اور بتایا کہ عشرت بریلوی نہ صرف مرزا علی لطف کے شاگرد تھے بلکہ صاحبِ دیوان بھی تھے۔ یہ مثنوی ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ سخاوت مرزا نے ایک مقالے میں مثنوی "جگت روپ" (۵۳) اور اس کے شاعر نول سنگھ کا ممکنہ تعارف پیش کیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۶۴ھ میں لکھی گئی تھی اور اس مثنوی میں ڈھائی ہزار اشعار موجود ہیں۔ یہ مقالہ رسالہ اردو میں دو اقساط میں شائع ہوا۔

اکتوبر ۱۹۵۴ء میں سخاوت مرزا نے ایک مقالہ تحریر کیا جس میں انھوں نے ایک مشرق "ایڈورڈ بالفور" کے بارے میں اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ "ایڈورڈ بالفور" ۱۸۳۴ء سے ۱۸۷۶ء تک اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ اس دوران انھوں نے نہ صرف اردو زبان میں قابل ستائش مہارت حاصل کی بلکہ کچھ اہم انگریزی کتابوں کے تراجم بھی کیے مگر تاریخ اردو ادب ان کے ذکر سے خالی ہے۔ لہٰذا سخاوت مرزا نے اس مقالے میں ان کے حالات زندگی اور تصانیف کا تعارف پیش کیا ہے۔ یہ مقالہ "ایڈورڈ بالفور" (۵۴) کے عنوان سے سہ ماہی "اردو" میں شائع ہوا۔

متذکرہ رسالے میں ہی "ملک الشعراء غواصی اور اس کا کلام" (۵۵) کے عنوان سے ایک طویل مقالہ بھی شائع ہوا جس میں دکن کے مشہور شاعر غواصی کے احوال و آثار، شاعرانہ خصوصیات اور نمونہ کلام پر تفصیلی معلومات شامل ہیں۔

"مدراس کی ایک جید شاعرہ اشیمہ" (۵۶) کے حالات زندگی اور ادبی خدمات کے مفصل ذکر پر مشتمل مقالہ لکھا۔ اس مقالے میں سخاوت مرزا نے دکن میں خواتین کی علم دوستی اور علم پروری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس زمانے میں جب خواتین کی تعلیم کا کوئی باضابطہ انتظام نہ تھا۔ تب بھی خواتین میں علم کا کیسا ذوق و شوق پایا جاتا تھا۔ یہ مقالہ "اشیمہ" کے حالات زندگی اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے۔

سخاوت مرزا نے اپنے ایک مقالے میں مشہور کتاب "نصاب الاحتساب" مصفنہ علامہ ضیاء الدین عمر بن عوض الشامی، کو مختلف شہادتوں کی مدد سے ثابت کیا کہ غواصی گولکنڈوی اس کتاب کا کاتب ثابت کیا۔ جو کہ تانا شاہ کے اوائل عہد تک بقید حیات تھا۔ سخاوت مرزا کا یہ مقالہ اورینٹل کالج میگزین میں بعنوان "نصاب الاحتساب عربی کا کاتب غواصی گولکنڈوی"(۵۷) ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔

سخاوت مرزا نے ایک مقالہ "میر غلام مصطفی، سخن اورنگ آبادی"(۵۸) کے نام سے تحریر کیا جس میں ان کے حالات زندگی کو پردہ اخفا سے نکال کر مکمل تعارف، نمونہ کلام کے ساتھ شائع کیا۔ نیز ان کے کہے ہوئے معاصرین کے تاریخی قطعات بھی درج کیے ہیں۔

"سید شاہ کمال الدین"(۵۹) کے تعارف اور ملفوظات پر مشتمل مقالہ سہ ماہی "اردو" میں شائع ہوا۔ جس میں بعض تسامحات کی تصحیح جولائی کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ یہ غالباً سخاوت مرزا کا پہلا مقالہ تھا جو ماہنامہ اردو میں شائع ہوا۔

بعنوان "ولی محمد عقلان حیدر آبادی"(۶۰) ایک مقالہ تحریر کیا جس میں مختلف حوالوں اور شہادتوں سے ثابت کیا کہ وہ صرف ایک مناقب گو ہی نہ تھے بلکہ اپنے زمانے کے ایک مایہ ناز غزل گو، مرثیہ گو اور مثنوی گو شاعر تھے نیز ان کا مجموعہ کلام بھی شامل مقالہ ہے۔

"والہ موسوی"(۶۱) نامی مقالے میں والہ موسوی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ کا اصل وطن خراسان تھا مگر مختلف واقعات کے نتیجہ میں ۱۱۳۷ھ میں دکن میں وارد ہوئے۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ آپکو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ سخاوت مرزا نے آپ کی گیارہ تصانیف کا ذکر اس مقالے میں کیا ہے۔ ان کی مایہ ناز تصنیف "رازق باری" ہے جو دراصل نصاب صبیان ہے جو کہ "خالق باری" کے طرز پر لکھا گیا ہے۔

سخاوت مرزا کا ایک طویل الاسم مقالہ "بیجا پور کے دو گمنام شاعر: فاضل خان اور افضل خان بیجاپوری المتخلص بہ فاضل کی دکنی غزلیں"(۶۲) ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے "کلیاتِ سلطان علی عادل شاہ" سے دستیاب غزلوں کا حوالہ دیا ہے، نیز ہر دو کے حالات زندگی اور نمونہ کلام اس مقالے کا حصہ ہیں۔

شاہ تراب دکنی ادب کے مشہور شاعر ہیں ان کی مثنوی "مہ جبین وملا" کے تعارف میں سخاوت مرزا نے ایک مقالہ لکھا۔ جس میں نہ صرف شاعر کے حالاتِ زندگی بلکہ ان کی مثنوی کا ادبی اور لسانی تجزیہ بھی شامل ہے۔

سخاوت مرزا کے تحریر کردہ مقالات میں ایک طویل فہرست ان شخصیات کی ہے جنھوں نے مذہبی، رہنمائی کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی بھی تعلیم دی اور بالخصوص اپنے علاقے جبکہ بالعموم جنوبی ہند پر لسانی اور تہذیبی اثرات مرتب کیے۔ ان میں سے اکثر وہ خاموش خدمت گذار ہیں جن کا ذکر اردو ادب کی کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ سخاوت مرزا نے ایسے بے شمار شعرا و ادبا کا تعارف کرایا بلکہ ان کے بارے میں معتبر معلومات کی بہم رسانی بھی ممکن بنائی۔ تحقیق کے اعلیٰ معیار نے سخاوت مرزا کے مقالات و تصانیف کو دکنیات کے طالب علموں کے لیے ایک مآخذ کا درجہ عطا کیا ہے۔

اس ضمن میں مختلف ادوار میں جن جن شخصیات پر آپ نے مقالات تحریر کیے ہم ذیل میں ان میں سے چند دستیاب مقالات کے نام درج کر رہے ہیں۔ ان میں ابو المعرفت شاہ زین الدین گنج نشین بیدری(۶۳)، شاہ صدر الدین مسیوالی (دکھنی) قدس سرہ(۶۴)، سید شیخ عبدالقادر فی الحال قادری کرنولی(۶۵)، سید شاہ قیر محی الدین مقبل مسہوری(۶۶)، سلطان محی الدین سالک: کڑپوی ثم حیدر آبادی(۶۷)، حضرت خواجہ بندہ نواز قدس سرہ(۶۸)، حضرت مخدوم سوائی بیجاپوری(۶۹)، محمد زین العابدین المتخلص بہ دیوان نایطی(۷۰) کے حالات اور شاعری پر مفصل جائزہ تحریر کیا۔

سخاوت مرزا نے کچھ تسامحات کے رد میں بھی مقالات لکھے۔ عرصہ دراز سے محققین کے درمیان بہت سی تصانیف یا شخصیات سے وابستہ مباحث عام تھے۔ فاضل مصنف نے تحقیق سے ردو قبول ثابت کیا جن مقالات میں کچھ کا ذکر ہم ذیل میں کر رہے ہیں۔

> ملا وجہی کی نثری تصنیف "تاج الحقائق" عرصہ دراز سے موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ سخاوت مرزا نے ۱۳۴۲ھ میں رسالہ "النور" حیدر آباد دکن میں اس کتاب کو میراں جی سے منسوب کیا تھا۔ مگر جدید تحقیق کی سے خود ہی اپنی سابقہ تحقیق کو رد کر کے ۱۹۷۱ء میں ایک مقالہ تحریر کیا جس میں مختلف شواہد سے ثابت کیا کہ یہ میراں جی شمس العشاق کی نہیں بلکہ ملا وجہی کی تصنیف ہے۔"(۷۱)

دکنی نثری رسالہ خوان یغما مصنفہ سید شاہ طاہر حموی کرنولی کا ذکر پیشتر آچکا ہے۔ طاہر حموی کے والد کے ایک مرید سید حسین علی شاہ قادر نے دکنی زبان میں "انوار العاشقین"(۷۲) نامی ایک نثری رسالہ لکھا تھا جو کہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ سخاوت مرزا نے اس کے تعارف میں مقالہ لکھا اور کتاب کے مختلف اقتباسات بھی رقم کیے۔ دکنی ادب کے مشہور شاعر مشتاق کے بارے میں یہ قیاس رہا تھا کہ آیا وہ بہمنی دور کا شاعر ہے یا بعد

کا؟ سخاوت مرزانے مختلف داخلی وخارجی شواہد کی مدد سے اپنے مقالے "کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا؟" مشتاق کو مختلف شواہد کی مدد سے وہ مشتاق کو بہمنی دور کا شاعر ثابت کیا۔(۷۳) شمس العشاق میراں جی کی تاریخ وصال بھی ایک عرصے سے ردو تحقیق کا باعث تھی۔ سخاوت مرزانے اس حوالے سے ایک مسبوط مقالہ تحریر کیا۔ (۷۴) دکنی نثر کا رسالہ "صراط مستقیم" بھی ایک عرصے تک وجہی کی تصنیف سمجھا جاتا رہا۔ مگر سخاوت مرزانے اپنے ایک مقالے (۷۵) میں ثابت کیا کہ "صراط مستقیم" کا مصنف ملا وجہی نہیں بلکہ غیر معروف مصنف "خورشاہ" ہے جو قندھار کا رہنے والا تھا۔

سخاوت مرزانے "اردو کی ایک نایاب قلمی بیاض"(۷۶) کے عنوان سے مقالہ میں دکن کے اہم غزل گو شاعر حسن شوقی کی تین غزلیں اور ایک قلمی بیاض تلاش کر کے شائع کرائی۔ دکن کے گمنام شاعر "خروشی معاصر ولی"(۷۷) کے عنوان سے شاعر کے کے تعارف اور نمونہ کلام پر مشتمل مقالہ تحریر کیا۔ "ملک الشعرا غواصی اور اس کا کلام" کے عنوان سے غواصی کا تعارف کلام کا تجزیہ اوراس کی علمی خدمات کے جائزہ پر مشتمل مقالہ تحریر کیا۔(۷۸)

شخصیات اور تصانیف کے علاوہ اصناف ادب پر بھی سخاوت مرزانے بڑی دقیقہ سنجی سے اپنی عالمانہ تحقیق کا مظاہرہ کیا۔ دکنی ادب کی دو قدیم اصناف "مناقب بازی"(۷۹) اور "برہمنی"(۸۰) کے عنوان سے مقالات لکھ کر ان اصناف کا تعارف کرایا جو درحقیقت اب متروک ہو چکی ہیں۔ نہ صرف ان اصناف سخن کا تعارف بلکہ مناقب گو شعرا کا تعارف اور ان کے حالات بھی درج کیے ہیں۔ اسی طرح "برہمنی" میں گیارہویں صدی ہجری سے تیرہویں صدی ہجری تک مختلف شعرا کی "برہنیوں" کے نمونوں کے ساتھ ساتھ ان شعرا کے مختصر حالات بھی مقالے کا حصہ ہیں۔

"ریختہ ثناء گجراتی بزبان ہیکلی"(۸۱) کے عنوان سے مقالہ لکھا جس میں قدیم ریختہ میں ثناء گجراتی کے کلام کے نمونے پیش کیے جو کہ الفاظ کی تکرار سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ہکلی زبان میں رک رک کر شعر پڑھ رہا ہو۔ قدیم اصناف میں سے یہ بھی ایک متروک شدہ صنف سخن ہے۔ جس کا تعارف سخاوت مرزانے کرایا۔ "ترکی زبان اور کائیتھ"(۸۲) کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا جس میں دونوں زبانوں کا تقابل کیا گیا ہے۔

سخاوت مرزانے شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری کے خلیفہ شیخ محمود (خوش دہاں) چشتی کی نظم ونثر کے تعارف کے سلسلے میں ایک مقالہ بعنوان "شیخ محمد چشتی کی نظم ونثر"(۸۳) کے عنوان سے لکھا۔ اس کے علاوہ سخاوت مرزاہی نے "لوری نامہ دائم"(۸۴) کا پہلی مرتبہ تعارف کرایا۔ جس کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں

موجود ہے۔ "لوری نامہ دائم" کے بارے میں فاضل مصنف کا خیال تھا کہ یہ محمود چشتی خوش وہاں کی تصنیف ہے جو غالباً "دائم" تخلص کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے محمود چشتی کے ایک نثری رسالے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کا نام "تنبیہ الخلاق" ہے۔ جس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کا مخزونہ ہے۔ خواجہ حمید الدین شاہد نے اس رسالے کو مرتب کیا تھا۔ مگر وہ بھی اس رسالے کے نام اور انجمن ترقی اردو میں موجود نسخے سے آگاہ نہیں تھے۔ انھوں نے اس رسالے کو کسی نجی نسخے سے مرتب کیا تھا۔

سخاوت مرزا نے شاہ راجو قتال گو لکنڈوی کے حالات اور شاعری پر ایک مفصل مقالہ رقم کیا یہ وہی راجو قتال ہیں جو گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد تھے۔ (۸۵)

مخدوم سوائی بیجاپوری کے حالاتِ زندگی اور ادبی خدمات پر مشتمل مقالہ لکھا جو بعد ازاں کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔

الا اللہ شطاری (۸۷) کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا جس میں اس قدیم شاعر کا تعارف کرایا ہے اور اُسے شاہ کمال الدین بخاری صاحب دیوان "مخزن العرفان" اور شاہ تراب گنج الاسرار کا معاصر بتایا ہے۔ مقالہ کے آخر میں ایک رسالہ بسم اللہ کا تعارف کرایا ہے مقالے میں موصوف کے کلام کے نمونے، لسانی جائزہ کے علاوہ شاہ کمال الدین کے اشعار سے مماثلت بھی شامل مقالہ ہے۔

مرزا حیدر علی گرم لکھنوی (۸۸) صاحب دیوان تھے سخاوت مرزا کو لکھنو کے ایک شاعر کے پاس ان کا دیوان دیکھنے کو ملا۔ مجموعہ نظر میں قدرت اللہ قاسم نے ان کا ذکر تو کیا ہے مگر مختصر دیوان کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے۔ آپ آصف الدولہ والی اولاد کے معاصر تھے۔ آگے چل کر صاحب مقالہ نے ان کے مذہب تلمیذ اور کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

ملک الشعراء غواصی کا نام (۸۹) کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا جو کہ قومی زبان میں شائع ہوا۔ اس سے قبل بھی ایک مقالہ "ملک الشعراء غواصی کا نام" کے نام سے لکھا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس مقالے میں صاحب مقالہ نے غواصی کے نام کی صراحت کی ہے۔

نوائے ادب میں شائع ہونے والے اس مقالہ کا عنوان "مجمع علم وہنر مدراس" (۹۰) ہے۔ یہ مقالہ سر سید احمد خان کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی قیام یہ ۱۸۸۳ء کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مقالہ لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس قسم کے اداروں پر معلوماتی مقالات لکھے گئے جن میں مولوی اکبر الدین صدیقی، مولوی نصیر الدین ہاشمی اور سجن لال کے مقالات شامل تھے۔ انھوں نے کہیں بھی سر سید کی قائم کردہ

اس سوسائٹی کا ذکر نہ کیا تھا جبکہ مدراس کے باقی اداروں کا ذکر موجود تھا۔ لہٰذا سخاوت مرزا نے ضروری سمجھا کہ اس ادارے کی خدمات اور اہمیت پر ایک مقالہ اس رسالے میں لکھا جائے۔ چنانچہ ادارے کی غرض عافیت پر مشتمل یہ مقالہ سپرد قلم کیا جو ندائے ادب میں چھپا۔

"عوارف المعارف" کے قدیم فارسی ترجمے کے نام سے مقالے میں شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف "عوارف المعارف" جس کا ذکر سلسلہ چشت کے بزرگوں کی محافل میں ہوتا تھا۔ لہٰذا فارسی تراجم، عربی وفارسی شرح وتعلیقات کی مختصر تفصیل دی ہے۔

افسر صدیقی امروہوی:

دکنیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے افسر صدیقی امروہوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کی شخصیت کا خصوصی امتیاز تحقیق دکنیات ہے۔ اس کے علاوہ آپ شاعر، مترجم اور مدیر بھی تھے۔ "منظور احمد خلف شیخ شمس الدین، ۳رجب ۱۳۰۴ھ مطابق ۹ دسمبر ۱۸۹۶ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام منظور حسین جبکہ قلمی نام افسر صدیقی ہے۔"(۹۱)

ابتدائی تعلیم دادا سے حاصل کی ان کی وفات کے بعد سید فضل حسین سعید کے زیر تلمذ رہے۔ مگر ان کے انتقال کے بعد سرکاری اسکول سے تعلیم مکمل کی۔ مطالعہ کا خاص شغف شوق تھا جس نے آپ کی تعلیمی استعداد میں نمایاں اضافہ کیا۔

تمام عمر درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ آپ بنیادی طور پر ایک شاعر تھے۔ آپ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ شاعری میں آپ کے اساتذ مضطر ضمیر آبادی اور بعد ازاں شوق لکھنوی سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کی قادر الکلامی مسلم تھی۔ "وہ علم العروض میں بھی کمال دسترس رکھتے تھے جبکہ تاریخ گوئی میں بھی انہیں ید طولیٰ حاصل تھی کسی بھی واقعہ کی ایسی برجستگی کے ساتھ تاریخ نکالتے تھے کہ باید وشاید۔(۹۲)

۳ جنوری ۱۹۲۷ء کو عازم کراچی ہوئے اور کراچی میں میونسپل اردو اسکول میں معلمی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ماہنامہ "تنویر" کا اجرا کراچی سے کیا۔ جون ۱۹۳۹ء میں صوبائی سطح پر انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ آپ نے بلا تعصب زبان کے فروغ کے لیے کام کیا۔

ان کی تصانیف میں ابتدائی کتب شاعرانہ کلام پر مشتمل ہیں جبکہ بعد ازاں انھوں نے تحقیق کی صنف میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یوں تو زبان اردو کی ترویج وفروغ ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہے۔ مگر مولوی

عبد الحق سے قریبی مراسم نے اپنی تحقیق کی طرف مائل کیا۔"۱۹۶۳ء سے افسر صدیقی امروہوی انجمن ترقی اردو کراچی سے بطور محقق وابستہ ہوئے اور اس دوران انھوں نے قابل قدر تحقیق وادبی خدمات انجام دیں۔"[۹۳]

مولوی عبد الحق اور انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستگی کے نتیجے میں انجمن کے کتب خانہ خاص کے مخطوطات کی فہارس، ضروری تفصیلات کے ساتھ تالیف کیں جو چھ جلدوں کی شکل میں انجمن ترقی اردو سے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۵ء تک بتدریج شائع ہوئیں۔

آپ نے ساری زندگی اردو ادب کی خدمت کی۔ تقسیم ہند سے قبل افسر امروہوی کی شناخت ایک شاعر کی حیثیت سے تھی۔ مگر ہجرت کے بعد ہم انہیں مترجم، مدیر اور محقق کے روپ میں دیکھتے ہیں۔

افسر صدیقی امروہوی نے ۹ فروری ۱۹۸۴ء کو کراچی میں وفات پائی اور سخی حسن قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

تصنیف و تالیف:

۱۔برق تخیل	۱۹۲۴ء
۲۔تابش خیال	۱۹۲۹ء
۳۔شہاب تخیل	۱۹۲۹ء
۴۔رباعیات افسر	۱۹۲۴ء
۵۔مصحفی: حیات وکلام	۱۹۷۵ء
۶۔تلامذہ مصحفی	۱۹۷۹ء
۷۔سرمایۂ تغزل	۱۹۸۳ء
۸۔جوزف ولمارٹ (ترجمہ)	

ان تصانیف سے قطع نظر افسر امرہوی نے قدیم ادب کی تحقیق اور بازیافت کے حوالے سے جو کام کیے وہی دراصل پاکستان میں ان کی پہچان بنے۔

i۔نوسرہار از اشرف بیابانی:

یہ قدیم دکنی ادب کا شاہکار مثنوی ہے۔ جو پندرہویں صدی کی زبان وبیان کی عکاس ہے۔ اشرف بیابانی نے اس مثنوی میں حضرت امام حسین کے مصائب کو واقعہ کربلا کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ افسر امرہوی نے اسے ۱۹۸۲ء میں پہلی مرتبہ مرتب کرکے ایک مبسوط اور تحقیقی مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو سے شائع کرایا۔

مثنوی عاقبت بخیر از سید ساجد علی خان فنائی:

اس مثنوی میں ۱۸۱۸ء میں ہونے والی جنگ کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔ جو نواب مظفر علی خان اور راجا رنجیت سنگھ کے درمیان ۱۸۱۸ء میں ملتان پر قبضہ کرنے کے لیے لڑی گئی۔ اس جنگ میں مظفر علی خان نے جام شہادت نوش کیا۔

افسر امروہوی نے اس مثنوی "عاقبت بخیر" کو ۱۹۸۱ء میں مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی نے شائع کیا۔

ii۔ بیاض میراثی:

افسر امروہوی نے ۱۱۷۱ھ کی ایک بیاض سے گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے مراثی جمع کر کے شاعروں کے حوالوں کے ساتھ شائع کیا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں گارہویں صدی ہجری کے بعض ایسے شاعروں کا بھی مختصر تعارف ملتا ہے جن کا کسی اور تذکرے میں ذکر نہیں۔ زبان وبیان کے حوالے سے یہ مثنوی تین سو سال قبل کے لسانی شعور کے ارتقا کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو کراچی سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔

iii۔ نگھاسن بتیسی: از فقیر دکنی:

سنسکرت الاصل داستان "سنگھاسن بتیسی" جس میں بکرجیت کی اعلیٰ صفات کو بیان کرنے کے لیے ایک داستان مرتب کی گئی ہے۔ جو کہ بتیس کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس داستان کی شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے تقریباً چھبیس (۲۶) زبانوں میں تراجم ہوئے ہیں۔ اس داستان کو ایک دکنی شاعر نے جو سراج کے ہم عصر تھے، دکنی زبان میں منظوم کیا۔

افسر امروہوی نے "سنگھاسن بتیسی" کے منظوم نسخے کو مرتب کر کے تفصیلی مقدمے کے ساتھ ۱۹۸۴ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے شائع کیا۔

iv۔ تذکرہ عروس الاذکار از نصیر الدین ہاشمی نقش:

۱۲۸۹ھ کا تصنیف شدہ تذکرہ افسر امروہوی نے مرتب کیا۔ یہ دکنی شعرا کا ایسا تذکرہ ہے جس میں تقریباً ۱۶۹ شعرا کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ بعض قدیم شعرا کے حالات نہ صرف اسی تذکرے میں ملتے ہیں اس لحاظ سے یہ تذکرہ قابل ذکر ہے۔ اس تذکرے کو افسر امروہوی نے ۱۹۷۵ء میں مرتب کیا اور تحقیقی مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوا۔

v۔ خالق باری از منشی اجے چند سکندر آبادی:

فاضل مصنف نے عہد قدیم کی ایک مثنوی "خالق باری" جس کا سن تصنیف ۹۶۰ھ ہے کو "مثل خالق باری" کے نام سے مرتب کیا۔ اس بات پر مولوی عبد الحق اور سخاوت مرزا دونوں متفق ہیں کہ "خالق باری" اردو کی پہلی نصابی کتاب ہے۔ جسے ۱۹۸۳ء میں رسالہ "اردو" کے جولائی کے شمارے میں شائع کیا گیا۔ "خالق باری" کے بارے میں سخاوت مرزا نے ایک مقالہ بھی "خوان یغما دکنی" (۹۴) کے نام سے تحریر کیا تھا۔ جس میں دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ اردو کی پہلی نصابی کتاب ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ "برہان پور" کے شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جو کہ کتابی صورت میں تو طبع نہ ہو سکا البتہ رسالہ "اردو" بالاقساط شائع ہوا۔ (۹۵)

افسر امروہوی کا "نعت" کے موضوع پر مقالہ تحقیقی لحاظ سے اس موضوع پر ایک مفید اضافہ ہے۔ اس مقالے میں جو جولائی ۱۹۶۳ء میں رسالہ "ماہ نو" میں شائع ہوا فاضل محقق نے قدیم دکنی ادب میں موجود نعتوں کا سراغ لگایا ہے۔

vi۔ ڈاکٹر جمیل جالبی:

جمیل جالبی کا شمار ادب اردو کی کثیر الجہات شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ نقاد، محقق، ادبی مورخ، مترجم، لغت نگار، بچوں کے ادیب اور مدیر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

"ڈاکٹر جمیل جالبی کا اصل نام محمد جمیل خان ہے۔ وہ ۱۲ جون ۱۹۲۹ء کو علی گڑھ کے ایک معروف علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔" (۹۶)

آپ کے آبائو اجداد سوات سے ہندوستان منتقل ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ میٹرک سہارن پور رہائی اسکول سے کیا جبکہ انٹر ۱۹۴۵ء میں اور گریجویشن ۱۹۴۷ء میں میرٹھ کالج سے کی۔ بعد ازاں پاکستان ہجرت کرنے کے بعد تعلیمی سلسلے کو جاری رکھا اور ۱۹۴۹ء میں ایم اے انگریزی ۱۹۵۰ئ، ایم اے اردو، ۱۹۵۰ء میں ہی ایل ایل بی سندھ یونیورسٹی جامشورو سے کیا۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ء میں پی ایچ ڈی اور ۱۹۷۶ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

لکھنے لکھانے کا سلسلہ ۱۹۴۱ء سے ہی شروع ہو چکا تھا جب انھوں نے اسکول میں ایک ڈرامہ "سکندر اور ڈاکو" لکھا۔ فیض احمد فیض پر ایک تنقیدی مضمون لکھا جو "نیا دور" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے متعدد مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

ڈاکٹر انور سدید جمیل جالبی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنا ادبی سفر تخلیق نگاری سے شروع نہیں کیا بلکہ ان کے ادب نے اپنی آنکھ تنقید کے گہوارے میں کھولی۔ تنقید نے ہی ان کا اولین تشخص قائم کیا اور تنقید کے ہی داخلی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے مشرق مغرب کے بے شمار مصنفوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کے خیالات، افکار اور تصورات کو ذاتی کسوٹی پر پرکھا۔"(۹۷)

ملازمت کا آغاز بطور ہیڈ ماسٹر بہادر یار جنگ اسکول، کراچی سے کیا۔ ۱۹۵۲ء میں سول سروسز کا امتحان پاس کر کے انکم ٹیکس کے محکمے میں ملازمت اختیار کی جو کہ ۱۹۸۳ء تک جاری رہی۔ اس ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے بعد پوری جانفشانی سے علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اسکول کی ملازمت کے دوران انھوں نے ایک رسالہ "بہادر" جاری کیا جو کہ ان کی صحافتی زندگی کا نقطہ آغاز تھا۔ کچھ عرصہ "پیام مشرق" اور "ساقی" سے وابستہ رہا۔ ۱۹۵۵ء میں "نیا دور" کے نام سے اپنا پرچہ نکالا مگر سرکاری ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے اس پرچہ پر ان کا نام مدیر کی حیثیت سے بھی شائع نہ ہو سکا۔ ۱۹۸۳ء میں انہیں کراچی یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدے کی پیشکش ہوئی جو انھوں نے قبول کر لی اور ۱۹۸۷ء تک اس عہدے پر مامور رہے۔ ۱۹۸۷ء میں فروغ اردو زبان، اسلام آباد میں چیئرمین کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۹۴ء تک یہ خدمت سرانجام دی۔

جمیل جالبی نے اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی میں اعزازی صدر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں، انجمن ترقی اردو کے اعزازی خازن اور متولی رہے اور ادارہ یادگار غالب کی مجلس منتظمہ کے رکن اور بعد میں نائب صدر رہے۔ ایک مصروف اور فعال زندگی گزار کر ۱۸ اپریل ۲۰۱۹ء کو جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

آپ نے اپنی زندگی میں جو علمی و ادبی کارنامے سرانجام دیئے ان کے اعتراف میں انہیں بے شمار اعزازات سے نوازا گیا جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ ۱۹۶۴ء میں دائود ادبی انعام تصنیف (پاکستانی کلچر)

۲۔ ۱۹۷۳ء میں دائود ادبی انعام تصنیف (کدم رائو پدم رائو)

۳۔ ۱۹۷۴ء میں دائود ادبی انعام تصنیف (قدیم اردو کی لغت)

۴۔ ۱۹۷۵ء میں دائود ادبی انعام تصنیف (تاریخ ادب اردو)

۵۔ ۱۹۸۷ء میں یونیورسٹی گولڈ میڈل

۶۔ ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر ایٹ سائنس کی سند

۷۔ ۱۹۸۹ء میں طفیل ادبی انعام

۸۔ ۱۹۹۰ء میں ستارہ امتیاز

۹۔ ۱۹۹۴ء میں ہلال امتیاز

۱۰۔ ۲۰۰۶ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ (تاریخ ادب اردو) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کی جانب سے عطا ہوا۔

۱۱۔ ۲۰۰۹ء میں تیراھواں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ

۱۲۔ ۲۰۱۵ء میں اسٹیٹ آف دی آرٹ ایوار، ساکنان شہر قائد ٹرسٹ کراچی کی جانب سے عطا ہوا۔ (۹۸)

تصانیف:

آپ کثیر التصانیف تھے آپ نے ہمہ جہت موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ مگر دکنی ادب پر آپ کی خدمات اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان کی دکنیات سے متعلق تمام تصانیف اعلیٰ درجے کی تحقیق کی مظہر ہیں۔

۱۔ دیوان حسن شوقی	۱۹۷۱ء انجمن ترقی اردو پاکستان
۲۔ دیوان نصرتی	۱۹۷۲ء قوسین لاہور
۳۔ اردو کی قدیم لغت	۱۹۷۳ء مرکزی اردو بورڈ، لاہور
۴۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	۱۹۷۲ء انجمن ترقی اردو، کراچی
۵۔ ادبی تحقیق	۱۹۹۴ء مجلس ترقی ادب، لاہور
۶۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول)	۱۹۷۵ء مجلس ترقی ادب، لاہور

ان کی دیگر تصانیف میں درج ذیل کتب شامل ہیں:

۱۔ جانور شان	۱۹۵۸ء مکتبہ نیا دور، کراچی
۲۔ ایلیٹ کے مضامین	۱۹۶۰ء اردو اکیڈمی سندھ، کراچی
۳۔ حاجی بغلول	۱۹۶۱ء مشتاق بک ڈپو، کراچی
۴۔ پاکستانی کلچر	۱۹۶۴ء مشتاق بک ڈپو، کراچی
۵۔ تنقید اور تجربہ	۱۹۶۷ء مشتاق بک ڈپو، کراچی
۶۔ ارسطو سے ایلٹ تک	۱۹۷۵ء نیشنل بک فائونڈیشن، کراچی
۷۔ میر تقی میر	۱۹۸۱ء انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۸۔ حیرت ناک کہانیاں ۱۹۸۳ء نیشنل بک فائونڈیشن، کراچی

۹۔ بزم خوش نفساں ۱۹۸۵ء مکتبہ اسلوب، کراچی

۱۰۔ نئی تنقید ۱۹۸۵ء رائل بک کمپنی، کراچی

۱۱۔ ن م راشد ایک مطالعہ ۱۹۸۶ء مکتبہ اسلوب، کراچی

۱۲۔ پاکستانی کلچر ۱۹۸۶ء نیشنل بک فائونڈیشن، اسلام آباد

۱۳۔ The Changing World of Islam ۱۹۸۶ ای سی سی ٹی۔ جامعہ، کراچی

۱۴۔ ادب کلچر اور مسائل ۱۹۸۶ء رائل بک کمپنی، کراچی

۱۵۔ قومی زبان ایک جہتی، نفاذ اور مسائل ۱۹۸۹ء مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۱۶۔ بر صغیر میں اسلامی جدت (ترجمہ) ۱۹۸۹ء ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

۱۷۔ میرا جی: ایک مطالعہ ۱۹۹۰ء سنگ میل پبلی کیشنز

۱۸۔ قلندر بخش، جرات: لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر ۱۹۹۰ء مکتبہ جامع، نئی دہلی

۱۹۔ معاصر ادب ۱۹۹۱ء سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۲۰۔ ادبی تحقیق ۱۹۹۴ء مجلس ترقی ادب، لاہور

۲۱۔ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (ج اول) ۱۹۹۱ء مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۲۲۔ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (ج دوم) ۱۹۹۳ء مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۲۳۔ نہ ہوئی قرولی (بہ اشتراک کامل القادری) ۱۹۹۳ء فیروز سنز، لاہور

۲۴۔ بارہ کہانیاں (بچوں کا ادب) ۲۰۰۴ء رباب پبلشرز، راولپنڈی

حوالہ جات

۱۔مولوی عبدالحق، خطبات گارساں دتاسی (مقدمہ) مشمولہ، مقدمات عبدالحق، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۵ء، ص۷۷۶

۲۔رئیس فاطمہ روشنی، حکیم، محمد سخاوت مرزا(دکنی ادب کا معتبر محقق)،حیدر آباد،۲۰۰۶ء،ص۱۶

۳۔محمد علی اثر،ڈاکٹر،دکنی شاعری، تحقیق وتنقید،حیدر آباد،۱۹۸۸ء،ص۳۵

۴۔سیدہ جعفر، بیسویں صدی میں اردو تحقیق (ہندوستان میں) مشمولہ: پاکستان وہندوستان میں اردو تحقیق وتدوین کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ،۲۰۱۳ء،ادارہ یادگار غالب، کراچی، ص۵۴

۵۔ایضاً،ص۵۶

۶۔شیخ چاند ابن حسین، تتمۂ پھولبن، مضمون، مشمولہ: اردو، قسط اول، اپریل ۱۹۶۸ء، قسط دوم، جولائی ۱۹۶۸ئ، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ص۷

۷۔افسر امروہوی، مثل خالق باری، مضمون، مشمولہ: اردو، قسط اول، جولائی ۱۹۸۳ئ، قسط دوم، اکتوبر ۱۹۸۳ء، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ص۲۸

۸۔سخاوت مرزا،ارشادنامہ،مقالہ،مشمولہ:اردوادب، علی گڑھ،شمارہ۴۰،۱۹۶۱ء

۹۔شفقت رضوی، پروفیسر، مثنوی در معنوی، مضمون، مشمولہ:اردونامہ،اپریل۱۹۷۴ء

۱۰۔محمد اکرم چغتائی، دیوان ولی، مقالہ، مشمولہ:اردو، جنوری۱۹۶۷ء،انجمن ترقی اردو، کراچی، ص۷

۱۱۔معین الدین عقیل، پروفیسر،ولی کا غیر مطبوعہ کلام، مضمون، مشمولہ:اردو،اپریل۱۹۷۶ء

۱۲۔سخاوت مرزا، مثنوی بہارستان عشق، مضمون، مشمولہ:اردو، جنوری۱۹۶۶ء،انجمن ترقی اردو کراچی،پاکستان،ص۴۷

۱۳۔سخاوت مرزا، مثنوی من موہن، مضمون، مشمولہ:اردونامہ،جون۱۹۶۷ء، کراچی،ص۲۵

۱۴۔معین الدین عقیل، پروفیسر،اردو تحقیق،صورتِ حال اور تقاضے،مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۸ء،ص۸۶

۱۵۔سخاوت مرزا،بلوان سنگھ راجا کا نایاب قلمی دیوان، مضمون، مشمولہ:اردونامہ،جنوری۱۹۵۰ء،ج:۲۹،ص۵۳

۱۶۔سخاوت مرزا،خوان یغما دکھنی، مضمون، مشمولہ:اردو، پہلی قسط جنوری۱۹۵۳ء،دوسری قسط اپریل۱۹۵۳ء

۱۷۔ایضاً،مشمولہ:ماہ نو،جولائی / اگست ۱۹۶۳ء

۱۸۔سخاوت مرزا،سب رس میراں جی شمس العشاق یا تاج الحقائق وجہی، مضمون، مشمولہ:اردونامہ،شمارہ۳۸، جنوری۱۹۷۱ء،ص۳۳

۱۹۔ایضاً

۲۰۔ معین الدین عقیل، پروفیسر، اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے، ص ۱۳۶
۲۱۔ سخاوت مرزا، خاور نامہ، سمتی، مضمون، مشمولہ: اردونامہ، دسمبر ۱۹۷۵ء
۲۲۔ سید ہاشمی فرید آبادی، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص ۲۶
۲۳۔ انجمن ترقی اردو کی سالانہ روئداد، یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء تک، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پریس، کراچی، ص ۸
۲۴۔ ایضاً
۲۵۔ معین الدین عقیل، پروفیسر، اردو تحقیق: صورتحال اور تقاضے، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۵۲
۲۶۔ مولوی عبدالحق، قطب مثنوی، مقدمہ، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۱۷
۲۷۔ شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو مولوی عبدالحق، ص ۱۳۹
۲۸۔ ایضاً، ص ۱۴۱
۲۹۔ مولوی عبدالحق، نصرتی، اشاعت دوم، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۰
۳۰۔ شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو، مولوی عبدالحق، ص ۱۳۱
۳۱۔ ڈاکٹر گیان چند، اردو کی تحقیق و تدوین کے معیار کا جائزہ، مضمون: مطبوعہ مشمولہ علی گڑھ، میگزین، ۱۹۷۹ء، ص ۳۱۱
۳۲۔ شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو مولوی عبدالحق، ص ۱۳۴
۳۳۔ ایضاً، ص ۱۵۰
۳۴۔ ایضاً، ص ۱۲۳
۳۵۔ ایضاً، ص ۱۲۳
۳۶۔ ایضاً، ص ۱۲۵
۳۷۔ ایضاً، ص ۱۲۳
۳۸۔ مولوی عبدالحق، مقدمہ: مخزن الشعرا، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۶
۳۹۔ محمد ایوب قادری، ڈاکٹر، سخاوت مرزا، مضمون: مشمولہ سب رس، اپریل ۱۹۸۲ء، ص ۵۱
۴۰۔ رئیس فاطمہ، حکیم، محمد سخاوت مرزا: دکنی ادب کا معتبر محقق، حیدر آباد، دکن، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲
۴۱۔ سخاوت مرزا، تحقیقات الفاظ ہندی غرائب اللغات، (مقالہ)، مطبوعہ: اردو سہ ماہی، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، اپریل ۱۹۷۴ء
۴۲۔ سخاوت مرزا، اردو کی ایک قلمی بیاضی، مقالہ، مطبوعہ اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، اپریل ۱۹۵۴ء
۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ سخاوت مرزا، قدیم دکنی شعرا کے چند نایاب مرثیے، مقالہ، مطبوعہ اردونامہ، جون ۱۹۶۹ء

۴۵۔ سخاوت مرزا، خوان یغما، مقالہ، مطبوعہ: اردو، کراچی، جنوری ۱۹۵۳ء

۴۶۔ سخاوت مرزا، شاہ عبد القادر کرنولی کا ارشاد نامہ، مقالہ، مطبوعہ اردو ادب، ۱۹۶۱ئ، علی گڑھ

۴۷۔ سخاوت مرزا، تذکرہ عروس الاذکار، مقالہ، مشمولہ اردو، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۵۸ء، ص ۱

۴۸۔ رئیس فاطمہ روشنی، حکیم، محمد سخاوت مرزا (دکنی ادب کا ایک معتبر محقق)، مطبوعہ، عائش آفسٹ پرنٹرس، حیدر آباد، دکن، ص ۲۲۲

۴۹۔ سخاوت مرزا، ریختہ قدیم، مولانا بدر الدین جونپوری، مقالہ، مطبوعہ قومی زبان، شماہ ۱۱، ج ۳، اکتوبر ۱۹۸۰ء، ص ۴۴ (اردو ادب، شمارہ ۱، ۱۹۷۰ء، علی گڑھ) (اس مقالے کے یہ دونوں حوالے ہیں دونوں میں چھپا ہے)

۵۰۔ سخاوت مرزا، مثنوی بہارستان عشق، مقالہ، مطبوعہ اردو، جنوری ۱۹۶۶ء

۵۱۔ سخاوت مرزا، مثنوی جامع الحقائق، مقالہ، مطبوعہ: اردونامہ، شمارہ ۳۵، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۵

۵۲۔ سخاوت مرزا، مثنوی من موہن، مقالہ، مطبوعہ: اردونامہ شمارہ ۲۸، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۲

۵۳۔ سخاوت مرزا، مثنوی جگت روپ، مقالہ، مطبوعہ، اردونامہ، شمارہ ۳۲، اپریل تا جون ۱۹۷۰ء، ص ۱۷

۵۴۔ سخاوت مرزا، ایڈورڈ بالفور، مقالہ، مطبوعہ: اردو، شمارہ ۴، ج ۳۳، اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص ۹۲

۵۵۔ سخاوت مرزا، ملک الشعراء غواصی اور اس کا کلام، مقالہ، مطبوعہ قومی زبان، شمارہ ۱، ج ۴۴، جنوری ۱۹۶۹ء

۵۶۔ سخاوت مرزا، رشیمہ (مدارس کی ایک جدید شاعرہ)، مقالہ، مطبوعہ: نوائے وقت، شمارہ ۴، ج ۳، اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۴

۵۷۔ سخاوت مرزا، نصاب الاحتساب عربی کا کاتب غواصی گولکنڈوی، مقالہ، مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین، شمارہ ۱۲۷، جلد ۳۳، نومبر ۱۹۵۶ء، ص ۸۳

۵۸۔ سخاوت مرزا، میر غلام مصطفی، سخن اورنگ آبادی، مقالہ، مطبوعہ: اردونامہ، شمارہ ۳۳، جولائی تا ستمبر (دو اقساط)، ۱۹۶۸ء، ص ۶۱

۵۹۔ سخاوت مرزا، سید شاہ کمال الدین، مقالہ، مطبوعہ: اردونامہ، شمارہ ۱۱۵، ج ۱۹، جولائی ۱۹۳۹ء، ص ۵۵۶

۶۰۔ سخاوت مرزا، ولی محمد عقلان حیدر آبادی (مقالہ) مطبوعہ: اردونامہ، شمارہ ۴۲، اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۱۶

۶۱۔ سخاوت مرزا، والہ موسوی (مقالہ)، مطبوعہ: اردونامہ، شمارہ ۴۰، ستمبر ۱۹۷۱ء، ص ۹۶

۶۲۔ سخاوت مرزا، بیجاپور کے دو گمنام شاعر فاضل خان اور افضل خان بیجاپوری کی دکنی غزلیں (مقالہ) مطبوعہ: اردونامہ، شمارہ ۱۲، اپریل تا جون ۱۹۶۳ء، ص ۴۸

۶۳۔ سخاوت مرزا، ابو المعرفت شاہ زین الدین گنج نشین بیدری، مقالہ، مطبوعہ: نوائے ادب، شمارہ ۴، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۴۱

۶۴۔ سخاوت مرزا، شاہ صدر الدین مسیوری (دکھنی) قدس سرہ، مقالہ، مطبوعہ: نوائے ادب، شمارہ ۳، اپریل تا جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۱۴

۶۵۔ سخاوت مرزا، سید شاہ عبد القادر فی الحال کرنولی، مقالہ، مطبوعہ: اردو نامہ، شمارہ ۳، جلد ۳۸، جولائی ۱۹۵۹ء، ص ۳۶

۶۶۔ سخاوت مرزا، سید شاہ فقیر محی الدین مقبل میسوری، مقالہ، مطبوعہ: نوائے ادب، شمارہ ۱، جلد ۵، جنوری تا اپریل ۱۹۵۴ء، ص ۸

۶۷۔ سخاوت مرزا، سلطان محی الدین سالک کڑپوی ثم حیدر آبادی، مقالہ، مطبوعہ: نوائے ادب، شمارہ ۱۱، اپریل ۱۹۶۰ء، ص ۲۸

۶۸۔ سخاوت مرزا، حضرت خواجہ بندہ نواز قدس سرہ، مقالہ، مطبوعہ: سب رس، شمارہ ۱۱، جلد ۳، اکتوبر ۱۹۸۰ء، ص ۴۴

۶۹۔ سخاوت مرزا، حضرت محمد مخدوم سوائی بیجاپوری قدس سرہ، مقالہ، مطبوعہ، اردو، اپریل ۱۹۴۲ء، ص ۳۶۳

۷۰۔ سخاوت مرزا، محمد زین العابدین المتخلص بہ دیوان نایطی، مقالہ، مطبوعہ ارو، فروری ۱۹۵۹ء

۷۱۔ سخاوت مرزا، سب رس میر اں جی شمس العشاق یا تاج الحقائق وجہی، مقالہ، مطبوعہ: اردو نامہ، شمارہ ۳۸، جنوری ۱۹۷۱ء، ص ۳۳

۷۲۔ سخاوت مرزا، انوار العاشقین، مقالہ، مطبوعہ: اردو نامہ، شمارہ ۴۳، جولائی ۱۹۷۲ء، ص ۲۱

۷۳۔ سخاوت مرزا، کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا؟، مقالہ مطبوعہ: اردو نامہ، جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۱۷۳

۷۴۔ سخاوت مرزا، حضرت میر اں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال، مقالہ، مطبوعہ: اردو نامہ، شمارہ ۳۰، جنوری ۱۹۶۸ء

۷۵۔ سخاوت مرزا، صراط مستقیم کیا وجہی کی تصنیف ہے، مقالہ، مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۴۵

۷۶۔ سخاوت مرزا، قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض، مقالہ، مطبوعہ، اردو نامہ، شمارہ ۴، جلد ۲۹، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ۱۸

۷۷۔ سخاوت مرزا، خروشی معاصر ولی، مقالہ، مطبوعہ: اردو، جنوری، اپریل ۱۹۶۰ء

۷۸۔ سخاوت مرزا، ملک الشعراء غواصی اور اس کا کلام، مقالہ، مطبوعہ قومی زبان، شمار ا، جلد ۳۴، جنوری ۱۹۶۹ء

۷۹۔ سخاوت مرزا، مناقب بازی، مقالہ، مطبوعہ: اردو نامہ، جولائی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۱

۸۰۔ سخاوت مرزا، برھنی، مقالہ، مطبوعہ، اردو نامہ، شمارہ ۳۷، جولائی، ستمبر، ۱۹۷۰ء، ص ۹

۸۱۔ سخاوت مرزا، ریختہ نثار گجراتی بزبان ہیکلی، مقالہ، مطبوعہ: نوائے ادب، شمارہ ۳، ج ۱۳، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۶۶

۸۲۔ سخاوت مرزا، ترکی زبان اور کائیتھ، مقالہ، مطبوعہ اورینٹل کالج، میگزین، شمارہ ۳۸، نومبر ۱۹۶۱ء، ص ۸۱

۸۳۔ سخاوت مرزا، شیخ محمود چشتی کی نظم ونثر، مقالہ، مطبوعہ اردو نامہ، شمارہ ۷، جنوری ۱۹۲۶ء، ص ۱۷

۸۴۔ سخاوت مرزا، لوری نامہ دائم، مقالہ، مطبوعہ، اردو نامہ، مارچ ۱۹۶۲ء

۸۵۔ سخاوت مرزا، شاہ راجو قتال گولکنڈوی، مقالہ مطبوعہ رسالہ اردو، نومبر ۱۹۶۳ء

۸۶۔ سخاوت مرزا، مخدوم سوائی، بیجاپوری، مقالہ، مطبوعہ، اردونامہ، اپریل، ۱۹۴۲ء، ص ۲۲۳

۸۷۔ سخاوت مرزا، الا اللہ شطاری، مقالہ، مطبوعہ، اردونامہ، شمارہ ۵، مارچ ۱۹۷۵ء

۸۸۔ سخاوت مرزا، مرزا حیدر علی گرم لکھنوی، مقالہ، مطبوعہ، اردونامہ، شمارہ ۳۴، جولائی ۱۹۵۵ء

۸۹۔ سخاوت مرزا، مرزا حیدر علی، گرم لکھنوی، مقالہ، مطبوعہ، اردونامہ، شمارہ ۳۴، جولائی ۱۹۵۵ء

۹۰۔ سخاوت مرزا، مجمع علم وہنر مدراس، مقالہ، مطبوعہ رسالہ نوائے ادب، شمارہ ۳، جولائی ۱۹۵۷ء

۹۱۔ ممتاز حسین جعفری، ہمہ جہت شاعر افسر امروہوی، دیباچہ، سرمای تغزل، کراچی ۱۹۸۳ء، ص ۱۰

۹۲۔ ایضاً، ص ۵

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۲

۹۴۔ سخاوت مرزا، خوان یغما دکھنی، مقالہ، مشمولہ: سہ ماہی اردو، جنوری ۱۹۵۳ئ، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی

۹۵۔ افسر امروہوی، تذکرہ شعرائے برہان پور، مشمولہ: سہ ماہی اردو، اپریل ۱۹۷۸ء تا جنوری ۱۹۸۰ء

۹۶۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ، (مرتب)، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۴۸

۹۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید، مضمون، مشمولہ: ڈاکٹر جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، پاکستان رائٹرز کواپرٹیو سوسائٹی، لاہور، ص ۴۷۳

۹۸۔ ایضاً

باب دوم

تحقیق دکنیات میں سخاوت مرزا کا کردار، تجزیاتی مطالعہ

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر بھی ہوتا ہے اور نئے نئے امکانات وانکشافات کے لیے بھی اس کے در ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں مستور ہے۔ کسی امر کی تحقیق میں درستی یا قطعیت کا انحصار موجود معلومات پر منحصر ہوتا ہے، مگر کسی بھی قدم پر نئے انکشافات کے امکان کو بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا۔

اسی طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ محض آئندہ کے امکان پر ان باتوں کو قطعی نہیں مانا جا سکتا جو ایک خاص مدت تک محض قیاس آرائی پر مبنی رہی ہوں۔ ایسی معلومات جب بھی کسی مستند ذریعے سے حاصل ہوں گی جو اصول تحقیق کے مطابق ہوں تو وہ قابل قبول ہوتی ہیں۔ چاہے وہ گزشتہ معلومات کی تکذیب کرتی ہوں ای تصدیق اور یہ ہی ردو قبول سخاوت مرزا کی تحقیق کا خاصا ہے۔

ان ہی نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سخاوت مرزا کی تصانیف میں ان تصانیف کو اہم گردانا گیا جس میں کچھ نئی معلومات متوقع تھیں، یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ سخاوت مرزا کی تصانیف سے زیادہ ان کے مقالات تحقیق لحاظ سے اہم ہیں۔

تحقیق میں سب سے اہم سند مصنف کے اپنے ہاتھ سے لکھے نسخے کی ہوتی ہے جو کہ پرائمری سورس ہوتا ہے جو معلومات خود مصنف اپنے بارے میں دے سکتا ہے وہ کوئی دوسرا نہیں۔ لہٰذا ہم نے سخاوت مرزا کی مطبوعہ کتاب "مخزن اسرار حقیقت" کو مقالے میں جگہ دی ہے اس میں سخاوت مرزا کے خود نوشتہ حالاتِ زندگی اور شجرہ نسب ملتا ہے۔ واضح رہے کہ سخاوت مرزا کے حالات مالک رام کی تذکرہ معاصرین کے علاوہ کہیں نہیں ملتے۔ جہاں بھی اس کا ذکر ہے وہ تذکرہ معاصرین سے ہی ماخوذ ہیں۔

"حدیقہ المرام" (تذکرہ شعرائے مدراس) کی اہمیت دراصل اس کی صنف کے حوالے سے بھی ہے کہ سخاوت مرزا نے یہ تذکرہ عربی سے سلیس دکنی زبان میں ترجمہ کیا۔ یوں ہم ترجمہ کے حوالے سے بھی سخاوت کی تالیف کو دیکھتے ہیں اس کی زبان اس قدر بامحاورہ اور رواں ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ تذکرہ اردو زبان ہی میں تالیف ہوا ہو۔ یہ ترجمہ مصنف کی دکنی ادبیات کے ذیل میں شامل مقالہ کیا گیا ہے۔

اس تذکرے کی اہم بات اس کی تعلیقات بھی ہیں۔ تعلیقات میں ان شعرا کا ذکر ہے جو کسی وجہ سے اس کتاب میں جگہ نہ پا سکے مگر اسی عہد کے تھے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تعلیقات نویسی بذات خود ایک متنوع فن ہے اور یہ فن مختلف علوم غیر معمولی دسترس کا متقاضی ہے۔ تعلیقات نویسی ہی مصنف کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اگر تعلیقات نہ لکھے جائیں تو مدتوں غلطیوں کا شمار علم کے درجے میں ہوتا ہے۔ فارسی میں تعلیقات نویسی عام ہے مگر اردو میں اس کی مثالیں کم کم نظر آتی ہیں۔ مالک رام کی مرتبہ "غبار خاطر" کے تعلیقات اور پروفیسر مختار الدین احمد کی مرتبہ "کربل کتھا" تعلیقات نویسی کی قابل قدر مثالیں ہیں۔

محمود شیرانی کے مقلد ہونے کی حیثیت میں سخاوت مرزا نے کم و بیش ان ہی تحقیقی اصولوں کو اپنایا ہے جو کہ محمود شیرانی کی تحقیق کا خاصا تھے۔

"من لگن" کی تصنیف کے سال کے یقین کے ساتھ ساتھ اس کی شرحات، مصنف کے حالات، مثنوی کے غیر الفہم الفاظ کے معنی و مطالب کا حوالہ تحقیق کے ضمن میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

"دیوان قاسم" کی تدوین کے وقت ان کے پاس چار نسخے تھے جس طرح محمود شیرانی نے "خالق باری" کی تدوین کے وقت متن کے تمام نسخے فراہم کر لینے کے بعد ہر ایک کا مختلف پہلوئوں کا جائزہ لینے کے بعد ایک کو بنیادی نسخہ قرار دیا جو ان کی نظر میں اہم ترین تھا۔ اسی طرح سخاوت مرزا نے بھی دیوان قاسم کے پانچ نسخوں میں سے ایک کو نسخہ الف قرار دے کر باقی کو خصوصیات کی بنا پر بالترتیب نسخہ ب اور نسخہ ج وغیرہ قرار دیا اور بنیادی نسخے سے اختلاف کو حواشی میں درج کر دیا گیا۔

اسی طریق کار میں ایک قباحت یہ ہوتی ہے اکثر نسخہ ب اور نسخہ ج وغیرہ کی وضاحت حواشی میں نہیں ہو پاتی۔ بہر کیف محمود شیرانی، مولوی عبدالحق اور مقلدین میں اس طرز عمل سے ایک غلط فہمی یہ بھی پیدا ہو گئی کہ کسی فن کے متعدد نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کے اختلاف و مماثلات کی نشاندہی ہی تدوین متن ہے۔ جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔

سخاوت مرزا کے پیش نظر "دیوان قاسم" کی تدوین کے وقت تفہیم متن بھی تھا اور اس کے لیے متعلقات کے بارے میں کافی و شافی علم کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض نکات معمولی ہونے کے باوجود اہم ہوتے ہیں جیسے شاہ قاسم علی قاس کے ہم عصروں کا ذکر کرتے ہوئے سخاوت مرزا نے سراج اور سامی کے ساتھ فقیر دکنی کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کا ذکر کسی قابل ذکر تذکرے میں نہیں ملتا۔ یہ وہی فقیر دکنی ہے جس نے سنگھاسن بتیسی کو منظوم کیا

تھا۔ یوں ایک معمولی نکتہ نے اہم معلومات بہم پہنچائیں۔ اسی طرح بعض اوقات ایسے معمولی نکات نتائج کے استخراج پر بھی اثر انداز ہوسکتے ہیں۔

فاضل مصنف نے "دیوان قاسم" کی تدوین میں ان اصولوں کی کماحقہ پاسداری کی ہے مگر تدوین میں مد نظر نسخوں کا تعارف تو رہا ہے۔ مگر بعد ازاں نسخوں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ انھوں نے کس نسخے کو بنیاد بنایا اور کس بنا پر اور کن نسخوں کے ساتھ اختلاف نسخ ظاہر کیے گئے ہیں۔

ہم جب حواشی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں حوالے تو موجود ہیں مگر نسخوں کے مخففات کا پتہ نہیں چلتا جیسے کہ صفحہ نمبر ۲۸ کے حاشیہ نمبر ۸، ۹، ۱۰ کے تحت حواشی میں لکھا ہوا ہے کہ "یہ ن الف ہی ہے نسخہ آصفیہ میں نہیں۔"

اب کہیے پتہ چلے کہ ن الف کون سا ہے اور نسخہ ب کون سا؟

صفحہ نمبر ۴۸ کے حواشی کے نمبر ا میں لکھا ہے کہ "یہ غزل ن الف (کتب خانہ سالار جنگ) میں ہے۔"

قباحت یہ ہے کہ کتب خانہ سالار جنگ کے دو نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اس میں سے کون سا ن الف ہے اور کون سا نسخہ ب؟

اسی طرح صفحہ نمبر ۶۹ کے حواشی میں یوں لکھا ہوا ہے کہ "ن آصفیہ اور ن ب" اگر نسخوں کا تعارف واضح ہوتا تو قاری کے لیے سمجھنا آسان ہو جاتا اور تحقیق بھی زیادہ مستند ہو جاتی۔

بہر حال تحقیق میں بہتری کے امکانات ہمیشہ روشن ہوتے ہیں۔ آئندہ آنے والوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔

الف) من لگن از سید محمود بحری مرتب سخاوت مرزا:

سخاوت مرزا محمود شیرانی ہی کے قبیل کے فرد ہیں جنھوں نے شیرانی کے تحقیقی اصولوں کو اپنا کر تحقیق میں استناد حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سخاوت مرزا کی تحقیق نے اصل ماخذ کی تلاش و بازیافت کے علاوہ مختلف العہد الفاظ کے تلفظ و املا پر بھی نظر کی ہے تا کہ گزشتہ صدیوں کے اہل قلم شعرا و ادبا کے قلم کے خصائص و انشا بھی قاری کے علم میں رہیں اور جہاں تک ممکن ہو سکا انھوں نے اصل ماخذ سے استفادہ کی ہر ممکن سعی کی۔

اکثر قدیم ادب پاروں اور ان کے مصنفین کے حالات پردہ وہ اخفا میں ہیں۔ ان تک رسائی کے لیے سخاوت مرزا نے اصل ماخذ کی داخلی شہادتوں کو سب سے مقدم جانا ہے۔ جیسا کہ محمود شیرانی کا قول ہے کہ کتاب کے بارے میں سب سے زیادہ رہنمائی کتاب کے اندر ہی موجود ہوتی ہیں۔ تو سخاوت مرزا نے اکثر قدیم ادب

پاروں کی اندرونی شہادتوں کو اول اور دیگر خارجی عوامل و شہادتوں کو ثانوی درجہ دیا ہے اور ان کی اس صفت نے ان کے کام کو استناد بخشا ہے۔

فاضل مصنف نئی نئی دریافتوں کے شائق ہونے کی وجہ سے بے شمار ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہے جن پر کسی اور نے کبھی قلم نہیں اٹھایا۔ آپ کے مقالات اور تحاریر نے قدیم ادبی ورثے کی تحقیق و تفہیم کا ذوق پیدا کیا۔ آپ نے خصوصاً دکنی ادب کو مد نظر رکھا۔

تعارف کتاب:

دکنی ادب میں "من لگن" نامی مثنوی ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۷۰۰ء میں لکھی گئی۔ یہ مثنوی مسلسل نہیں ہے بلکہ الگ الگ حصوں پر مشتمل ہے۔ مثنوی کا موضوع تصوف ہے جبکہ مختلف متصوفیانہ مسائل کے بیان اور رموز و اسرار کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفس اور اخلاق کی اصلاح کے مضامین بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر زور نے "من لگن" کا سن تصنیف ۱۱۱۱ھ بتایا ہے جس کی تردید خود محمود بحری کے بیان سے ہوئی ہے۔ مثنوی کے خاتمے میں بحری نے تاریخ تصنیف یوں لکھی ہے:

ہجری تھی یہی کتک برس تھے
باداُپر ایک سو سہس تھے [۱]

بحری کی اس مثنوی نے دکن میں خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس لیے اس کی کئی شرحیں بھی لکھی گئیں۔ بحری کے بعض مدبرین کے اصرار پر "من لگن" کے مضامین فارسی میں بھی لکھے۔ اس فارسی نسخے کا نام "عروس عرفان" ہے۔ عروس عرفان کا سن تصنیف ۱۱۱۶ھ ہے۔

"من لگن" میں عسیر الفہم الفاظ کی کثرت ہے۔ لہٰذا سید شاہ اسمٰعیل بن سید شاہ احمد قادری نے نواب شہلت جنگ بہادر کے ایما سے اس کے تمام مشکل و معلق الفاظ کا حل لکھا ہے جس کا نام "ارت من لگن" رکھا ہے۔" [۲]

"من لگن" میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد معراج کا ذکر ہے۔ اس کے بعد شاعر نے اپنے مرشد کی مدح میں کچھ اشعار شامل کیے۔ عالمگیر (شاہ وقت) کی مداح کے بعد سبب تالیف بیان کیا اور "حکایت روز گار" کے عنوان کے تحت اپنے زمانے کے حالات بیان کیے اور بعد ازاں عرفانِ انسانیت، معرفت، روح، دل، بے خودی، غیر مرئی وجود، اولیائے کرام کی بصیرت اور عشق حقیقی جیسے موضوعات شامل ہیں۔

مثنوی کے اشعار کی تعداد:

مثنوی کے مقدمے میں مثنوی کے اشعار کی تعداد بقول سخاوت مرزا ۱۸۳۰ء ہے۔ جبکہ مولوی سید علی اصغر بلگرامی نے اشعار کی تعداد ۱۸۳۱ بتائی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ سید نے ۱۳۷۹۰ابیات بتائی ہیں جبکہ کہ دیگر نسخہ جات میں بھی اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ "من لگن" کے ۱۳۵۳ھ کے مطبوعہ نسخہ میں اشعار کی تعداد ۱۸۳۵ ہے۔ مگر پانچ اشعار طباعت میں متروک ہو گئے تو اس طرح اشعار کی موجودہ تعداد ۱۸۳۰ ہوئی۔ کتب خانہ آصفیہ کے مکتوبہ ۱۱۲۷ھ کے نسخے میں اشعار کی تعداد ۱۸۲۵ ہے۔ نسخہ جامع عثمانیہ جو کہ سب سے قدیم نسخہ ہے مکتوبہ ۱۱۲۱ھ ہے ۱۴۹۲اشعار پر مشتمل ہے۔ گویا مختلف نسخوں میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ مگر سخاوت مرزا نے جس نسخے کو بنیاد بنایا ہے اس میں اشعار کی تعداد ۱۸۳۰ ہے۔ اس لیے ہم ۱۸۳۰ کا ہی اعتبار کریں گے۔ دراصل "من لگن" کے الفاظ، رسم الخط اور عنوانات میں بے حد اختلاف ہے۔ اس کی ایک وجہ کتابت اور رسم الخط بھی ہے۔

سخاوت مرزا کی رائے میں سب سے درست نسخہ کتب خانہ آصفیہ کا ۱۱۲۷ھ کا مکتوبہ ہے۔

مثنوی کے موضوعات:

قاضی محمود بحری مولف "من لگن" نے مثنوی میں جن مسائل وعقائد سے بحث کی ہے ان میں وحدۃ الوجود، مسئلہ جبر واختیار، مسئلہ ارتقاروح، مرتبہ نور وسر، حقیقت قلب، کمال اسمائی، شغل منتہی، فلسفہ موت کے ساتھ ساتھ اور کچھ اخلاقی اقدار کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں خودداری، جھوٹ سے نفرت، حفظ مراتب، کبر وغرور سے اجتناب اور انصاف کی تعلیم دی ہے۔ کتاب میں جابجا تمثیل سے کام لیا گیا ہے۔

مثنوی من لگن کا اسلوب:

محمود بحری کا زمانہ ۱۰۴۲ھ کے قریب ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ وہ عبوری دور تھا جہاں اردو زبان تبدیلیوں کو جذب کر کے ایک خاص سانچے میں ڈھل رہی تھی یہ وجہ ہے کہ فارسی، ہندی، ترکی اور قدیم سنسکرت کی ملی جلی شکل ہمیں "من لگن" میں ملتی ہے۔ فارسی عربی اقوال کے ترجمے، عربی فارسی تراکیب، فارسی ہندی تراکیب کے علاوہ خالص ہندی تراکیب بھی من لگن میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ عربی فارسی الفاظ کی تراش خراش کے نمونے اور ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایسی زبان ترتیب دی ہے جس کو اس زمانے کے لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔ اگرچہ اردو کی یہ شکل اردوِ معلیٰ اور ولی کے آخری زمانے کی زبان سے مختلف ہے۔ ان کی زبان بیجاپور کی زبان سے متاثر تھی۔ جبکہ بحری کے کلام میں عربی، فارسی اور قدیم سنسکرت کے الفاظ بحری کے کلام میں جابجا ملتے ہیں۔

"بحری کے کلام میں "او"یعنی "و" کو "اُ"، کیوں کو "کیئو" اور آوے جاوے کے لیے حرف ہائے کو حذف کر کے "آوِ"، "جاوِ"، گل لالہ کو "گلال"، بچے کو بچّے لکھا ہے۔ بے رحم کو "بیر حم" لکھا گیا ہے۔ ایک اور لفظ ہے جس کاتبوں نے "کپٹ" لکھا ہے جس کے معنی کچرا یا کثافت کے ہیں۔ مگر سخاوت مرزا لکھتے ہیں کہ یہ لفظ غالباً "کلپت" (کلپ ترو) ہے جس کے معنی درخت کے ہیں۔ اندر کی سرگ کے درختوں میں سے ایک خاص درخت، فاضل مدون کی صوابدید کے مطابق مصنف کی مراد "درخت دوی" سے ہے۔"(۳)

جس زمانے میں اردو ایک عبوری دور سے گزر رہی تھی اور مختلف تراکیب والفاظ اسلوب و محاورہ بن اور بگڑ رہے تھے۔ لفظ نئی نئی شکلیں اختیار کر رہے تھے۔ اس زمانے میں بحری کی یہ مثنوی "من لگن" اس دور کے لحاظ سے جدیدیت کی طرف گامزن ارتقا کی ایک کڑی ہے۔

سخاوت مرزا نے آدھے صفحے پر مثنوی کا متن جبکہ باقی آدھے صفحے پر اس کے الفاظ کے معنی اور ضروری تفصیلات درج کی ہیں۔ جس نے مثنوی کی تفہیم آسان کر دی ہے۔

تشبیہات:

۱۔ من کے نین۔ بصیرت

۲۔ اچپل استری۔ شوخ عورت

۳۔ مدن منی۔ آفتاب جیسی ماہ پارہ

۴۔ سورسی استری۔ آفتاب جیسی ماہ پارہ

۵۔ قدرتی رسالا۔ الہامی کتاب

۶۔ سیندوری ستارا۔ سیندور کا تلک

مثنوی کی تاریخی اہمیت:

"من لگن" ایک قدیم دکن شاعر شیخ محمود بحری کی تصنیف کردہ ہے۔ آپ ولی کے معاصر تھے۔ "من لگن" پہلی مرتبہ مدراس سے ۷۲۔۱۲۷۱ھ مطابق ۳۹۔۱۸۳۸ء میں شائع ہوئی۔ سخاوت مرزا "من لگن" کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

"قدیم دکنی ادبیات میں "ولی کا دیوان" گارساں دتاسی کی کاوشوں سے ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں پیرس سے شائع ہوا جبکہ ہندوستان میں ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ دوسری دکنی تصانیف میں بحری کی من لگن اور وجدی کرنولی کی پنچھی باچھا اہل مدراس نے ولی کے دیوان سے بیس سال قبل ۷۲۔۱۲۷۱ھ مطابق ۲۹۔۱۸۳۸ء میں زینت طبع سے آراستہ کیں۔"(۴)

مثنوی "من لگن" کا موضوع تصوف ہے۔ مگر تاریخ ادب اردو مطبوعہ ۱۹۴۰ئ، ادارہ ادبیات حیدر آباد سے شائع شدہ میں ڈاکٹر زور نے اور گراہم بیلی نے "ہسٹری آف لٹریچر" میں اسے ایک عشقیہ افسانہ بیان کیا ہے جبکہ "شعر الہند" کے مولف عبد السلام ندوی کے مطابق "من لگن کے بعد صوفیانہ شاعری کو زیادہ ترقی ملی" گویا انھوں نے من لگن کو متصوفیانہ کلام گردانا ہے۔

من لگن کی تصنیف کی تاریخ کے حوالے سے سخاوت مرزا نے "من لگن" کی تمہید میں یہ اشعار نقل کیے ہیں

ھجری تو یہ ہی کیتک برس تھے
بارااوپر ایک سو سہس تھے
تب سیس اپس کیا ہے بالا
اس جگ میں یو قدرتی رسالا (۱۱۱۲ھ)(۵)

مختلف قلمی نسخے مختلف سنین میں مکمل ہوئے مگر فاضل مصنف کی تحقیق کے مطابق سب سے درست نسخہ ۱۱۲۷ھ کا کتابت شدہ ہے جو کہ کتب خانہ آصفیہ کا مخزونہ ہے۔

مثنوی "من لگن" کے بارے میں آئینہ معرفت کے مولف کا بیان ہے کہ یہ گائوں کے مکھیا کے ایما پر لکھی گئی تھی غلط ہے۔

مثنوی "من لگن" خلاصتہ السادت سید احمد جانشین حضرت چنداشاہ کی فرمائش واصرار پر لکھی گئی۔

"بہماں ناتوانی کہ زہر مار بیماری زھرہ راآب گردہ و جگر
داخوناب ساختہ رسالہ من لگن بزبان دکنی نوشتم الخ(۶)

مورخین ادب اردو نے محمود بحری کو سکندر عادل شاہ اور عالمگیر کے زمانے کا شاعر بتایا ہے۔ مگر سخاوت مرزا کی تحقیق کے مطابق مختلف قرائن ودلائل سے ۱۰۴۲ھ قرار دی ہے جو کہ سلطان محمد عادل شاہ کا زمانہ تھا۔ محمود بحری کے حالات زندگی قدم قدم پر تحقیق کے متقاضی رہے۔ جس کی وجہ کسی مشہور تذکرے میں ان کا ذکر نہ ہونا ہے۔ لہٰذا داخلی اور ذیلی شہادتوں پر اکتفا کر کے جو نتائج اخذ کیے جاسکتے تھے۔ فاضل مصنف نے وہ کیے۔ مگر تحقیق میں کوئی بات آخری بات نہیں ہوتی۔ بہتری اور تبدیلی کے امکانات ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ خصوصاً اس صورت حال میں جب کہ کسی مستند ذریعے سے تصدیق بھی ممکن نہ ہو۔

بہر حال سخاوت مرزا نے ان کے وطن "گوگی" کے بارے میں بھی یہ رائے قائم کی ہے کہ بعض مورخین کے مطابق بحری دھناسری سے گوگی آئے مگر عروس عرفان میں خود بحری نے اپنے بچپن میں گوگی کے قیام کا ذکر کیا۔

عروس عرفان ہی میں بادشاہ عالمگیر سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح بحری کی تاریخ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ سخاوت مرزا کی تحقیق کے مطابق:

"شوال ۱۱۳۰ھ بمطابق سن ۱۷۱۷ء میں واصل بحق ہوئے۔"(۷)

جبکہ کتاب الاعراس کے مصنف نے تاریخ وصال ۱۱۲۹ھ لکھی ہے، مگر تاریخی قطعہ وفات سے سن ۱۱۳۰ھ کی تصدیق ہوتی ہے۔

بحری باکمال حق آگاہ
شیخ محمود عارف باللہ
بود در عہد بادشاہ زمن
ختم شاہان سکندر عادل شاہ
دستگاھش بہ علم حق بہ چناں
کہ تواں یافت علم ودانش راہ
سیر او در ھوائے عالم قدس
طیر او در ھوائے عشق اللہ
گوش کردم ندائے رحلت او
داخل مجلس رسول اللہ (۸)

سخاوت مرزا کی تحقیق کہتی ہے کہ بحری معاشی اعتبار سے آسودہ حال تھے۔ ان کی تصاینف کی تعداد چار بتائی ہے۔ جس میں ایک مثنوی من لگن، کلیات بحری، بنگاب نامہ اور ایک مختصر مثنوی (افسانہ عشق خود) ہے۔ یہ وہ تصانیف ہیں جو دکنی زبان کی اہم تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ بحری کے دستیاب کلام میں کئی دکنی اور فارسی کی مختصر مثنویاں شامل ہیں۔

لسانی تجزیہ:

سخاوت مرزا ابو اللیث صدیقی کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ بحری کا شمار مابعد شعرائے ولی میں کیا جانا درست نہیں۔ اس لیے کہ بحری کا انداز اور اس کی زبان قدیم ہے۔

"بحری نے "گوگی" میں بیٹھ کر دہلی اور مضافات دہلی کی زبان بھی اپنے اشعار میں استعمال کی اور جمنا کے کنارے عشق کا محل تیار کیا۔"(۹)

بحری نے جو زبان استعمال کی ہے اس میں دہلی کی مروجہ زبان کا اثر واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ بحری اور ولی کے کلام میں موضوعات والفاظ کی مماثلت سے گمان گزرتا ہے کہ ممکن ہے بحری کا کلام ولی کی نظر سے بھی گزرا ہو کیونکہ دونوں کا زمانہ بھی قریب کا ہے۔

بحری نے اپنے کلام میں آونا، جاونا، پاونا، جیسے مصادر اکثر استعمال کیے ہیں جو کہ اس عہد کی دہلی کی مروجہ زبان میں شامل تھے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ پرم کلولے، رنگ رس، بند بند نیارا، اتاولا ناگ، آد مورت، شاد مورت، مانس مورت، نینوں نیندڑی، پٹ پٹاتے لب، لکڑی کے ترنگ، پتھر کی مچھی، دل کی دہلی، جیو کی جمنا، ان پان، لال کاغذ کا سکہ۔ جیسے الفاظ بھی بحری کے کلام میں جابجا نظر آتے ہیں۔

اسم تصفیر:

غریبڑا، چھبیاڑا، نیندڑی، نڈڑا بھی "من لگن" میں استعمال ہوئے ہیں جو کہ اسم مصغر کی شکلیں ہیں۔

اسم تضاد:

۱۔ مر۔ امر
۲۔ بھوگ۔ ابھوگ
۳۔ پنڈت، اپنڈت
۴۔ دھرم۔ ادھرم
۵۔ مول۔ انمول
۶۔ راجہ۔ پرجا
۷۔ روپ۔ اپروپ
۸۔ من۔ ان من (۱۱)

ہندی ترکیبیں:

گیان گھر، گھر گیان، سگھڑ، سلچھن، آڑے گن، تیڑے گن، ان گنت گن، سلونا سنگھار، نوی ریت، ہری راونی، کارن، مھا کارن، شاہ کارن، راج کارن (شہ کار) بالکے وغیرہ ہندی ترکیبوں کی وہ شکلیں ہیں جو "من لگن" میں نظر آتی ہیں۔

عربی، فارسی ترکیبیں:

فقیر لاموت، یوسفی، یعقوبی، ایوبی، صافی خلافی، زلف کافوری، مدار المہام، لک جھک، شہ نہ شطرنج، بازی برد، سلطان نیم روز، خاوند فلک، اصلی فصلی، لوح محفوظ مختصر (انسان)، غیب کی اچھوتی قاب (جسم انسانی)، دودلی، دورنگی، دوراہی وغیرہ۔

ہندی، فارسی تراکیب:

نعت نگر، نظر نگر، گت کار، جنتر کار، ناز کا پلو، محشر نمن، پرواز کا پلو، سر انداز کا پلو، سرے نمن، نظر کا تاگا، دیکھ کا دوا (چراغ نظر)، مان منصوری، گیان عطاری، یار کی چوری، ان گندے پھولوں، صدف کے چور وغیرہ۔ بعض الفاظ کی تراکیب سے نئے نئے معنی اخذ کیے جن کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ پون ٹکورا۔ ضرب سبک، مہمیز کرنا
۲۔ پنڈ پنج بھوتی۔ جسم عنصری، فانی جسم
۳۔ پنت پاجیانہ۔ کج روش، سیدھی راہ سے بھٹکنا
۴۔ دشٹ پلیٹ۔ بازگشت نظر، نظر کا پلٹ آنا
۵۔ یک دایرہ دو کمانا۔ قاب و قوسین
۶۔ جگت پال۔ رب العالمین
۷۔ جگ اجال۔ نور السموات والارض
۸۔ پر نگر۔ پردیس
۹۔ مٹھی بھر۔ خروار
۱۰۔ مٹھی روز۔ چند روز
۱۱۔ موجیاں۔ فنا وبقا وغیرہ [۱۲]

اس کے علاوہ بعض ایسے الفاظ بھی مثنوی میں استعمال ہوئے ہیں جو خالصتاً ہندوستانی زبان کے الفاظ ہیں جیسے:

ہیچھو، لتاڑنا، لاوتے، جاوتے، کھاوتے، پیوتے، اندھیارا، دکھیا، نگوڑے، نگوڑی، اتاولا، بھیتر۔

مثنوی "من لگن" کے دستیاب نسخے:

سخاوت مرزانے "من لگن" کے مرتب کرنے جن نسخہ جات سے مدد لی گئی ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ یہ مکتوبہ غالباً ۱۱۲۱ھ میں غلام احمد ولد غلام محمد حسین نے لکھا جو کہ اب جامعہ عثمانیہ کتب خانے میں موجود ہے۔ اس مکتوبہ نسخہ کو نسخ اور نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اوراق کی تعداد ۵۹ ہے۔

۲۔ من لگن کا دوسرا نسخہ کاتب غلام حسین نے ۱۶ ربیع الثانی، ۱۱۲۷ھ کو کپل ضلع رائچوڑ میں لکھا جو کہ اب کتب خانہ آصفیہ میں مخطوطہ نمبر ۱۵۸۳ پر موجود ہے۔ یہ خط نسخ میں لکھا گیا ہے۔ سطور کی تعداد ۱۶۰۳، جبکہ اوراق کی تعداد ۶۰ ہے۔

۳۔ "من لگن" کا یہ نسخہ ۱۴ رجب ۱۱۵۱ء (۲۰ جلوس محمد شاہ) کو لکھا گیا، کاتب کا نام اور مقام کتابت ندارد۔ کتب خانہ آصفیہ میں (۱۵۸) پر موجود ہے۔ خط نستعلیق میں لکھا گیا معمولی بادامی کاغذ استعمال ہوا ہے۔

۴۔ من لگن، کا یہ نسخہ ۱۱۹۰ھ قادر محی الدین کا مکتوبہ ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود خط نسخ میں ۲۸ اوراق پر مشتمل ہے۔

۵۔ من لگن، کا یہ نسخہ، کاتب محمد مرتضیٰ نے ۱۲۲۳ھ میں مدراس میں قلم بند کیا جو اب جامعہ عثمانیہ کا مخزونہ ہے۔ خط نستعلیق میں ۱۳، ۱۳ لائنوں کے صفحات میں ۷۱ اوراق پر مشتمل ہے۔

۶۔ من لگن کا یہ نسخہ مولوی خلیل اللہ کا مملوکہ تھا جو کہ ۱۲۴۵ھ میں لکھا گیا۔

۷۔ من لگن کا نسخہ، ۱۲۵۲ھ کا تحریر شدہ، خط نسخ میں، ناعطی حیدر آباد، پٹنہ لائبریری میں موجود ہے۔

۸۔ من لگن معہ بنگاب نامہ کاتب اللہ بادشاہ کتب خانہ آصفیہ (۶۶۶) ناقص حالت۔

۹۔ من لگن کا نواں نسخہ غالب علی شاہ کا مکتوبہ ۱۲۵۵ھ کتب خانہ سالار جنگ کا مخزونہ ہے۔ اس کا ذکر مولوی نصیر الدین ہاشمی کی فہرست مخطوطات میں موجود ہے۔

۱۰۔ من لگن کا یہ نسخہ ۱۲۶۵ھ میں شیخ احمد عرف محمد صاحب نے لکھا۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس نسخہ میں پہلی مرتبہ فرہنگ بھی شامل ہے۔ کتب خانہ آصفیہ کا مخزونہ مخطوطہ نمبر ۱۳۷۳، خط نسخ میں تحریر شدہ ہے۔

۱۱۔ ۱۲۷۲ھ سید احمد حسینی نے بمقام گوگی تحریر کیا جو کہ خط نسخ میں معمولی کاغذ پر تحریر شدہ ہے۔ ابو محمد عمر یافعی، حیدر آباد دکن کا مملوکہ تھا۔

۱۲۔ ۱۲۷۹ھ میں کاتب حسن صاحب نے حیدر آباد دکن میں تحریر کیا جو اب کتب خانہ سالار جنگ کا مخزونہ ہے۔

۱۳۔۱۲۹۹ھ کا تحریر شدہ "من لگن" کا مخطوطہ، کاتب کا نام اسد اللہ حسینی مدیر حضرت وطن حیدر آبادی، نے خط نسخ میں تحریر کیا۔ پندرہ پندرہ سطور پر مشتمل اوراق کی تعداد کل ۶۳ ہے۔ یہ نسخہ جامعہ عثمانیہ کا مخزونہ ہے۔

۱۴۔ "من لگن" کا یہ نسخہ نواب امین جنگ (حیدر آبادی) کے والد کا مملوکہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق بوقت تقسیم ترکہ ایک فرزند کو ایک لاکھ اور نواب امین کو صرف "من لگن" عطا کی جس سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نسخہ حبیب گنج علی گڑھ میں محفوظ تھا۔

۱۵۔ ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد، دکن میں موجود نسخہ من لگن، جو کہ پندرہ پندرہ سطور پر مشتمل ۶۱ اوراق کا مجموعہ ہے۔

۱۶۔ کتب خانہ آصفیہ مخطوطہ نمبر ۸۸۰

۱۷۔ من لگن کا ایک نسخہ سخاوت مرزا کو آل انڈیا اردو کانگریس اجلاس جو کہ حیدر آباد دکن میں منعقد ہوا میں سدرشن کو ہیری جو بیدر سے تعلق رکھتے تھے کے پاس پایا۔

"من لگن" کی تمہید میں سخاوت مرزا نے مطبوعہ نسخوں کا جو حوالہ دیا ہے وہ درج ذیل ہے:

نسخہ جات "من لگن" مطبوعہ مدراس:

۱۔ ۱۲۷۲ھ مطبوعہ عظیم الاخبار

۲۔ طبع دوم ۱۲۷۸ھ

۳۔ طبع سوم ۱۳۱۰ھ

۴۔ ۱۳۵۳ھ مرتبہ سید عبد الغفار حسینی مسکین مطبوعہ محمدی مدراس

نسخہ جات "من لگن" مطبوعہ بنگلور:

۵۔ ۱۲۹۸ھ

۶۔ ۱۳۱۰ھ

۷۔ ۱۳۲۹ھ مطبع شوکت الاسلام۔ ۱۳۳۵ھ (کتب خانہ شاد مہاراجہ کشن پرشاد بہادر)

۸۔ حیدر آباد ۱۳۲۸ھ تا ۱۳۲۹ھ معہ ترجمہ مولوی معصوم علی خان مدرس شاہ پور مطبع عزیز دکن حیدر آباد۔

فرہنگ من لگن:

الموسوم بدارت من لگن، مرتبہ سید شاہ اسمٰعیل ورنگلی، بایما نواب شہامت جنگ بہادر، (نواب آرکاٹ)

"من لگن" کی شرحیں:

ا۔ "من لگن" کی قابل ذکر شرح مرتبہ سید عبد الغفار حسینی مسکین کی تھی جو انھوں نے ۱۳۱۶ھ میں مرتب کی تھی۔ اس کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ مصنف کا تعارف اتنا ہی ہے کہ مسکین، غلام محی الدین دہلوی کے خلیفہ اور مولوی عبد الحی واعظ بنگلوری کے پیر بھائی تھے۔ شاہ عالم گجراتی کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۳۳۲ھ میں وفات پائی اور مدراس میں ان کا مقبرہ ہے۔

۲۔ شرح "من لگن"، مرتبہ مولانا شاہ حسین محرم بنیرہ شاہ حسین محرم نیلوری المتوفی۔ ۱۲۵۰ھ

"محرم مدراس کے مشہور ادیب وشاعر عبد الرحمن شاطر (۱۲) کے مرشد تھے۔ آپ ۱۹۰۴ء تک بقید حیات تھے۔"

شوح "من لگن" کے اس نسخے میں شارح کا نام کہیں نہیں ملتا۔ مگر اردو میں من لگن کی یہ بہترین شرح ہے۔

۳۔ شرح "من لگن" مرتبہ مولوی غلام جعفر مرحوم حیدر آبادی جو مشہور ستار نواز تھے۔ قلمی نسخہ جو علامہ قاسم علی بیگ اختگر حیدر آبادی کا مملوکہ تھا۔

ان تمام قابل ذکر ماخذات کے ساتھ ساتھ "بنگاب نامہ بحری" اور "کلیات بحری" کے مختلف نسخوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ عروس عرفان کے بعض قلمی اور مطبوعہ نسخے اور فارسی مکتوبات اور متفرق منثویات کے علاوہ نسل ناموں سے بھی مدد لی گئی۔ اس درجہ عرق ریزی مصنف کے وسیع علم اور گہرے تنقیدی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ب) مخزن اسرار حقیقت از سخاوت مرزا:

زیر تبصرہ کتاب کا مکمل نام مخزن اسرار حقیقت "مختصر حالات وملفوظات، قدوۃ المحققین حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی المعروف مچھلی والے شاہ صاحب قدس سرہ وخلفائے حضرت ممدوح" ہے۔ اس کتاب میں حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی کے احوال وآثار، تعلیمات، ملفوظات کے علاوہ خلفا اور ان کے مختصر حالات، تصانیف وتعلیمات وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ جسے ابو رضا محمد سخاوت مرزا قادری نے ۱۳۷۵ھ۔ ۱۳۸۴ھ میں تالیف کیا اور ایجوکیشنل پریس کراچی سے شائع ہوئی۔

شاہ کمال اللہ حیدر آبادی ایک واسطہ سے سخاوت مرزا کے پیر طریقیت بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خلفا اور تعلیمات و تصانیف پر فاضل مصنف کی گہری نظر تھی۔ شاہ کمال اللہ کی وفات کے تقریباً چونیتس سال بعد آپ نے ان کی زندگی پر اس تصنیف کی شکل میں قلم اٹھایا۔ کتاب کے دیباچہ میں مولف خود فرماتے ہیں کہ:

"مولف کو بھی حضرت ممدوح سے ارادت حاصل تھی۔ خیال ہوا کہ کچھ حالات جو خود حضرت کی زبانی سُنے اور بعض خاندانی حالات آپ کے برادر زادہ... کی زبانی معلوم ہوئے۔ ان کو قلم بند کر کے ہدیۂ ناظرین کیے جائیں، تاکہ یہ محفوظ ہو جائیں۔"[۱۳]

لہٰذا کتاب متذکرہ میں اول باب حضرت ممدوح کے حالات (پیدائش، سلسلہ طریقیت، معاصر اولیا، وصال، ازدواج، خلفا اور تعلیمات) پر مشتمل ہے۔ جبکہ باب دوم میں بعنوان "حالات خلفاء حضرت شاہ کمال اللہ کے ذیل میں ان کے خلفا و مریدین کے مختصر حالات، نیز ان کے خلفاء کی تصانیف و تعلیمات کا احوال پیش کیا گیا ہے۔ جن میں مولف سخاوت مرزا بھی شامل ہیں۔ لہٰذا سخاوت مرزا کا خود نوشتہ احوال زندگی درج ہے۔ (واضح رہے سخاوت مرزا کا احوال مالک رام کی "تذکرہ المعاصرین" اور ایوب قادری کے ایک مضمون مشمولہ قومی زبان کے علاوہ کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا) اس لحاظ سے زیر تبصرہ کتاب "مخزن اسرار حقیقت" تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ اس کتاب میں سلسلہ چشتیہ کے شجرات خلافت حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی بعنوان "شجرہ چشتیہ نظامیہ بندہ نواز قدس سرہ، اسرار ہم" شامل ہے۔ اسی ذیل میں شجرہ قادریہ کمالیہ، شجرہ طریقیت طبقاتیہ کمالیہ، طریقہ سہر دردیہ کمالیہ اور سلسلہ قادیہ امامیہ مجددیہ کمالیہ بھی شامل ہیں۔ آخر میں کتابیات کی فہرست ہے اور ضمیمہ میں مولانا محمد حسین کا شجرہ بھی شامل ہے۔ جو شاہ کمال اللہ حیدر آبادی کے خلیفہ تھے۔ بعد ازاں سخاوت مرزا کی ایک تصویر اور "شجرہ نسب خاندان محمد سخاوت مرزا" بھی شامل ہے۔ جس میں سخاوت مرزا کے اجداد و اخفاء کا مکمل حوالہ موجود ہے۔ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اگرچہ عارف باللہ حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی کے احوال و آثار پر مبنی ہے۔ مگر بعض ایسے حضرات کا ذکر بھی ذیل طور پر ملتا ہے۔ جن کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ البتہ حوالے موجود ہیں۔ اسی لحاظ سے یہ تصنیف ایک اچھا ماخذ اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

سخاوت مرزا بھی حضرت شاہ کمال اللہ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ لہٰذا سخاوت مرزا کا خود نوشتہ احوال اور شجرہ بھی کتاب کا حصہ ہے۔ (واضح رہے سخاوت مرزا مالک رام کی "تذکرہ المعاصرین" اور ایوب قادری کے ایک مضمون مشمولہ قومی زبان کے علاوہ کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔) اس لحاظ سے زیر تبصرہ کتاب "مخزن

اسرار حقیقت" تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ اس کتاب میں سلسلہ چشتیہ کے شجرات خلافت حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی بعنوان "شجرہ چشتیہ نظامیہ بندہ نواز قدس سرہ" شامل ہے۔ اسی ذیل میں شجرہ قادریہ کمالیہ، شجرہ طیقیت طبقاتیہ کمالیہ، طریقہ سہروردیہ کمالیہ اور سلسلہ قادریہ امامیہ مجددیہ کمالیہ بھی شامل ہیں۔ آخر میں کتابیات کی فہرست میں ہے اور ضمیمہ میں مولانا محمد حسین کا شجرہ بھی شامل ہے جو شاہ کمال اللہ حیدر آبادی کے خلیفہ تھے۔ بعد ازاں سخاوت مرزا کی ایک تصویر اور "شجرہ نسب خاندان محمد سخاوت مرزا" بھی شامل ہے۔ جس میں سخاوت مرزا کے اجداد و احفاد کا مکمل حوالہ موجود ہے۔ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اگرچہ عارف باللہ، حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی کے احوال و آثار پر مبنی ہے۔ مگر بعض ایسے حضرات کا ذکر بھی ذیلی طور پر ملتا ہے جن کا ذکر اور کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ البتہ حوالے موجود ہیں اس لحاظ سے یہ تصنیف ایک اچھا ماخذ ہے اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

"مخزن اسرار حقیقت" کے مولف سخاوت مرزا ہیں۔ اس تصنیف میں فاضل مصنف نے حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی المعروف مچھلی والے شاہ صاحب کی حیات و کارناموں پر بالاستعیاب نظر کی ہے۔

تعارف بہ سلسلہ طریقیت:

حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی، حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز بندہ نواز کے سلسلہ طریقیت سے وابستہ تھے۔ حضرت گیسو دراز کا اصول صحیح تعلیم تصوف تھا۔ جس کو صوفیائے اہل دکن تال صحیح سے موسوم کرتے ہیں۔ آپ کا فیضان بلواسطہ اور بلاواسطہ (خلفا کے ذریعے) آج بھی جاری ہے۔ خصوصاً آپ کے خلیفہ حضرت جمال الدین مغربی اور ان کے خلیفہ سید شاہ کمال الدین بیابانی اور ان کے خلیفہ حضرت امیر الدین میراں جی شمس العشاق اور ان کے فرزند ارجمند حضرت شاہ برہان الدین جانم اور ان کے خلفاء مابعد حضرت حاجی اسحق چشتی، راج محمد چشتی اور شیخ محمود چشتی نے اسلامی تصوف کی ترویج کے لیے بے پناہ خدمات انجام دیں۔

مخزن اسرار حقیقت:

راج محمد چشتی کا سلسلہ حضرت دریا محمد چشتی کے وسیلے سے ناصر الدین بیجاپوری اور حضرت مخدوم ساوی بیجاپوری تک پہنچا ہے۔ آپ تصوف اسلامی کے مجدد مانے جاتے تھے۔ آپ کے تابعین میں سید ابوالحسن قربی اور ان کی اولاد میں حضرت شیخ عبد الطیف غلام محی الدین المعروف قطب ویلوری تھے۔

سید شاہ کمال الدین کی تصانیف میں دیوان "مخزن العرفان" اور "کلیات" شامل ہیں۔ آپ شاہ مہدی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت سید محمد شاہ میر (رائچوٹی) کے بھائی اور خلیفہ تھے۔ آپ کی اولاد میں حضرت

شاہ اکمل، سید علی مراد شاہ افضل اور شاہ مقبل مسموری جیسے جید علماء شامل تھے۔ سید شاہ کمال الدین کا فیض حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی تک پہنچا اور یہ فیض نہ صرف دکن بلکہ شمالی ہند تک کو اپنی ضیاپاشیوں سے منور کرتا رہا۔

مختصر یہ کہ آپ مشاہیر دکن میں سے تھے۔ آپ بڑے عارف اور محقق کامل تھے۔ جن کے وصال کے تقریباً چونتیس سال عبد سخاوت مرزا نے ان کے حالات ۱۳۸۴ھ میں قلم بند کیے۔

سخاوت مرزا کی تحقیق کے مطابق

"اسم گرامی محمد مجال الدین خان، لقب کمال اللہ شاہ عرف مچھلی والے تھے۔"(۱۴)

ان کے والد محی الدین خان سریرپگٹن (مسیور) سے ایک صدی قبل سکندر آباد (دکن) میں وارد ہوئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ آبائی پیشہ تجارت تھا۔ غلہ اور چمڑے کے علاوہ خشک مچھلی کی تجارت کیا کرتے تھے۔ اس لیے مچھلی والے شاہ صاحب کے نام سے مشہور ہو گئے۔

آپ کے والد کی خواہش تھی کہ میرے گھر ایک ایسا لڑکا پیدا ہو جو فقیر کامل اور عارف باللہ ہو۔ والد کی دعا مقبول ہوئی اور ۱۲۸۰ھ میں شاہ کمال اللہ پیدا ہوئے۔ والدین کے زیر عاطفت پرورش ہوئی اور آگے چل کے عارف باللہ ہوئے۔ علماء نے آپ کو ایک محقق اور عارف کامل مانا ہے۔ آپ علم ظاہری کے ساتھ ساتھ علم باطنی کے بھی حامل تھے۔

" آپ کے مرشد طریقیت سید سلطان محمد اللہ عرف شاہ جی ابن سید جعفر حسینی ساکنی سکندر آباد خلیفہ شاہ برہان الدین حقانی قدس سرۃ تھے۔"(۱۵)

سخاوت مرزا خود بھی شاہ کمال اللہ حیدر آبادی سے بیعت تھے۔ آپ کو شاعری سے کچھ خاص شغف نہ تھا۔ مگر طبیعت موزوں ہوتی تو کبھی کبھی فی البدیہ متصوفیانہ غزلیں کہتے جو پر مغز ہوا کرتی تھیں جن میں عروض و قواعد کی پابندی نہ ہونے کے باوجود پر اثر ہوتی تھیں۔

لکھتے ہیں ارزاں دُرِ عرفان بہ دوکانِ کمال
مول لو اے غافلوں جلدی، گراں ہونے کو ہے

اسرار و معارف کے حوالے سے کہتے کہ یہ زمانہ اس کا متقاضی ہے کہ دنیا دہریت اور الحاد کی طرف جا رہی ہے۔ آج کل وحدۃ الوجود کے مختلف مکاتیب یورپ میں بھی موجود ہیں۔ درست رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ ہر زمانے میں صوفیا کے معارف و اسرار پر علمائے ظاہر کی اختراپردازیوں کا بڑا اثر رہا ہے۔ آپ کی شخصیت بڑی عجیب تھی جب بولنے بیٹھتے تو معرفت کے دریا بہا دیتے۔ دکنی زبان میں رانی بسم اللہ بیگم کی فرمائش پر شعر کہا:

کسے نار ہی میں جلائے تو، کسے نور ہی میں چلائے تو
کیا اوس کو جیسی تھی اقتفا، تری شان جل جلالہ (۱۶)

آپ کا وصال ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ بروز پنج شبہ کو ہوا۔ آپ کو خلفا و مریدین مولانا محمد حسین ناظم، مولانا غوثی شاہ اور مولوی محمد الیاس برنی نے تجہیز و تکفین کی حیدر آباد کے خوش نویس مولانا حشمت علی افسر نے قطعہ تاریخ وصال کیا:

بلبل گلزار وحدت، طوطی عرفاں بیان
واقف سر حقیقت، سالکاں را خضرِ راہ
چوں بحق پیوست، افسر مصرع تاریخ گفت
آں مقدس واصل رب شد کمال اللہ شاہ (۱۷)

آپ کی تعلیمات قال صحیح پر مبنی تھیں جس کے خاص اصول و نظریات تھے۔ آپ کی تعلیمات کی تفصیل ان کے خلیفہ شاہ بالمین نے اپنے رسالے "اشارات توحیدی" میں درج فرمائی ہے۔ شاہ کمال اول کی تصنیف "کلمات کمالیہ" اور سید محمد شاہ میر کی تصنیف "انتباہ الطالبین" میں تفصیل سے درج ہیں۔

خلفاء:

خلفاء میں مولانا میر احمد حسینی المعروف بہ شاہ المین، مولانا غوثی شاہ، سید شاہ عبد اللہ حسینی کڑیوی، مولانا سید برکات احمد ٹونکی قابل ذکر ہیں۔

مولانا سید حسین المشہور صوفی صاحب، مولانا شاہ محمد حسین المعروف بہ ناظم صاحب حیدر آبادی، اسرار و معارف کے بیان پر ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولانا محمد حسین کے مقام و بیان کا اندازہ اس ایک جملے سے لگائیے کہ:

"ایک انسان لا الہ الا اللہ کا اقرار کر کے ایک سکنڈ میں کفر سے نکل کر دائرہ اسلام میں آجاتا ہے، اور ایک مسلمان "اِن اللہ معنًا" کا استعضار کر کے ایک سکنڈ میں مرتبہ احسان کو پہنچ جاتا ہے۔"(۱۸)

آپ کو خلفاء میں مولانا غوثی شاہ صاحب تصانیف تھے جن کی تصانیف میں کنز مکتوم میں شرح مثنوی مولانا آدم کے چند اجزا (۲) نور النور (۳) معیت آلہ (۴) کلمہ طیبہ (۵) مقصد بیعت (۶) رسالہ انفاقی (۷) طیباتِ غوثی (مجموعہ کلام) مولانا زین العابدین، کمال اللہ شاہ کے خلفاء میں شامل تھے۔ آپ جاگیر دار ہونے کے باوجود آپ ایک کامل درویش تھے۔

محمد سخاوت مرزا "مخزن اسرار حقیقت" میں اپنے روحانی تلمند کا ذکر کرتے ہیں اور اسی ضمن میں اپنے پیر طریقیت "حضرت شاہ کماللہ حیدر آبادی المعروف مچھلی والے شاہ صاحب قدم سرہ" کے مختصر تعارف اور تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کے خاص مریدین کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کی تعداد چار ہے۔ اس میں تیسرے نمبر پر سخاوت مرزا نے بحیثیت مرید شاہ کمال اللہ اپنا مکمل احوال لکھا ہے اور ہمارے مقالے کی رو سے یہ ہی اس تصنیف کا اختصاص ہے کہ اس میں فاضل مصنف نے اپنے احوال کے علاوہ اپنا شجرہ نسب بھی خود تحریر کیا ہے۔ یہاں ہم بعینہ نقل کرتے ہیں۔

"محمد سخاوت مرزا قوم مغل ترکمان، اہل سنت والجماعت، حنفی المذہب، وطن آبائی اکبر آباد (آگرہ) میرے والد ماجد محمد آغا مرزا صاحب مرحوم بلدیہ حیدر آباد دکن کے محاسب تھے، بڑے ملنسار، خوش اخلاق اور متقی تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، ڈاکٹر حامد علی، مرزا واجد بیگ برادر سرور جنگ کے ملنے والوں میں تھے اور مولانا عبد الباری فرنگی محل کے مرید تھے۔ میرے جد امجد منشی مرزا امیر بیگ اکبر آبادی آگرہ کے سربر آور لوگوں میں تھے اور حضرت میر علی شاہ اکبر آبادی سے بیعت تھے۔

یہ ناچیز ۱۸۹۷ء میں بمقام حیدر آباد دکن پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے، ایل ایل بی علی الترتیب ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۹ء میں کامیاب کیا۔ سر رشتہ دار عدالت میں منظم تھا۔ ۱۹۵۱ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوا۔

نوجوانی میں بوجہ علالت مزاج سلسلہ تعلیم جاری نہ رہ سکا۔ پریشان تھا ایک روز اپنے ایک دوست مولوی عبد المجید (مرحوم) کے ذریعے حضرت قبلہ کمال اللہ شاہ صاحب قدس سرہ کی قدم بوسی حاصل ہوئی۔ اس سے قبل حضرت شاہ بدیع الدین قطب المدار کو عالم رویا میں دیکھا تھا جس کا حضرت ممدوح سے ذکر کیا، تو آپ متاثر ہوئے ارشاد ہوا کہ تم میرے پاس آیا کرو۔ آپ ہمارے محلے ہی میں فردکش تھے۔ غرض حضرت کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ آپ نے علم باطنی سے بہرہ اندوز فرمایا۔ اس کے بعد تقریباً ۱۳۳۵ھ میں بیعت سے بھی مشرف ہوا۔ حضرت قبلہ نے اپنے سلسلہ کے بزرگوں کی کتابیں، اساس المعرفت شرح عقائد جامی وغیرہ بھی لفظاً لفظاً پڑھائیں جس سے مزید بصریت حاصل ہوگئی۔ کوئی پندرہ بیس سال آپ کی صحبت فیض درجت میں رہا۔ حضرت قبلہ قدس سرہ کے وصال شریف کے بعد اختر کے روابط آپ کے خلیفہ حضرت امیر احمد حسین المعروف بہ بالیمین سے رہے۔ جو مجھ پر خاص شفقت فرمایا کرتے تھے۔

بعض اذکار بھی تلقین فرمائے تھے۔ مخدومی مرزا نظام شاہ لبیب، مولانا شاہ عبد الغفار خان، دامچندر جی، ڈاکٹر میر ولی الدین، مولانا مخدوم پیر مفتی جامعہ نظامیہ اور مولانا صبغتہ اللہ سے بھی مخلصانہ تعلقات رہے اور اب آخری منزل میں ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے۔ بعض اچھے خواب بھی دیکھے ۱۹۴۵ء سے قبل ایک مرتبہ حضرت نبی کریمؐ کو خواب میں طفل شیر خوارگی کی صورت میں گہوارہ میں دیکھا تھا، اور میری زبان پر درود شریف جاری تھا اور صبح میں ایک عربی مصرعہ جاری تھا۔ "طلع البدر علینا۔" ایک مرتبہ دیکھا کہ ناچیز حضرت قبلہ کے ساتھ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ کے مزار پر انوار پر فاتحہ پڑھ رہا ہے اور حضرت قبلہ "ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃً و فی الآخرۃ حسنۃً و قنا عذاب النار" پڑھ رہے ہیں۔

۱۹۳۹ء سے علمی ادبی ذوق کی خاطر خصوصاً اپنے بزرگوں اور قدیم دکنی ادیبوں کے کارنامے اجاگر کرتا رہا۔ احقر کی تالیفات میں مثنوی من لگن بحری، حسب ایما مولوی عبد الحق انجمن سے شائع ہو چکی ہے۔ دوسری تالیف حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری (اوچی)، استادی ڈاکٹر سید عبد اللطیف پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے اپنے ادارے سے شائع فرمائی۔ سوانح حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کے دو باب بھی ادارہ مذکورہ سے زیر اشاعت ہیں۔ تاریخ ادب اردو کے دکنی ادب سے متعلق ابواب ۶ تا ۸ (۲۵۰ صفحات) ۱۹۶۱ء میں طبع اور شائع ہوئے۔ بعض مقالات "شاہ کمال و شاہ میر، ملک الشعرا غواصی، شاہ طاہر کرنولی، معمیات مرزا کامران، شاہ راجو گولکنڈوی کا فارسی و دکنی کلام وغیرہ بیسویں مضامین رسالہ اردو (مولوی عبد الحق)، نوائے ادب بمبئی، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، اردو ادب علی گڑھ میں شائع ہو چکے ہیں اور انسائیکلوپیڈیا جامعہ پنجاب میں بھی بعض مقالے، شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ گیسو دراز، شیخ محمود بحری، آزاد بلگرامی، زیر اشاعت ہیں۔ آج کل ترقی اردو بورڈ میں بحیثیت معاون مدیر اردو کی خدمت کر رہا ہوں۔"[۱۹]

مندرجہ بالا احوال سخاوت مرزا کے کراچی ہجرت کرنے سے پہلے کا ہے۔ انھوں نے اردو ترقی بورڈ میں کچھ عرصہ ملازمت کی تھی مگر وہاں عمر کی حد آڑے آگئی۔ بعد ازاں انھوں نے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ایجوکیشنل کانفرنس اور اقبال اکادمی کے لیے بھی مضامین لکھے۔

"تذکرہ المعاصرین" میں مالک رام نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۸ء درج کی ہے۔ جبکہ خود ان کے بیان کے مطابق وہ ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔

روحانی سلسلہ تلمذ کی وجہ سے ہی شاید انھوں نے زیادہ تر صوفیا کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور دکن اور قرب وجوار کے صوفیا اور مشاہیر پر مستند مضامین رقم کیے۔

سخاوت مرزا کا خود نوشتہ شجرہ بھی اہمیت کا حامل ہے جو کہ ہم "جوں کا توں" پیش کر رہے ہیں۔

شجرہ نسب خاندان محمد سخاوت مرزا:

ولادت: رمضان ۱۳۱۵ھ حیدر آباد، دکن:

تعلیم: بی اے۔ ایل ایل بی (عثمانیہ) ۲۹۔۱۹۲۸ء

ملازمت: محکمہ جیل و سر رشتہ دار عدالت ضلع و سیشن (۲۹ سال) وظیفہ حسن خدمت ۱۹۵۱ء

علمی مشاغل: ۱۹۳۹ء تا ایذم: ۳۰ سال،

اساتذہ: ڈاکٹر عبد اللطیف (انگریزی)، علامہ سید اشرف شمسی (فارسی)، مولانا مناظر احسن، مولانا سلیم پانی پتی (اُردو)

سلسلۂ بیعت: قادریہ، حضرت شاہ کمال اللہ حیدر آبادی قدس سرہ، پیر تربیت شا بالیمین۔

خاص احباب و عنایت فرما:

ابو محمد عمر الیافعی، شیخ احمد شر ربانی انجمن تنظیم المسلمین۔ مولانا شاہ صبغتہ اللہ چشتی، حکیم شمس اللہ قادری، سید قادر علی بادشاہ شاہ میری، سید مطیع الرسول، مرزا نظام شاہ لبیب اور مولوی عبد الحق بابائے اُردو۔

تصانیف و تالیفات:

- مثنوی من لگن بحری مطبوعہ انجمن ترقی اردو
- تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت مطبوعہ حیدر آباد
- تاریخ ادب اردو، علی گڑھ وہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی
- ابواب دکنی اُردو
- سوانح حیات حضرت خواجہ گیسو دراز دو ابوبا، احفاد و سلاسل
- دیوان شاہ قاسم اورنگ آبادی
- حالات شاہ کمال اللہ حیدر آبادی (مخزن اسرار حقیقت)
- حالات شاہ حسین حموی
- حضرت عین الدین گنج العلوم

- آزاد بلگرامی
- اظفری
- ملک الشعرا
- غواصی
- محمود گائواں
- محمود بحری، ادارہ معارف اسلامیہ لاہور۔ زیر طبع

جملہ ۳۵ کتب کے مصنف ہیں۔

خاندانی شجرہ نسب:

"محمد سخاوت مرزا ولد آغا مرزا ولد مرزا امیر بیگ ولد مرزا رضا بیگ ولد خرم بیگ، ولد مرزا خنجر بیگ، قوم مغل ترکمان، اجداد سپاہی پیشہ اعلیٰ فوجی خدمت پر فائز تھے۔ متوطن: اکبر آباد، معاصر: نصر اللہ بیگ خاں صوبیدار (آگرہ) عم بزرگوار مرزا غالب، مرزا رضا بیگ کے دو فرزند، منشی امیر بیگ و منشی وزیر بیگ۔ مرزا امیر بیگ فارسی کے فاضل، ماہر خط شکستہ وفنون سپاہ گری۔ خانگی ملازم، خوش خلق، ملنسار، ہمدرد قوم، مرید میر علی شاہ۔

حلیہ:

رنگ سرخ وسفید، میانہ قد، اونچی ناک، کشادہ پیشانی، فراخ سینہ، لامبی داڑھی، پٹہ دار زلفیں (مہندی کا خضاب لگاتے تھے۔) وفات تقریباً ۱۹۱۰ء بعمر ۸۵ سال۔ مدفن آگرہ متصل نائی منڈی۔

اہلیہ محترمہ:

مسماۃ اللہ جیلائی خواہر زادی مولوی احمد خاں شیفتہ ابن سلطان خان تلمیذ نظیر واسیر اکبری آبادی۔

شیفتہ مرحوم وارد حیدر آباد دکن (ہمراہ مولانا غلام امام شہید الہ آبادی)۔

میر منشی دارالانشاء مصاحب سر سالار جنگ اول واتالیق سالار جنگ ثانی۔ ۱۲۹۳ھ میں نواب صدیق یار جنگ کے ہمراہ شمالی ہند گئے تھے۔ آگرہ میں حاتم علی مہر، عنایت علی ماہ اور نبی بخش حقیر سے ملے۔ مقدس مقامات کی زیارت کی۔ وفات ۱۳۱۰ھ حیدر آباد دکن (سفر نامہ

صدیق یار جنگ، نغمہ عندلیب (باطن) عروس الاذکار (نقش حیدر آبادی) مضمون راقم ہندوستانی ادب)

اولاد شیفتہ:

- عبدالحامد خان: منتظم دفتر ملکی (سیاسیات) حیدر آباد
- خالہ بیگم
- مشرف بیگم عرف مشوبی بی

- عبدالحامد خان کی ایک لڑکی قادری بیگم منسوب بہ سید ثروت علی ابن سید رستم علی از بطن مشرف بیگم معلمہ مدرسہ نسواں (فوت)
- رستم علی کے نبیرہ عبدالرشید خان (سیویلین، سپرٹینڈنٹ پولیس، شہید) و ممتاز احمد خان مقیم کراچی

اولاد مرزاامیر بیگ:

- ساکن محلہ منٹولہ آگرہ، زوجہ اول مسماۃ اللہ جیلائی خواہر زادی شیفتہ اکبر آبادی۔
- ان کے دو صاحبزادے۔ آغا مرزا، علی مرزا (فوت بصالم جوانی)
- ایک دختر اصغری بیگم۔ منسوب بہ مولوی مظہر علی فاروقی برادر ڈاکٹر مہر علی (غالباً خیر آبادی ثم اکبر آبادی)

اولاد:

- اختر زمان سرکل انسپکٹر پولیس
- چراغ علی
- لائق علی
- فاروق علی

دختران:

- صغرا بیگم منسوب بہ اصغر حسین
- حمیدہ بیگم منسوب بہ منظور الحق ابن ڈاکٹر مہر علی
- وساط بیگم منسوب بہ محمد اسلم لکھنوی

اولاد اختر زمان:

از بطن وحیدہ بیگم نسبت آغا مرزا۔

- انور علی... فوت بعالم جوانی
- مظفر علی۔ سیکورٹی افسر پی آئی اے، اہلیہ: عقیلہ بیگم نسبت مولوی عزیز اللہ شہید
- الطاف علی... پریونٹو افسر بندر گاہ کراچی
- دختر۔ ظہیرا بیگم... معلمہ مدرسہ نسواں

آغا مرزا معروف بہ آغا صاحب مرحوم، ابن مرزا امیر بیگ، ان کی اہلیہ نظیر بیگم نسبت رحیم خان اکبر آبادی ہمشیرہ علیم اللہ خان شہید (اسٹیشن ماسٹر وحافظ شمس الدین خاں)

حلیہ: رنگ سرخ وسپید، دراز قامت، چیچک رو اکتابی چہرہ، اکائونٹنٹ بلدیہ حیدر آباد۔

معاصر: مرزا فرحت اللہ بیگ، ساجد بیگ، ڈاکٹر حامد علی، مرید مولانا عبد الباری فرنگی محل۔

اولاد:

- سخاوت مرزا (بی۔ اے، ایل ایل بی)
- افضل مرزا سابق اکونٹنٹ تعمیرات حیدر آباد
- خورشید مرزا
- لطیف مرزا مقیم کراچی

دختران:

- وحیدہ بیگم منسوب بہ اختر زمان (فوت)
- رشیدہ بیگم منسوب بہ عزیز اللہ شہید، مہتمم خفیہ پولیس
- صغیرہ بیگم۔ زوجہ حامد خاں (مرحوم)

اولاد سخاوت مرزا از زوجہ اول خیر النسا:

- مرزا رضا بیگ
- رابعہ سلطانہ منسوب بہ عشرت اللہ ابن محمد عزیز اللہ شہید

اولاد سخاوت مرزا: از زوجہ ثانی جمیل النساء نسبت محمد علی خاں سرکل انسپکٹر پولیس

- ہمایوں مرزا۔ آرکٹیکٹ
- اقبال مرزا۔ میکانک
- شجاعت مرزا۔ ٹائپسٹ (انٹر میڈیٹ)

دختران:

- اختر سلطانہ، زوجہ عبدالرحمن خاں کنٹراکٹر تعمیرات جامعہ کراچی، ابن فضل الرحمن خاں مرحوم ابن محمد اسمٰعیل خاں مرحوم مدگار مہتمم پولیس حیدر آباد دکن۔
- انور سلطانہ۔ زیر تعلیم (انٹر آرٹ)

اولاد افضل مرزا از زوجہ اول:

- ڈاکٹر سکندر سلطانہ منسوب بہ وسیع اللہ آرکٹیکٹ، کراچی (از زوجہ ثانی)
- ریاض مرزا۔ بی۔ ای مقیم بھارت
- سعید مرزا۔
- اطہر مرزا۔ طالب علم

دختران:

- افسر سلطانہ... (بی۔ اے) منسوب بہ عبدالرحیم خان عرف شہنشاہ
- سرور سلطانہ... (بی۔ اے) زوجہ عبدالمنان انجینئر
- تنویر سلطانہ... (بی۔ اے)
- تحسین سلطانہ۔ زیر تعلیم
- کشور سلطان۔ زیر تعلیم

اولاد خورشید مرزا:

- سلطان مرزا
- سلمان مرزا

دختر:

- وقار النساء

اولاد لطیف مرزا:

از بطن رضیہ سلطانہ نسبت حمید اللہ سرکل انسپکٹر مرحوم برادر عزیز اللہ شہید۔

- مرزا اشرف سعید عرف امجد
- مرزا اکبر سعید عرف اجمل
- مرزا شکیل انور

- مرزا جمیل عالم

دختران:

- کوثر لطیف بیگم... میٹرک
- سلمیٰ لطیف... انٹر سائنس
- شمع طلعت... زیر تعلیم
- شائستہ تمکین... زیر تعلیم

اولاد رضا بیگ ابن سخاوت مرزا

- طارق رضا
- حیدر رضا
- خالد رضا

دختران:

- نکہت یاسمین
- نصرت پروین
- فرحت
- غزالہ

اولاد ہمایوں مرزا:

- کہکشاں مہوین عرف منی

اولاد رابعہ سلطانہ (نسبت سخاوت مرزا)

زوجہ شرت اللہ ابن عزیز اللہ شہید۔ ریلوے

- نعمت اللہ
- ظفر اللہ
- وجیہ اللہ
- فرید اللہ

دختران:

- رانی

- قیصر سلطانہ

اولاد اختر سلطانہ (نسبت سخاوت مرزا) زوجہ عبد الرحمن خاں

- حبیب الرحمن خاں
- شفیع الرحمن خاں
- عتیق الرحمن خاں (۲۰)

ج۔ حدیقہ المرام از مہدی واصف: مترجم سخاوت مرزا:

"حدیقہ المرام" محمد مہدی واصف مدراسی کا لکھا ہوا علماء مدراس کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں ۲۰۲ علماء کا مختصر تعارف شامل تھا اور سخاوت مرزا کو مخطوطہ کی شکل میں کہیں سے دستیاب ہوا تھا۔ مخطوطے کی اہمیت کے پیش نظر فاضل مصنف نے ایسے عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس ترجمے کے آخر میں افسر امروہوی نے تعلیقات کے عنوان کے تحت مزید ۲۳ شعرا و علما کا تعارف پیش کیا ہے جو کہ مدراس اور اس کے قریب وجوار سے تعلق رکھتے تھے۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ شامل کیا گیا ہے جس میں شخصیات علماء مدراس اور مقامات کو شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ ابتدا میں حرفے چند جمیل الدین عالی نے لکھا۔ مصنف کے حالات تعارف کے انداز میں سخاوت مرزا کی ہی کاوش ہے۔ جبکہ مقدمہ افسر صدیقی امروہوی نے لکھا ہے۔ یہ کتاب سخاوت مرزا کی زندگی کی آخری کاوش ہے۔ سخاوت مرزا نے "حدیقہ المرام" کو پہلے عربی زبان میں تصنیف کیا مگر یہ کتاب طبع نہ ہو سکی۔ سخاوت مرزا نے اسے اپنے طور پر ترجمہ کر کے انجمن ترقی اردو، پاکستان کے حوالے بغرض اشاعت کیا۔ داعی اجل نے فاضل مصنف کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ کتاب کا مقدمہ لکھتے اور اپنی دیگر کاوشوں کی طرح اپنے علمی شجر اور دقیع معلومات سے آراستہ کرتے۔ سخاوت مرزا کے انتقال کی وجہ سے کتاب کا مقدمہ سخاوت مرزا کے دیرینہ دوست اور انجمن ترقی اردو کے مخلص کارکن افسر صدیقی امروہوی کے ذمہ لگایا گیا۔ افسر امروہوی نے نہ صرف ترجمے پر نظر ثانی کی، بلکہ ایک دقیع اور مفید مقدمہ بھی تحریر کیا۔ آخر میں تعلیقات میں ان علماء مدراس کا بھی ضمناً ذکر شامل کیا جو کہ کسی وجہ سے کتاب میں شامل نہ کیے جا سکے تھے۔ کتاب کی اشاعت میں قدرے تاخیر ہوئی۔ "ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا"۔ بہر حال ۱۹۷۹ء میں انجمن ترقی اردو سے پہلی اشاعت عمل میں آئی جبکہ دوسری اشاعت ۱۹۸۲ء میں ممکن ہوئی۔ واضح رہے اشاعت سے قبل "حدیقہ المرام کا اردو ترجمہ" رسالہ "اردو" میں قسط وار شائع ہو چکا تھا۔

مصنف کا تعارف:

اس کتاب کی اہمیت اس لحاظ سے بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ سخاوت مرزا نے مصنف حدیقۃ المرام کے حالات پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے آغاز میں بعنوان "کچھ مصنف کے بارے میں" لکھتے ہیں کہ:

"حدیقۃ المرام کے مصنف محمد مہدی المتخلص بہ واصف ابن محمد عارف الدین خان رونق ابن حافظ محمد معروف برہان پوری ابن حافظ محمد عارف الدین برہان پوری از اولاد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔"(۲۱)

محمد مہدی واصف کے جد امجد حافظ محمد معروف برہان پور سے مدراس تشریف لائے اور نواب محمد علی خان والا جاہ (اول) کی قدر دانی کی وجہ سے آرکاٹ (مدراس) میں سکونت اختیار کی۔ آپ قاری، عالم اور حافظ قرآن تھے۔

"مہدی واصف ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد بزرگوار کے زیر عاطفت تعلیم و تربیت پائی۔ مولوی سید عبد القادر حسینی سے عربی، صرف و نحو، عقائد، فقہ، تفسیر قرآن اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔"(۲۲)

مہدی واصف عربی، ترکی، تلنگی، کنٹری، ملیالم کے علاوہ انگریزی پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ جبکہ شاعری میں والد جناب رونق سے تلمذ تھا۔ آپ سنی العقیدہ تھے۔ ۱۲۳۴ھ میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد نووادر انگریزوں کو تعلیم دینے پر مصمور ہوئے تمام عمر درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ۱۲۶۲ھ میں والد جاہ نواب غلام غوث خان نے مجلس مشاعرہ قائم کی تو مہدی واصف کو کرناٹک طلب کر لیا گیا۔ بزم سخن کے رکنِ اعلیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر علمی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں حیدر آباد دکن چلے گئے۔

۱۲۹۰ھ میں حیدر آباد دکن میں وفات پائی۔ والا نے قطعہ تاریخ وفات کیا:

مہدی واصف رجب کی تیسویں
فضل حق سے مورد رحمت ہوئے
سال رحلت ان کا والا نے کیا
آج واصف داخل جنت ہوئے (۱۲۹۰ھ)(۲۳)

عمر الیافعی کے بیان کے مطابق مہدی واصف تقریباً تین سو کتابوں کے مولف و مصنف تھے۔ مگر سخاوت مرزا نے ۵۳ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کی فہرست حدیقۃ المرام کے صفحہ نمبر ۱۱ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۔ دیوان فارسی مطبوعہ کتب خانہ ملا عبد الباسط
۲۔ دیوان اردو سکین تخلص
۳۔ معدن الجواہر (تذکرہ شعرا فارسی)
۴۔ تذکرہ شاعران فارسی، قلمی مکتوبہ ۱۲۵۰ھ
۵۔ حدیقہ المرام (عربی)
۶۔ لولو منشور (عربی)
۷۔ برزخ نامہ (تصوف) قلمی
۸۔ املانامہ واصفی (اردو) ۹۲ صفحات
۹۔ حکایات دلپسند (فارسی)
۱۰۔ وسیلۃ النجات (فارسی)
۱۱۔ توصیف النبی (اردو)
۱۲۔ روضۃ العابدین
۱۳۔ ترجمہ دارالمختار جلد اول قلمی
۱۴۔ ترجمہ موجز*
۱۵۔ آداب الصالحین*
۱۶۔ خلاصۃ التکمیل*
۱۷۔ تحسین الاخلان*

* ان تصانیف کا پتہ نہیں چل سکا کہ کہاں ہیں۔

۱۸۔ اقعات واصف (فارسی)
۱۹۔ مطلوب اطباء (فارسی)
۲۰۔ بباید نوشت فارسی مطبوعہ
۲۱۔ انیس الذاکرین (اردو) واصفحات قلمی
۲۲۔ حسنِ خطاب در جواب (فارسی)
۲۳۔ حقیقت ایمان (تصوف)
۲۴۔ شعار المتقین

۲۵۔ ترجمہ اسوہ عشرہ (نثری، اردو)

۲۶۔ معدن دانش (اردو مطبوعہ)

۲۷۔ مطالب القرآن (تفسیر القرآن، قلمی)

۲۸۔ ترجمہ تفسیر جلالین تحت اللفظی)

۲۹۔ جواہر الفوائد (فارسی)

۳۰۔ فضائل جمعہ (مطبوعہ)

۳۱۔ منہاج العابدین معہ ہدایت الہدایہ (مطبوعہ)

۳۲۔ ترجمہ کیمیائے سعادت (مطبوعہ)

۳۳۔ گلزار عجم، اختصار برہان قاطع

۳۴۔ کنز الرموز، (اردو نثر)

۳۵۔ انوار المشرقین

۳۶۔ رسالۃ البیہۃ الافعہ نسبۃ المرجنیہ الی الحنیفہ

۳۷۔ الاسقاط الظہر بسبب الجمۃ فی ملک مکہ

۳۸۔ القوال المتقین فی احقا یاسین مطبوعہ

۳۹۔ ظفر المقلدین

۴۰۔ تہذیب الاخلاق (عربی) مطبوعہ مدراس

۴۱۔ باقی ہوس اللہ بس

۴۲۔ زبدہ الاخلاق (اردو) مطبوعہ

۴۳۔ رسالہ خوف خدا مطبوعہ

۴۴۔ مختصر البرہان مسمی بہ گلزار عجم

۴۵۔ محفل الخطاب واستفار نکاح سنی وشیعہ (مطبوعہ پٹنہ)

۴۶۔ تاریخ واصف ترکی (قلمی)

۴۷۔ جواہر المصادر مطبوعہ مدراس

۴۸۔ دلیل ساطع (لغت اردو، ہندی، فارسی، سنسکرت) تصنیف ۱۲۵۹ھ

۴۹۔ مجمع الامثال (اردو نثر)

۵۰۔ مناظر اللغات (فارسی اردو)

۵۱۔ دلیل الشعرائ، لغت، محاورات، فارسی ضرب الامثال

۵۲۔ ڈکشنری انگریزی

۵۳۔ شمع وپروانہ (فارسی کلامِ نثر) مطبوعہ [۲۴]

افسر امروہوی نے مقدمے میں اول اول ریاست کرناٹک کا حدود اربع اور مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ بعد ازاں شعرائے مدراس کے تذکروں پر مشتمل پانچ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

"حدیقہ المرام" بھی اسی نوع کی تصنیف تھی۔ لہٰذا تذکروں کی اس فہرست میں آرکاٹ کے مصنفین وشعرا اور علماء کے حالات پر مشتمل "حدیقہ المرام" ایک مفید اضافہ تھا۔

افسر امروہوی نے مقدمے میں کتاب کے چند تسامحات واسقام پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ ایک تو یہ کہ "حدیقہ المرام" میں چند ایسے بھی علما شامل ہیں جو کتاب ہذا کی اشاعت سے قبل وفات پا چکے تھے۔ مگر فاضل مصنف نے ان کے سنین وفات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

بعض اصحاب کی تفصیلات اس قدر مختصر ہیں کہ ضروری معلومات بھی تشنہ رہ جاتی ہیں۔ ایسے ہی اصحاب میں سے ایک عبدالرب ہیں جن کی تفصیلات ہیں ان کا مدراس آنا تو ذکر کیا گیا ہے مگر وہ کہاں سے آئے اور کہاں گئے ان کا وطن کون سا تھا یہ کہیں پتہ نہیں چلتا۔

اسی طرح بعض اصحاب کا ذکر دوسرے تذکروں میں تو ملتا ہے جو زیر تبصرہ تذکرے سے قبل لکھے گئے۔ مگر یہاں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ شاید فاضل مصنف نے ان تذکروں کو دیکھنے کی جسارت نہ کی یا پھر شاید ان تذکروں تک رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ مگر افسر صدیقی امروہوی نے آخر میں تعلیقات کا اضافہ کر کے کافی حد تک اس کمی کا ازالہ کر دیا ہے۔ جن صاحبان قلم کا ذکر اس تذکرے میں ہونے سے رہ گیا ان کی تعداد تقریباً تیئس (۲۳) ہے۔ جبکہ ۲۰۲ مصنفین کے حالات شامل طباعت ہیں۔ بعض کا ذکر مفصل جب کہ بعض کا مختصر ہے۔ جن بزرگان ادب کی مکمل تفصیلات درج نہ ہو پائیں ان کے بارے میں "خاتمہ الطبع" کے عنوان سے کتاب کے آخر میں مولف کی طرف سے ایک وضاحت نامہ تحریر ہے جس کا متن کچھ یوں ہے:

"حدیقہ ہذا کے سیر کرنے والوں سے یہ مخفی نہ رہے کہ یہ شیخ محمد مہدی واصف مدراس کی تصنیف ہے۔ بندہ عرصہ نو سال سے حیدر آباد میں مقیم ہے اور اس کی زندگی کے اکثر دن گوشہ نشینی میں زمانہ شان وشوکت کی سختی کی وجہ سے (جو مجھے پسند نہ تھی) گزرے۔ اس شہر کے تمام

اہل علم سے اس کو واقفیت نہ ہو سکی جن سے میری ملاقات ہوئی یا ان کے حالات سنے ان کا ذکر اس تذکرے میں کر دیا گیا ہے تا کہ اس کو یعنی مولف کو دعائے خیر سے نہ بھولیں، جن اشخاص کا ذکر نہیں کیا گیا ان کے حالات حدیقہ ہذا کے حاشیہ پر لکھ کر ماجور فرمائیں۔ واللہ الموافق ماہ رجب ۱۲۷۹ھ۔[۲۶]

قطعہ تاریخ بہاریہ طبع زاد خادم الشعراء محمد عبدالکریم المتخلص بہ فطرت فرزند مہدی واصف

حدیقہ یہ وہ اشک فردوس ہے
ترو تازہ جس کے سدا گل رہیں
بہار سطور اس کی دیکھیں اگر
تو بس پیچ کھاتے ہی سنبھل رہی
نکل ایک فطرت سے بولا یہ سال
نثار اس حدیقے پہ بلبل رہیں (۱۲۷۹ھ)[۲۷]

قطع نظر اس کے کہ یہ تذکرہ کس حد تک مفید ہے یا نہیں۔ سخاوت مرزا کی اہم کاوش اس عربی تذکرے کا اردو ترجمہ ہے۔ سخاوت مرزا کی تصنیف و تالیف شدہ کتب میں تراجم، تصانیف، تواریخ اور تدوین کے کام قابل ستائش ہیں۔

سخاوت مرزا نہ صرف متعدد زبانوں پر عبور رکھتے تھے بلکہ وسیع مطالعے کے بھی حامل تھے۔ ان کی بیشتر تصانیف دکنیات سے متعلق ہیں۔ ہمارے اس مقالے میں بھی ہم نے ان کی ان تصانیف کو موضوع بحث بنایا ہے جو دکنیات سے متعلق ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "حدیقۃ المرام" کا ترجمہ سخاوت مرزا نے نہایت زیرک بینی شستہ اور رواں کیا ہے۔ اگر فاضل مصنف کتاب کا مقدمہ بھی لکھ پاتے تو ان کی بیشتر مقالات کی طرح وہ بھی مبسوط اور مفید ہوتا۔ مگر افسر امروہوی نے بھی اپنے علم اور قابلیت سے قابل تصنیف بنایا۔ یہ دونوں صاحبان علم انجمن ترقی اردو اور بابائے اردو سے گہرے مخلصانہ مراسم کی بدولت دکنی ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔

اس تصنیف نے یہ ثابت کر دیا کہ سخاوت مرزا صرف محقق ہی نہیں اعلیٰ پائے کے مترجم بھی تھے۔ تذکرہ حدیقۃ المرام کا ترجمہ اس بات کا بین ثبوت ہے۔

د) دیوان قاسم از شاہ قاسم علی قاسم اورنگ آبادی:

شاہ قاسم علی قاسم اورنگ آبادی جو سراج اورنگ آبادی کے ہم عصر تھے۔ ان کا دیوان بنام "دیوان قاسم" اپنے عہد کا اہم ادب پارہ ہے۔ اس دیوان کے اختصاص کے حوالے سے ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنی کتاب "اردو تحقیق" میں لکھتے ہیں کہ:

> "اس کی خصوصیت یہ ہے کہ دکن میں ایہام گوئی کے خلاف تحریک کے جو نمونے ملتے ہیں وہ سراج اورنگ آبادی کے علاوہ شاہ قاسم کے ہاں نظر آتے ہیں۔"[۲۸]

جس وقت شمالی ہند میں مرزا مظہر، شاہ حاتم، یقین اور تاباں اردو شاعری کو فروغ دے رہے تھے۔ ٹھیک اسی عہد میں دکن میں شاہ قاسم اردو شاعری کی روایت کے استحکام کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ جغرافیائی حدود کے فرق کے باوجود شاہ قاسم نے شمالی ہند کے شعرا کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور قبول کیا۔ اس بات کی دلیل ان کی وہ غزلیں ہیں جو تاباں، مظہر اور یقین کی طرح میں ہمیں ملتی ہیں۔

شاہ قاسم کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ انھوں نے دکن کے دیگر شعرا معاصرین کے مقابلے میں اردو زبان کو شستہ صاف اور رواں بنایا۔ آج بھی ان کے اشعار کو سمجھنا قدرے سہل ہے۔

شاہ قاسم علی قاسم ایک اچھے ریختہ گو اور صاحب دیوان شاعر ہونے کے باوجود ادبی تاریخ میں ایک عرصہ تک گوشہ گمنامی میں رہے۔ جبکہ کتب خانہ آصفیہ میں بھی ان کا ایک نفیس قلمی دیوان موجود ہے۔

سخاوت مرزا نے ۱۹۵۷ء میں ایک مقالہ بنام "شاہ قاسم علی قاسم اورنگ آبادی" تحریر کیا جو رسالہ "اردو" میں شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے شاہ قاسم کی شاعری کے علاوہ ان کے ممکنہ دستیاب احوال بھی بیان کیے ہیں۔ بعد ازاں ان کا یہ طویل مقالہ کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ سخاوت مرزا نے قاسم کو سراج اورنگ آبادی کا معاصر بتایا ہے۔

قاسم کے مختصر تعارف کا ذکر تمام نامور مولفین نے اپنے اپنے تذکروں میں کیا ہے۔ جن میں قابل ذکر

> "چمنستان الشعرا مؤلفہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی، و تذکرہ ریختہ گویاں مولفہ فتح علی خاں گردیزی اور یادگار شعرا (ترجمہ اسپر نگر کیٹلاگ) میں شاہ قاسم کا ذکر کیا ہے۔"[۲۹]

شفیق نے نہ صرف قاسم کا احوال درج کیا ہے بلکہ ان کے کلام کا کافی زیادہ انتخاب بھی شامل تصنیف کیا ہے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ قاسم کی ایک دو غزلوں کی طرح میں خود غزلیں بھی کہی۔

قاسم کے بارے میں شفیق چمنستان الشعرا میں لکھتے ہیں کہ:

"شاہ قاسم نام قاسم تخلص، مضامین صاف وشستہ کی تلاش میں سرگرم اور اشعار بڑی حلاوت کے ساتھ کہتے ہیں۔ راقم سے حیدر آباد میں سرسری ملاقات ہوئی بہت عزیز انسان نظر آئے خدا اسلامت رکھے۔"(۳۰)

جبکہ سید فتح علی گردیزی اپنی تصنیف "تذکرہ ریختہ" گویاں میں قاسم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قاسم دکنی از تربیت کردہائے عزلت است۔

دیکھ مجھ چہرہ طِلا کا رنگ

اڑ گیا آج کہربا کا رنگ

میں ہار دیا جان تجھے مولسری کا

اک دام بھی تجھ سے نہ لیا مول سری کا

مجھے اے سرو قد تجھ ناز نے مارا نزاکت سے

بجائے گل ہماری تبہ اوپر ناز بور کھیو"(۳۱)

نواب شہید یار جنگ کا منظوم تذکرہ شعرائے دکن ہے۔ اس میں بھی قاسم کا یوں ذکر کرتے ہیں کہ

سخنوروں میں ہیں اک بار گاہ کے خادم

تخلص ان کا وہی نام بھی وہی قاسم (۳۲)

مختصر یہ کہ قاسم کا ذکر قدیم تذکروں میں مل جاتا ہے مگر تفصیلی احوال ان کے کلام کی داخلی شہادتوں سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔

مصنف کا تعارف

ان کا نام شاہ قاسم علی تھا۔ قاسم تخلص کرتے تھے اور کبھی کبھار پورا نام بھی بطور تخلص استعمال ہوا ہے۔ والد کا نام شیخ عبد اللہ تھا۔ جبکہ قاسم کے ہی دیوان میں موجود ایک شعر کے مطابق:

شاہ قاسم مصطفی کے کمتریں بندوں میں ہے

شیخ عبد اللہ انصاری کے فرزندوں میں ہے (۳۳)

کتب خانہ آصفیہ کے مخزونہ دیوان میں شعر اس طرح ہے ہے مگر یہ ہی شعر کتب خانہ سالار جنگ کے مخزونہ نسخے میں دوسرے مصرعے کی تبدیلی کے ساتھ یوں ہے۔

"شیخ عبداللہ جیسا ان کے فرزندوں میں ہے۔"

سخاوت مرزا اپنے مقالے میں لکھتے ہیں کہ:

"اس دوسرے مصرعے سے شاہ قاسم کے سادات ہونے کی تائید ہوتی ہے۔"(۳۴)

سخاوت مرزا لکھتے ہیں کہ ان کی تاریخ ولادت کا درست تعین ناممکن ہے البتہ ہم داخلی شہادتوں سے صرف اندازہ لگا سکتے ہیں کہ:

"شاہ قاسم کا دیوان ۱۱۶۰ھ سے قبل مدون ہو چکا تھا۔ (دیوان قاسم مکتوبہ ۱۱۶۰ھ کتب خانہ آصفیہ) قرائن یہ ہیں کہ قاسم بارہویں صدی ہجری کے ربع اول میں پیدا ہوئے۔"(۳۵)

وطنیت:

یوں تو قاسم کے وطن کے بارے میں بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ:

"شاہ قاسم علی کا وطن برہان پور معلوم ہوتا ہے یہ برہان پور سے اورنگ آباد آئے اور حیدر آباد سے بھی ان کی آمد و رفت رہی چنانچہ شفیق اورنگ آبادی کی ترتیب چمنستان شعرا (تالیف ۱۲۷۵ھ) کے وقت شاہ صاحب سے حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تھی اور اس وقت مولف کی عمر بیس سال تھی۔"(۳۶)

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قاسم کی آخری عمر حیدر آباد میں گزری۔

شاہ قاسم کو فارسی اور اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ ان کے کلام میں فارسی ترکیبیں اور محاورے بکثرت ملتے ہیں۔ مگر ان کے کسی استاد کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ انھوں نے کس سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔

"مولفِ "ریختہ گویاں" فتح علی حسینی گردیزی نے اپنے تذکرے میں ان کو عزلت (۱۱۴۰ھ تا ۱۱۸۹ھ) کا شاگرد لکھا ہے۔"(۳۷)

مگر خود قاسم نے اپنے کسی استاد سے تلمذ کا ذکر نہیں کیا بلکہ وہ خود کو وہبی اور فطری شاعر کہتے ہیں اور شاعروں کو فیض رسول کریم ﷺ جانتے ہیں۔

"کسی سے مجھ کو ہوا نئیں ہے اس سخن کا شوق۔"(۳۸)

قاسم سخن میں مجھ کو عطائے رسول ہے
نیئں شعر ہیں مرے کسی استاد کی طرح
مجھ کو ذات محمد ﷺ کا فضل شاہ قاسم

سخن میں مجھ کو ہوا نیں کس کتاب سے فیض

اور یہ کہ:

حق نے بخشا ہے مرے قاسم سخن کو آبرو

اہل دل کہتے ہیں سن کر واہ واہ بسیار خوب

یہ مجھ کو بخش الٰہی ہے فیض شاہ قاسم

کسی سے مجھ کو ہوا نیں ہے اس سخن کا شوق [۳۹]

شاہ قاسم کا روحانی سلسلہ:

شاہ قاسم خاندانی درویش تھے۔ حضرت شیخ عبداللہ انصاری پیرِ ہرات جیسے زبردست فاضل اجل کی اولاد میں سے تھے۔ بلحاظ مشرب چشتی الطریقہ تھے۔ اس کے علاوہ ان کا سلسلہ باطنی بیجاپور کے مشہور بزرگ شاہ امین الدین علی بیجاپوری سے بھی ملتا ہے۔ کچھ اشعار میں انھوں نے اپنے روحانی سلاسل و پیران کا ذکر کیا ہے۔

"ہے سلسلہ چشت میں قاسم کا سر رشتہ

تھا خوب مگر کاتب قدرت سے سر شتہ

بندہ ہوں میں وو خواجہ امین اھل چشت کا

ہوں عنلیب اس گل باغ بہشت کا

مرشد ور ہنما ہیں مرے شہ فقیر علی [۴۰]

بخشے جو مجھ کو تاجِ خلافت سر شت کا" [۴۱]

ان متذکرہ بزرگان کے علاوہ قاسم لاہور کے شاہ حسین دھڑا اور برار کے بزرگ شاہ رحمان دولہ سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے۔

شاہ قاسم ذاتی طور پر بڑے صاف دل، مرنجان مرنج، یار باش اور بذلہ سنج تھے۔ نہایت منسکر المزاج، ہندوئوں اور کاسیتھوں سے خاص شفقت فرماتے۔ آپ نہایت خود دار اور متوکل درویش تھے۔

معاصرین شعرا:

شاہ قاسم نے اپنے جن جن معاصرین کا ذکر اپنے دیوان میں کیا ہے ان میں:

"سراج اورنگ آبادی، عارف الدین خان، عاجز، اورنگ آبادی، محمد بیگ مرزا اورنگ آبادی، عزیز اللہ بالاپوری ثم اورنگ آبادی، بہادر خان ممتاز، مرزا صادق خان، صادق حیدر آبادی، نیرّ کاسیھ فرقے کے امرت لال، ہیرا لال، دولے چند، کچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی وغیرہ کے

علاوہ شمالی ہند کے شعرا میں مرزا مظہر جان جاناں، تاں، یقین، میر و سودا اور احسن اللہ خان بیان
شاہ صاحب شامل تھے۔"(۴۲)

وفات:

شاہ قاسم کی تاریخ وفات بھی کسی تذکرے میں درج نہیں مگر یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ:

"شاہ صاحب سراج کی وفات ۱۱۷۷ھ اور طغیانی رودِ موسیٰ (۴۳) ۱۱۸۵ھ تک بقید حیات تھے... اس لحاظ سے ان کی وفات کا زمانہ آخر بارہویں صدی ہجری ہے۔"(۴۴)

"حیدر آباد دکن کی موسی ندی وہ دریا ہے جس میں قلی قطب شاہ نے عین طغیانی میں بھاگ متی کے عشق و ملاقات کے لیے گھوڑا ڈال دیا تھا۔ اسی بنا پر اس کے والد نے اس دریا پر ایک پل تعمیر کروا دیا تھا۔ ۱۶۸۶ء میں عالمگیر کے محاصرہ گولکنڈہ کے وقت بھی طغیانی رود موسیٰ نے عالمگیر کی فوج کو منتشر کر دیا تھا۔"(۴۵)

دیوان قاسم:

"دیوان قاسم" مرتب کرتے ہوئے فاضل مصنف کے پیش نظر تین درج ذیل نسخے رہے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

"دیوان شاہ قاسم علی کے تین نسخے فی الوقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے اور دو نسخے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔"(۴۶)

۱۔ نسخہ اول کتب خانہ آصفیہ کا مخزونہ ہے۔ اس میں صفحات کی تعداد ۲۲۲ سطور ۱۰ بہت فی صفحہ، خوشخط نستعلیق، جدول مطلا، ردیف وار، تقطیع متوسط، کاغذ چکنا بادامی پتلا، ابیات اندازاً ۲۲۲۰۔ ردیف ش ص اور ض کی غزلیں ندارد ہیں۔ نصف دیوان کے بعد درمیان میں سن کتابت یوں درج ہے:

"محمد علی کاتب ایمن آبادی فی سنہ ۱۱۶۰ھ۔"(۴۷)

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کاتب نے مروجہ روش سے ہٹ کر ابتدا یا آخر کے بجائے درمیان میں حوالہ تصنیف شاید اس خیال سے دیا ہو کہ اول و آخر کے صفحات تو اکثر ضائع ہو جاتے ہیں مگر درمیانی صفحات عموماً تادیر محفوظ رہتے ہیں۔ کاتب کے مقصد جو بھی ہو مگر ہمیں اس تحریر سے "دیوان قاسم" کی تصنیف کا سن ضرور معلوم ہو گیا۔

۲۔ دوسرا نسخہ "دیوان قاسم" کا کتب خانہ سالار جنگ بہادر نمبر ۵۸۰ ہے۔ سن کتابت اور کاتب کا نام ندارد ہے۔ کاغذ و تقطیع اور نہج کتابت، کتب خانہ آصفیہ کے اور اس نسخے میں فرق نہیں۔ دونوں کا کاتب ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔

سخاوت مرزا کے مطابق:

"اس نسخے میں ۴۱۰ غزلیں، ۱۰ مخمسات، ۲ مستزاد اور ۲ ترجیع بند، اور ۱۰ متفرق اشعار ہیں۔ بعض غزلیں متروک ہیں اس لیے کہ بعض صفحات معرا ہیں۔ جملہ ۱۲۸ اوراق یا ۲۵۶ صفحات مسطر ۱۱، اس طرح تخمیناً ۲۸۱۶ بیت ہیں۔"[۴۸]

البتہ اس نسخے پر حسن رضا نامی کسی شخص کی مستطیل تین مہریں ہیں۔

۳۔ تیسرا "دیوان قاسم" کا قلمی نسخہ کتب خانہ نواب سالار جنگ ۱۰۸ کا مخزونہ ہے۔

"بخط نسخ معمولی، جدید الخط۔ سید ذاکر حسین نوگانوی کے کسی قلمی نسخے اورنگ آبادی مکتوبہ ۱۱۶۰ھ سے نقل کیا گیا اس کا سن کتابت ۱۳۴۴ھ ہے۔ اس میں آصفیہ کے نسخے سے چالیس غزلیں زائد ہیں۔"[۴۹]

"یہ نسخہ ۳۹۳ غزلوں اور دو مستزاد در مستزاد اور ۱۰ مخمسات پر مشتمل ہے۔"[۵۰]

مزید لکھتے ہیں کہ:

" غرض کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر کے نسخہ نمبر ۵۸۰ میں تقریباً (۴۰) چالیس غزلیں کتب خانہ آصفیہ کے نسخے سے زائد ہیں۔"[۵۱]

۴۔ قیاس ہے کہ "دیوان قاسم" کا ایک نسخہ نواباں سورت کے کتب خانے میں بھی سخاوت مرزا اپنے مقالہ بعنوان "شاہ قاسم علی قاسم" میں لکھتے ہیں کہ:

"کتب خانہ آصفیہ میں ایک کشکول ہے۔ جس میں سورت کے بعض شعرا مثلاً شیخ ثناء اللہ تلمیذ ولی، حافظ دائود، دلکش وغیرہ کی بعض اردو غزلیں اور نواب قطب الدولہ میر نصیر الدین خان بہادر (وفات: ۱۲۳۶ھ) کا شجرہ خاندانی بھی ہے اور بعنوان "یاد داشت کتبہا" دیوان ولی، دیوان سراج اور دیوان مظہر وغیرہ کے ساتھ "دیوان قاسم" کا بھی اندراج ہے۔"[۵۲]

فاضل مصنف کے پیش نظر یہ تمام نسخے ہیں جن کی مدد سے انھوں نے قاسم کے احوال وآثار اور حلیے شاعری کی خصوصیات کا محاکمہ کیا ہے۔ بالخصوص کتب خانہ آصفیہ کا مذکورہ بالا نسخہ جس کے آخری شعر میں "دیوان قاسم" کو "عاشقوں کا فتح رسالہ" کہا گیا ہے۔

شاہ قاسم کا گلشن دیوان
عاشقوں کا فتح رسالہ ہے (۵۳)

دیوان قاسم کا رسم الخط:

شاہ قاسم کا زمانہ تقریباً ڈھائی سو سال قبل کا ہے۔ لہٰذا اس زمانے میں اردو زبان جن ارتقائی تغیرات سے گزر رہی تھی اگر ہم ان کو نظر میں رکھیں تو قاسم کی زبان اس عہد کے مروجہ چلن کے مقابلے میں نہایت صاف ہے اور قابل فہیم ہے۔

دیوان قاسم کے رسم الخط میں بقول سخاوت مرزا:

"ھائے ھوز اور ھائے دو چشمی میں امتیاز نہیں۔ ھائے ھوز بہت استعمال کیا گیا ہے۔ "یائے مصروف" اور "یائے مجہول" میں کوئی فرق نہیں زیادہ تر "یائے مجہول" لکھا گیا ہے۔ ھو کو ھوئیں، نہو کو نہویں، افعال واحد جمع میں بھی فرق نہیں۔ فعل جمع کے ساتھ۔ بجائے "تھیں" کہ "ہے" مانگنا کو منگنا۔ افعال میں وائو بھی زائد ہے مثلاً ڈوونا، چھوپانا، رولانا، دوکھانا وغیرہ۔"(۵۴)

مگر متذکرہ بالا افعال اس زمانے کی زبان کا اختصاص ہیں۔ قطع نظر اس کے قاسم کا کلام خود قاسم کے بقول "عاشقوں کا فتح رسالہ" ہے۔ جس میں "آہ" بھی ہے اور "واہ" بھی۔

دیوان کا بیشتر حصہ روزمرہ، محاورات، روانی وسلاست سے لبریز ہے۔ ممکنہ طور پر قاسم نے معلق الفاظ اور پیچیدار اسلوب سے احتراز کیا ہے۔ دیوان قاسم کے کچھ کلام پر سراج، ولی اور عاجز کا اثر نظر آتا ہے۔ تو کچھ کلام شمالی ہند کے شعرا کے طریق کا عکاس ہے۔

شاعر کا تخلص:

قاسم نے اپنی غزلوں میں تخلص، قاسم، شاہ قاسم اور بعض غزلوں میں شاہ قاسم علی استعمال کیا ہے۔ جبکہ دیوان کی سب سے پہلی غزل جو کہ صنعت مہملہ میں ہے اس غزل کے مقطع میں اپنا تخلص "دل" رقم کیا ہے۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ نسخہ کتب خانہ سالار جنگ نمبر ۵۸۰ میں قاسم کا تخلص "دلا" سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

درد و عالم رکھ دلا مردم سدا

آسرا دل دا کرم اللہ کا(۵۵)

شاعرانہ تعلی:

شاہ قاسم علی قاسم اپنے دیوان کو اپنی شہرتِ تام کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

کسی کو دولت وزر حق نے بے شمار دیا
کسی کو فخر وبزرگی وافتخار دیا
کسی کو شوخی وطنازی ودماغ بلند
کسی کو عجز وغریبی وانکسار دیا
ہزار شکر کہ شہ قاسم اس زمانہ میں
ترے سخن کو وہ مولا نے اشتہار دیا(۵۶)

شاہ قاسم اورنگ آباد کے ریختہ کے استاد شعرا میں شامل تھے۔ اپنے کلام پر فخر وناز کی عکاس یہ پوری غزل ہے۔ تاہم ہم نے اس میں سے چند اشعار نقل کیے ہیں جو ان کے دعویٰ کو ناقابل تردید ثابت کرتے ہیں۔

رستم کو دم میں مات کرے ریختہ مرا
شیروں سے جادوھات کرے ریختہ مرا
صاحب کمال اہل دلوں کا ہے آشنا
کیا ناقصوں سے بات کرے ریختہ مرا
یاقوت ولعل گوھر والماس آب دار
ان سب کو دم میں مات کرے ریختہ مرا(۵۷)

شاہ قاسم، سراج کے معاصر تھے۔ ان کی مراد ریختہ سے دہلی کی ہی اردو زبان ہے۔ جس میں قاسم نے صرف اپنی خوبیوں کا ہی چرچا نہیں کیا بلکہ اپنے کلام کے قدر دانوں کو دعا دی ہے اور بے قدروں کو بد دعا دی ہے۔ یہ قدیم شعرا میں عجیب چلن تھا۔

دیوان کا ہمارے جو کوئی ادب کرے گا
اوس کو خدا میسر عیش وطرب کریگا
توڑے گا جو کسی کے سر رشتہ سخن کو
قہار اس پر نازل مردم غضب کریگا(۵۸)

اور ایک جگہ یوں بھی کہا ہے:

جس کا ھو شوق سنے وہ مرا دیوان سخن
نیں تو موں پھیرے دے ھات کو کانو پہ دھرے (۵۹)

شاہ قاسم بھی اپنے کلام کی ملک گیر شہرت کے دعویٰ دار ہیں کہتے ہیں:

دکھن سے تابہ ھندوستان قاسم
تری باتوں کے دیوانے بہت ہیں (۶۰)

شاہ قاسم کے کلام کے موضوعات:

شاہ قاسم کے کلام میں اگرچہ تصوف کا رنگ بھی ملتا ہے۔ مگر شاہ کمال کی طرح ٹھوس تاریخی معلومات پر مبنی نہیں ہے۔ اصلاحاتِ تصوف بھی استعمال کیں ہیں مگر ہم ان کے کلام کو متصوفیانہ کلام نہیں کہہ سکتے۔ ان کی شاعری کا غالب رجحان عشقیہ شاعری کی طرف ہے۔ تاہم بعض اشعار میں تصوف کی مشہور اصلاحات کا ذکر ملتا ہے۔ جیسے:

"حق مطلق، قل بہ قل (قل ھو اللہ) جزو کل، پاس انفاس، فقیروں کا سونٹا، لشکر کفر اور شخص ومثال وغیرہ۔" (۶۱)

دیدار الٰہی:

عشق کرتا ہے دل کے سیپارے
بیخودی کی کتاب میں دیکھا (۶۲)

فنامی الذات:

اس آئینہ حیرت کا کمال
دیکھتے دیکھتے ہو شخص مثال (۶۳)

صوفی وہ ہے جس میں کفر و شرکت کا کوئی شائبہ باقی نہ ہے۔ مشہور مقولہ ہے۔

"قدمِ درویشاں دربلا"

شاہ قاسم کے ہاں فقیر کا سونٹا دربلائے شرک وکفر ہے۔

تہہ وبالا ہو جاویں لشکر کفر
فقیروں کا جدھر پھر جائے سونٹا (۶۴)

صرف خدا سے امید رکھنا:

جز خدا بس کسی سے کام نہ رکھ
نقش چاہے تو کس کو نام نہ رکھ (٦٥)

صوفی صرف ذات اللہ کا طالب ہوتا ہے۔

ذات کے طالب کو ہرگز گفتگو سے کام نئیں
زاہدوں کو مبارک کعبہ و بامن کو دیر (٦٦)

غرض اس قسم کی اصلاحات تصوف اور اخلاقی مضامین کو قاسم نے اپنی شاعری میں جابجا استعمال کیا ہے۔ مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کا یہ ایک ذیلی موضوع ہے۔

کلی نہیں۔ اخلاقی شعار کا بیان:

مت دل کسی کا توڑ مروت اسی میں ہے
رکھ خاطر آشنا کہ محبت اسی میں ہے
یک تل کا، حق کسی سے نہ ڈالے کسی کو کام
سو آفت اس جہان کی ذلت اِسی میں ہے (٦٧)

لسانی تجزیہ:

شاہ قاسم کی زبان کے بارے میں سخاوت مرزا کا خیال ہے کہ ان کی زبان وہی ہے جو ان کے معاصرین کی ہے۔ جن کا تعلق اورنگ آباد سے تھا جن میں آبرو، مرزا مظہر جان جاناں، نقین، تاباں اور مضمون قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ شاہ قاسم کی زبان اسی عہد کی ہے مگر ان کا اختصاص زبان کی شستگی اور سلاست ہے۔

قاسم کے کلام میں "روانہ" کے بجائے "دیوانہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جبکہ "جب لگ" کے بجائے جب تک، جیسوں کو جوں، سوں کو سیں، دیو کو دو، وو کو "وہ" تو کو تیں لکھا گیا ہے جو کہ جدیدیت کی طرف ایک قدم تھا۔"

جیسا کہ ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی نے عموماً مصادر کے ساتھ نون غنہ استعمال کیا ہے۔ لاناں (لانا)، کھاناں، کھانا وغیرہ حتی کہ بعض جگہ ضمیر کے ساتھ بھی نون غنہ کا استعمال نظر آتا ہے جیسے اپناں، اپنا۔ مگر ہم عصر ہونے کے باوجود شاہ قاسم کی زبان میں ان متروکات کا استعمال مفقود ہے۔

سخاوت مرزا کی تحقیق کی رو سے اگر شاہ قاسم کے املا کا سراج سے تقابل کیا جائے تو "رائو" سراج کے یہاں "دانوں" ہے مگر قاسم نے اس کو درست تلفظ کے ساتھ دائو، گھائو، تائو، لکھا ہے۔ غالب گمان یہ ہی ہے کہ

قاسم نے ذاتی علم و عقل کی بنیاد پر تلفظ میں درست املا متعارف کرایا جس نے زبان کو مزید قابل فہم اور سہل کر دیا۔ اسی طرح بعض الفاظ کا املا مروجہ زبان سے انحراف کر کے مزید قابل تفہیم بنایا جیسے:

"میرے پر... مجھ پر، ھوے گا... ہو گا، نہ ھوئیں... نہوں ھوئے، ھوں میں تبدیل کیے جو تادیر مروج رہے۔ بلکہ بعض الفاظ تو آج تک اردو میں مروج ہیں۔"(۶۸)

اس کے علاوہ مروجہ دکنی میں ایک غلطی فعل کے استعمال میں نہایت عام رہی ہے جو کہ سراج اورنگ آبادی کے یہاں بھی اکثر فاعل واحد کے ساتھ فعل بھی واحد استعمال ہوا ہے۔ جبکہ فاعل جمع ہو تو فعل بھی جمع ہوتا تھا جو کہ قواعد کی رو سے غلط ہے۔ بڑے بڑے شعرا نے فعل کو غلط ہی برتا ہے۔ مگر شاہ قاسم نے بعض جگہ نہایت درست استعمال کیا ہے۔ مثلاً جہاں آباد سا، "پن" بمعنی "مگر" بھی قاسم کے کلام میں ہے۔

اردو قواعد کی رو سے ہندی الفاظ کے ساتھ عطف واضافت درست نہیں ہوتا مگر سراج اور قاسم کے زمانے میں رائج تھا جیسے پھیٹۂ بلدار... بلدار پھیٹہ ہونا چاہیے جو کہ قاسم کے کلام میں ملتا ہے۔ عطف واضافت فارسی تراکیب کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ البتہ قاسم نے کلام میں بیانیہ کاف "کہ" کی جگہ "کے" استعمال کیا ہے جو اردو قواعد کی رو سے غلط ہے۔

شوخ بولا کے بس میرے جی کی
واہ واہ تم نے یہ کہی معقول (۶۹)

اس شعر میں "کہ" کے بجائے "کے" استعمال ہوا ہے۔

بعض محاورات شاہ قاسم نے اپنے عہد سے دو سو سال قبل کے بھی استعمال کیے ہیں۔ جیسے:

جو وقت پہ ملے سو ہے نعمت گویا وہی
بے اشتہا جو دودھ ملیدے ھوئے تو کیا (۷۰)
خوش چشم کاں ھے بھینس کے دیدے ھوے تو کیا
دھجہ، سجہ کچہ اور سروسے سیدے ھوے تو کیا
قاسم علی کا ایک سخن سو کتاب ہے
اور قصہ داستان قصیدے ہوئے تو کیا (۷۱)

درج بالا مثالوں میں "دود میلدے"، "بھینس کے دیدے"، سر وسے سیدے وغیرہ محاورات ہیں۔ دکنی تہذیب میں لوگ رخصت ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اب حاضر ہوتا ہوں۔" یعنی خدا حافظ۔ یہ دکنی کے ساتھ خاص ہے۔ مگر شاہ قاسم نے اس محاورے کو وصل و ملاقات کے معنوں میں لیا ہے۔ کہتے ہیں:

جو کوئی ترا ہووے مشتاق اوس سے حاضر ہو
زمانہ ورنہ دھنواں دھار ہے کسی سے نہ مل (۷۲)

دیوان قاسم میں قاسم نے اس زمانے کے مستعمل کپڑوں، پھولوں، آلات حرب، رنگوں کے نام آلات موسیقی، پرندوں کے نام، آرائش کے متعلقات، کھیلوں کے مخصوص الفاظ اور زیورات وغیرہ کے لیے وسیع تراکیب استعمال کی ہیں۔ جن میں سے چند کی مثالیں درج ذیل ہیں جو قاسم کی زبانِ اردو پر عبور کی دلیل ہیں۔

کپڑوں کی متعلقات:

"چہرہ زر تار، لال پیٹھا، پھیٹہ بلدار، قنات، اڈیرہ، پال فرش چاندنی، ڈورے کا نیمہ، گلابی شال، کستان، طرہ مقیش، شفقی دوشالہ، نکی گوٹا، طاس، بادلہ، سبز پٹو، بنفشی پیراھن، جامہ زیب، چشم بلبل اور سنجاب وغیرہ۔" (۷۳)

پھولوں کے نام:

"دوپہری بوٹے، گل دوپہری، لالہ ہزاری، گل مہندی، رائے بیل، لالہ نافرماں، کنول کا پھول، امرائی، ناگ جھری، گل مولسری، گل شبو، گلابی باغ، زبید مجنوں، نسرین، گل سوسن۔" (۷۴)

رنگوں کے نام:

صندلی، کہربا کا رنگ، طلا کا رنگ (طلائی)، حنا کا رنگ۔

زیورات:

راج مالا، موھن مالا، دردانہ، سرپیچ، اکاس کی پہنچی، ایرن، ڈھولنا، چاند بالی، جڑائو پازیب۔

آرائش و متعلقات:

مور چل، روپے کی تھالی، سونے روپے کی اینٹیں، مسند، پائیدار۔

پرندے:

سرخاب، فاختہ، مور، لوٹن، گرہ باز، کبوتر، ناگنی۔

آتش بازی:

ھت پھول، مہتاب، پھولجھڑی، ھوائی۔

آلات موسیقی:

تال، مردنگ، مانجہہ، طنبورہ۔

آلات حرب:

ذوالفقار، سروھی، نیمچہ، شمشیر مغربی، سانگ، شلق (بندوق کی بتی)، علی بند۔

تشبیہات:

ناندیاں بیل، لال پری، ساون کی جھڑی، رنگ بھری، ھیرے کی کنی، بھگوئے کفنی، کڑوی بنولی، کڑوی کسیلی، سلونا، شہد کے چھتے، پھول بن کے مور، عاشق شہ زور، من کے ڈور، پیادے تلنگے، چھاج سی کٹی، ریل چہیل، چشم کا زخمی، ڈیکھیم ڈھکیل، مطرو پھلیل، سیندھی کا نیرا، نمک کا کھیرا، گڑمبا، فتح رسالا، قطب ستارہ، وغیرہ جیسی بے شمار مثالیں "دیوان قاسم" میں موجود ہیں اور ڈھائی سو سال قبل کی زبان کے ان الفاظ کو آج بھی اردو زبان میں بولا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

پھر الفاظ سازی ملاحظہ ہو:

"ٹھاٹ پر ٹھاٹ، گھاٹ پر گھاٹ، کھاٹ پر کھاٹ، پاٹ پر پاٹ، باٹ پر باٹ اور ہاٹ پر ہاٹ۔"(۷۵)

تشبیہات کلام:

اوس سیہ زلف کو خدا ندیکھائے
دولت آباد کی اندھیری ہے
ہے وہ خوش قد گلاب کی ڈالی
پیٹھ پر پھول کی چنگیری ہے
عشق کے پیچ میں جو کوئی آیا
جوں بگولا اسے گھمیری ہے
اس کی کاکل نے دل لپیٹا تھا
کیا بلا ٹل گئی ہے سر پر سے (۷۶)

فارسی تراکیب و تشبیہات:

قاسم کے کلام میں جدید اردو تراکیب کے ساتھ ساتھ فارسی الفاظ اور تشبیہات بھی ملتی ہیں۔ جس سے ان کی زبان دانی اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ گویا انھیں صرف اردو زبان پر ہی عبور نہ تھا فارسی پر بھی دسترس تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس حوالے سے ان کا کلام "روایت اور جدیدیت" کا حسین سنگم ہے۔ ذیل میں کچھ فارسی تشبیہات و الفاظ کی مثالیں درج کی جارہی ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں مزید "دیوان قاسم" میں مل جائیں گی۔ مگر ہم نمونے کے طور پر انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

"ھوش باختہ، گداختہ، پارہ سیماب، فوارہ سیماب، رخسار گلگوں، رنگی قطار، لالہ نمر دو آشنا، سبز خط، سیہ چشم، خوش نگاہ، خط بندگی، لسان السیف، ذود آشنا، برق در دامن، جلوہ حیرت پناہ، چشم بد دور۔"(۷۷)

طرہ اشک:

قطرہ اشک یوں اڑتا ہے میرا چشم سے لال
جس طرح صبح کو تالاب سے سرخاب اوڑے (۷۸)

فورۂ سیماب:

برق ساجب یہ تڑپ کر دل بیتاب اوٹھے
پل میں آنکھوں سنی فوارۂ سیماب اوٹھے (۷۹)

قلم قلم کرنا:

ھوائے زلف گر اوس رخ پہ خم بہ خم چھوٹے
قلم قلم کرے عالم کو جب قلم چھوٹے (۸۰)

گھات پر گھات:

سجن کے دائو میں آیا ہوں قاسم
نین کرتے ہیں مجسے گھات پر گھات (۸۱)

پات پر پات:

جگہ ایسا ھے غم سے تختہ خون

گویا دیکھو حنا کا پات پر پات (۸۲)

معاصرین و مشاہیر شعرا کے کلام سے تقابل:

اورنگ زیب عالمگیر نے جس وقت اورنگ آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا تو عالمگیر کی کئی لاکھ فوج بھی اپنے ساتھ اپنی زبان لائی جس نے اورنگ آباد کی زبان کو شمالی ہند کی زبان کے رنگ میں رنگ دیا۔ مولوی عبدالحق مولف تذکرہ گل عجائب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

"اس دور میں اورنگ آباد کی تقریباً آبادی شمالی ہند کی آبادی تھی اور سارا رنگ ڈھنگ دلی کا سا نظر آتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کی زبان اس کی صاف شہادت دے رہی ہے۔"(۸۳)

مؤلف "گل رعنا" مولانا حکیم سید عبدالحی بھی اسی رائے سے متفق ہیں کہتے ہیں کہ:

"اب تک اورنگ آباد اور اس کے نواح کے قصبات کی زبان و شائستگی حیدر آباد کے نواح حیدر آباد سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ بہ نسبت حیدر آباد کے اورنگ آباد کی زبان میں دہلویت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔"(۸۴)

اگرچہ "گل رعنا" میں سراج اور ان کے معاصرین کا بھی ذکر ہے جن میں بعض شعرا تو نہایت غیر معروف ہیں مگر نہ جانے کیوں قاسم جیسے بلند پایہ شاعر کا ذکر "گل رعنا" میں جگہ نہ پاسکا۔ جبکہ سراج سے قاسم کے دوستانہ مراسم تھے۔ اس کے علاوہ عارف الدین خان عاجز، دائود اور غلام قادر سامی بھی ان کے حلقہ احباب میں شامل رہے۔

سراج کا کلام اپنے ہم عصر دائود کے مقابلے میں نفیس تراکیب اور سوز گذار سے معمور ہے۔ اسی طرح عاجز کی ایہام گوئی کا اثر دکھنی معاصرین شعرا پر نمایاں نظر آتا ہے۔ جن میں شاہ کمال کڑپوی قابل ذکر ہیں۔ عاجز کے یہاں قاسم کا کچھ کچھ اثر نظر آتا ہے۔ مگر قاسم نے عاجز کا اثر قبول نہیں کیا۔

اورنگ آباد کی عام بود و باش میں جہاں دہلویت کا رنگ نمایاں تر ہوتا گیا وہیں اس دور کی شاعری میں بھی شمالی ہند والے اثرات جذب ہوتے چلے گئے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح مرزا مظہر نے شمالی ہند کی شاعری کو ایہام سے پاک کیا اسی طرح دکن میں سراج اور ان کے بعد شاہ قاسم نے ایہام گوئی کو رد کر کے شاعری میں سلاست اور جدت آفرینی کو فروغ دیا۔ ان کو خود بھی اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کوئی دھلی کا شاعر مجھ سے مقابلہ تو کرے۔ ان کے اس دعویٰ کی تردید یا تائید کے لیے ہم ذیل میں ان کے معاصر شعرا کا کلام پیش کرتے ہیں۔

شاہ قاسم:

آج گلشن میں ہزاروں کو لٹاتی ہے بہار
دم غنیمت دیکھ لے اے جان جاتی ہے بہار
مصرعہ مظہر نے شاہ قاسم کیا دیوانہ ھائے
ہم کیے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار

غلام قادر سامی اورنگ آبادی:

سامی اس موسم میں اب مانند مظہر لاعلاج
ھم کئے ہیں توبہ اور دھومیں مچائی ہے بہار

معظم خان اورنگ آبادی:

شاخ کی مینا کو کس شوخی سے لاتی ہے بہار
گل پہ شبنم نیں ہے اسکو مئے پلاتی ہے بہار (۸۵)

احسن اللہ خان بیان:

سیرت کے ھم غلام ہیں صورت ھوئی تو کیا
سرخ وسفید مٹی کی مورت ہوئی تو کیا

شاہ قاسم اورنگ آبادی:

بے سیرت آں بقول کہ صورت ہوئی تو کیا
ھر چند خوب سونے کی مورت ہوئی تو کیا(۸۶)

عبدالولی عزلت:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلا ہے پانی کا(۸۷)

شاہ قاسم:

بھروسہ کیا ہے یارو زندگی کا
ہے یہ انسان پانی کا پپوٹا (۸۸)

آرزو:

جان تجھ پہ کچھ اعتماد نہیں

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا[۸۹]

آبرو:

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے
کہ آخر بد نما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا

شاہ قاسم:

نہیں اس سادہ رو کو حاجت آرائش زیور
بقول شخصے یارو بد نما ہے چاند کو گہنا[۹۰]

حافظ فضل علی ممتاز تلمیذ سودا:

یاد اوس شوخ کی اس دل میں بھری رہتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر میں پری رہتی ہے

شاہ قاسم:

شیشہ دل میں عجب لال پری رہتی ہے
وو نظر آوئے تو پھر عقل دھری رہتی ہے
جب سے پھڑکے ہے میری آنکھوں میں وہ بجلی چھپ
رات دن چشم سے ساون کی جھڑی رہتی ہے

شاہ کمال کڑپوی:

روئے کثرت سے نگاہ جس کی بری رہتی ہے
حسنِ وحدت کی اوسے دیدہ وری رہتی ہے[۹۱]

شاہ قاسم:

بنفشی اوس کا پیراھن
اھاھاھا، اھاھاھا
ہے جیسے برق در دامن
اھاھاھا، اھاھاھا
ہزاروں خوبیاں اس چاند سے چہرے میں دیکھو گے

مجھے قاسم کہا بامن، اھاھاھا، اھاھاھا

تاباں (تلمیذ حاتم)

کہاہے دیکھ تاباں راست اس خوش قد کو حاتم نے

اھاھاھا، اھاھاھا، اھاھاھا

میاں محمدی بیدار (تلمیذ شاہ حاتم)

مئے ساقی ھیں سب یک جا، اھاھاھا، اھاھاھا

عجب عالم ہے مستی کا، اھاھاھا، اھاھاھا

کیا بیدار سے عاشق کو تُونے قتل اے ظالم

کوئی کرتا ہے ایسا کام، اھاھاھا، اھاھاھا (۹۲)

سراج اورنگ آبادی:

مدت ہوئی کہ ھواخانہ زنجیر خراب

بستۂ زلف گرہ دار ہوں کن کا، اُن کا

شاہ قاسم

طالب گلشنِ دیدار ھوں کن کا ان کا

محو آئینہ رخسار ہوں کن کا ان کا

شاہ کمال کڑپوی:

بندۂ حلقۂ زلفیں ھوں کن کا، ان کا

ھدف ناوک قوسین ھوں کن کا ان کا

عبدالولی عزلت:

ڈھاکے دیوار تحمل میں اڑا مثل غبار

اب تو گردِرہ رفتار ھوں کن کا ان کا (۹۳)

سخاوت مرزا کی درج بالا تحقیق اس بات کی دلیل ہے کہ شاہ قاسم علی قاسم اپنے عصر کے بہترین شاعر تھے جو کسی بھی طرح شمالی ہند کے استاد شعرا سے کم نہیں۔ امر دیگر است، کہ ان کو ادبی تاریخ میں وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ حق دار تھے۔ ہمارا مقالہ شاہ قاسم اور ان جیسے وقت کی گرد میں معدوم ادبا و شعرا کے تعارف میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سخاوت مرزا (مدون)، من لگن، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۵۵ء، ص۱

۲۔ ایضاً، ص۱

۳۔ ایضاً، ص۴۱

۴۔ ایضاً

۵۔ شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، مطبع نول کشور، لکھنو، ۱۹۶۷ء، ص۹۸

۶۔ ایضاً، ص۹۸

۷۔ سخاوت مرزا، من لگن (محولہ بالا)، ص۵۲

۸۔ ایضاً، ص۵۳

۹۔ ایضاً، ص۵۳

۱۰۔ ایضاً، ص۵۳

۱۱۔ ایضاً، ص۵۵

۱۲۔ عبدالرحمن شاطر، مدراس کی مشہور شاعرہ "اثیمہ" کے فرزند تھے۔

۱۳۔ سخاوت مرزا، مخزن اسرار حقیقت (دیباچہ)، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۳۸۴ھ، ص۸

۱۴۔ ایضاً، ص۹

۱۵۔ ایضاً، ص۱۳

۱۶۔ ایضاً، ص۳۰

۱۷۔ ایضاً، ص۳۵

۱۸۔ ایضاً، ص۲۴

۱۹۔ ایضاً، ص۲۸

۲۰۔ ایضاً، ص۱۱۹

۲۱۔ محمد سخاوت مرزا، (مترجم) حدیقہ المرام از مہدی واصف مدراسی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۲۷۷ھ، ص۷

۲۲۔ ایضاً، ص۷

۲۳۔ ایضاً، ص۸

۲۴۔ ایضاً، ص۱۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۸۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، اردو تحقیق، صورت حال اور تقاضے، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۵۴

۲۹۔ سخاوت مرزا، شاہ قاسم علی قاسم، (مقالہ)، مشمولہ رسالہ اردو، جنوری ۱۹۵۷ء، ص ۹

۳۰۔ سید شاہ عطا الرحمن عطا کاکوی، (مرتب و مترجم)، تذکرہ چمنستان الشعرا، ۱۹۶۸ء، عظیم الشان بک ڈپو، سلطان گنج، پٹنہ، ص ۶۳

۳۱۔ سید فتح علی حسینی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں (مرتب) مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۶

۳۲۔ نواب شہید یار جنگ شہید، دکن کے شاعر: اُردو کے شعرا کا منظوم تذکرہ (حصہ دوم)، س ن، عوامی پوریس چھتہ بازار حیدر آباد دکن، ص ۲۹

۳۳۔ سخاوت مرزا، شاہ قاسم علی قاسم اورنگ آبادی، (مقالہ)، مشمولہ رسالہ اردو، جنوری ۱۹۵۷ء، ص ۱۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۲

۳۵۔ سخاوت مرزا، (مرتب)، دیوان قاسم، (مقدمہ)، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ۱۹۷۵ء، صالف

۳۶۔ سخاوت مرزا، شاہ قاسم علی قاسم اورنگ آبادی، (مقالہ) محولہ بالا، ص ۱۲

۳۷۔ سید فتح علی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، (مرتبہ) مولوی عبدالحق (محولہ بالا)، ص ۱۶۶

۳۸۔ سخاوت مرزا (مرتبہ)، دیوان قاسم، ص ہ

۳۹۔ سخاوت مرزا، شاہ قاسم علی قاسم، (مقالہ)، ص ۱۷

۴۰۔ شاہ فقیر علی چشتی آرکاٹ کے مشہور بزرگ تھے۔

۴۱۔ سخاوت مرزا، شاہ قاسم علی قاسم (مقالہ)، ص ۱۴

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۴

۴۳۔ حیدر آباد دکن کا موسیٰ ندی، وہ دریا ہے جس میں قلی قطب شاہ نے عہد شہزادگی میں بھاگ متی کے عشق میں اس سے ملنے کے لیے عین طغیانی میں اپنا گھوڑا ڈال دیا تھا۔ اسی بنا پر اس کے والد نے دریا پر ایک پل تعمیر کروا دیا تھا۔ ۱۶۸۶ء میں عالمگیر کے محاصرہ گولکنڈہ کے وقت بھی طغیانی رودِ موسیٰ نے عالمگیر کی افواج کو منتشر کر دیا تھا۔

۴۴۔ سخاوت مرزا، شاہ قاسم علی قاسم، (مقالہ)، ص ۳۱

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۱

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۲

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۲

۴۸۔ سخاوت مرزا، دیوان قاسم، (مقدمہ) ص ح

۴۹۔ سخاوت مرزا، شاہ قاسم علی قاسم (مقالہ)، ص ۳۲

۵۰۔ ایضاً

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۳

۵۲۔ ایضاً

۵۳۔ ایضاً، ص ۶۸

۵۴۔ ایضاً، ص ۳۳

۵۵۔ ایضاً، ص ۳۴

۵۶۔ ایضاً

۵۷۔ ایضاً

۵۸۔ ایضاً

۵۹۔ ایضاً، ص ۳۵

۶۰۔ ایضاً، ص ۵۲

۶۱۔ ایضاً، ص ۵۲

۶۲۔ ایضاً، ص ۵۳

۶۳۔ ایضاً

۶۴۔ ایضاً

۶۵۔ ایضاً

۶۶۔ ایضاً، ص ۵۳

۶۷۔ ایضاً، ص ۳۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۶۷

۶۹۔ ایضاً

۷۰۔ ایضاً

۷۱۔ ایضاً، ص ۶۸

۷۲۔ ایضاً، ص ۳۵

۷۳۔ ایضاً

۷۴۔ ایضاً، ص ۳۶

۷۵۔ ایضاً، ص ۳۷

۷۶۔ ایضاً، ص ۳۶

۷۷۔ ایضاً، ص ۳۷

۷۸۔ ایضاً

۷۹۔ ایضاً، ص ۳۸

۸۰۔ ایضاً، ص ۳۹

۸۱۔ ایضاً

۸۲۔ اسد علی خان تمنا، گل عجائب، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، دکن، ۱۹۳۶ء، طبع اول، ص و

۸۳۔ مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ، تذکرہ گل رعنا، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص ۶۴

۸۴۔ سخاوت مرزا، شاہ قاسم علی قاسم (مقالہ)، محولہ بالا، ص ۴۲

۸۵۔ ایضاً، ص ۴۳

۸۶۔ ایضاً، ص ۴۱

۸۷۔ ایضاً، ص ۴۴

۸۸۔ ایضاً

۸۹۔ ایضاً، ص ۴۴

۹۰۔ ایضاً، ص ۴۸

۹۱۔ ایضاً، ص ۴۹

۹۲۔ ایضاً، ص ۵۱

۹۳۔ ایضاً

باب سوم

تحقیق دکنیات میں افسر صدیقی امروہوی کا کردار: تجزیاتی مطالعہ

افسر صدیقی کی جن تصانیف و تالیفات کو اس مقالے کے لیے منتخب کیا گیا ہے ان میں تذکرہ عروس الاذکار از نصیر الدین نقش، بیاض مراثی، سنگھاسن بتیسی اور نو سرہار شامل ہیں۔

افسر صدیقی کا طریق تحقیق بھی مولوی عبدالحق اور محمود شیرانی سے متاثر ہے۔"تذکرہ عروس الاذکار" کی زبان سادہ ہے۔ افسر صدیقی کے مد نظر انجمن ترقی اردو کے دو نسخے تھے جن میں سے ایک ناقص الطرفین جب کہ دوسرا صاف نستعلیق خط میں تھا۔ چوں کہ دوسرا نسخہ مکمل تھا لہٰذا اس کو بنیادی نسخہ قرار دے کر ن الف، اور ناقص الطرفین نسخہ کو نسخہ ب قرار دیا گیا ہے۔ حواشی میں اختلاف نسخ دیئے گئے ہیں جب کہ قیاسی اصلاح کے لیے حواشی کا استعمال کیا گیا ہے۔ نسخہ ب کے اختلافات بھی حاشیے میں دیئے گئے ہیں۔

آخر میں تعلیقات کے عنوان سے تذکرے کے ۱۸۰ شعرا پر تعارفی تفصیلی نوٹ جدید معلومات و تحقیق کے مطابق لکھے ہیں جو کہ قدیم شعرا پر افسر صدیقی کا تحقیقی کارنامہ ہے۔

افسر صدیقی نے اپنی تحقیق میں تعلیقات نویسی کا بڑا اہتمام رکھا ہے جو کہ ان کی وسعت علم کی دلیل ہے۔

"بیاض مراثی" گیارہویں اور بارہویں صدی کے لسانی ارتقا کا عکاس ہے جو کہ دو بیاضوں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے بیاض میں قدیم انداز تحریر ہے جس میں ہائے معروف و مجہول، ک، گ میں اور ن۔ ں میں کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا تھا۔ پھر کاتب مختلف ہونے کی صورت میں طرز تحریر اور قدیم املا کے مسائل بھی اپنی جگہ موجود رہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ دی گئی ہے جس میں صفحہ نمبر، لفظ اور معنی درج ہیں۔ بعض شعرا کا تعارف نہایت مختصر ہے۔ اس بیاض کی اہمیت تاریخی ہے۔

افسر صدیقی نے "سنگھاسن بتیسی" میں پوری داستان میں صفحہ نمبر ۵ پر صرف ایک حاشیہ درج کیا ہے۔ البتہ مثنوی کے اشعار میں جگہ جگہ نقطے ڈالے ہوئے ہیں جس کی کوئی توجیہ بیان نہیں کی گئی۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہاں نسخے کی فرسودگی یا کرم خوردگی کی بنا پر الفاظ پڑھے جانے کے قابل نہ ہوں گے۔ ایسا کئی جگہ دیکھنے میں آتا ہے۔

جیسے لگا بولنے... یوں
یک آفت... میرا ہے احوال یوں

گویا اس داستان کی تدوین سے زیادہ اہم اس کی پیش کش رہی ہو گی۔

"نو سر ھار" میں تفصیلی مقدمہ درج کیا ہے جس میں حسب روایت مصنف کے حالات تصانیف اور لسانی جائزہ شامل ہیں۔ نظم کی زبان کے بارے میں بتایا کہ شعر نمبر ۴، ۷ تا ۱۳۷ بحر تبدیل ہو گئی ہے۔ غلط قافیہ بندی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ سندھی زبان کا حرف ربط "آہے" کا استعمال بھی کئی جگہ نظر آتا ہے۔

افسر صدیقی نے لسانی تجزیہ کے تحت یہ نکتہ بھی بیان کیا کہ مصنف نے اس پوری داستان میں کہیں علامت فاعل "نے" استعمال نہیں کیا اور کئی لسانی تصرفات کی نشاندہی کی ہے جس کا مفصل ذکر ہم نے لسانی جائزہ کے ذیل میں کیا ہے۔

نسخے جن سے استفادہ کیا گیا ہے صرف ان کی تعداد کا ذکر ہے باقی ان کا تعارف مفقود ہے۔ نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ کس نسخے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اختلاف نسخ بھی درج نہیں کیے گئے۔ اکثر کتابت کی اغلاط کو متن میں ہی درست کر کے درج کیا گیا ہے مگر بعض جگہ حواشی میں درستی کی گئی ہے۔ جن اشعار میں قافیہ کا خیال نہیں رکھا گیا ان کی نشاندہی بھی حاشیہ میں درج کی گئی ہے۔ جیسے ایک جگہ لکھا ہے "اس بہت میں قافیہ کالحاظ نہیں گیا"۔

افسر صدیقی کی تحقیق کا طریقہ کارسندی ہے جہاں کیا، کیوں اور کیسے؟ کی بحث سے نتائج کا استخراج کیا جاتا ہے۔

الف) تذکرہ عروس الاذکار مؤلفہ نصیر الدین نقش حیدر آبادی:

کتاب کی تدوین و تحقیق پر تبصرے سے قبل مجموعی طور پر جو تذکرے کی صنف میں ادب تخلیق ہوا اس کا ایک سرسری جائزہ یہاں نامناسب نہ ہو گا۔

بارہویں صدی کے اوائل سے شاعری کی بناء وارتقا کے باوجود اردو شعرا کے تذکرے یا سوانح کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی تھی جب ۱۱۶۵ھ میں میر تقی میر نے "نکات الشعرائ"، بعد ازاں فتح علی حسینی گردیزی نے "تذکرہ ریختہ گویاں" اور قائم چاند پوری نے ۱۱۶۸ھ میں "مخزن نکات" مرتب کیا تو تذکروں کی ایک نئی روایت نے جنم لیا۔

ان تذکروں میں دکنی شعرا کا ذکر نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر بعد میں افضل بیگ قاقشال نے تحفتہ الشعراء اور خواجہ خان حمید نے "گلشن گفتار" میں شمالی ہند کے شعرا کے ساتھ ساتھ دکن کے بیشتر سخنواران کو بھی شامل تذکرہ کیا۔ ۱۱۹۴ھ میں دکن کے ایک شاعر اسد علی خان تمنا نے "گل عجائب" مرتب کیا۔

بارہویں صدی میں تذکرہ نویسی کی جس روایت کا آغاز ہوا تھا تیرھویں صدی میں اس کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔ ۱۲۰۹ھ میں مصحفی کا "تذکرہ ہندی" طبع ہوا۔ ۱۲۱۵ھ میں مرزا علی لطف نے "گلشن ہند" مرتب کیا۔ ۱۲۱۶ھ میں اعظم الدولہ سرور نے "عمدہ منتخبہ" اور ۱۲۲۱ھ میں قدرت اللہ قاسم نے "مجموعہ نغز" تصنیف کیا۔ اسی زمانے میں محی الدین میر ٹھی نے "طبقات سخن" مرتب کیا، اس کے بعد تو تواتر سے اعلیٰ درجے کے تذکرے تصنیف پاتے رہے جن میں گلشن بے خار، گلستان بے خزاں، گلشن ہمیشہ یادگار، خوش معرکہ زیبا، آفتاب عالم تاب، سراپا سخن، شمیم سخن، سخن الشعرائ، شعر و سخن، گلستان سخن اور انتخابِ یادگار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہ تذکرے اتنے اہم ہیں کہ شمالی ہند میں اردو زبان وادب کی ترویج وارتقا کی عہد بہ عہد مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں جنوبی ہند میں اگرچہ اردو ادب شمالی ہند سے قبل رواج پاچکا تھا اور اردو ادب کی اکثر اصناف سخن کی ابتدا بھی جنوبی ہند سے ہوئی مگر تذکرہ نویسی کی طرف اہل دکن کی کوئی خاص مراجعت نظر نہیں آتی۔ "گل عجائب" از اسد علی خان تمنا ۱۱۹۴ھ میں تصنیف ہوا۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن میں جو تذکرے مرتب ہوئے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

تیرھویں صدی کے ربع اول میں شعرائے حیدر آباد کا ایک تذکرہ "خزینہ سخن" کے نام سے شاہ تجلی علی تجلی نے لکھا۔ ۱۲۱۵ھ میں مرتب ہونے والے اس تذکرے میں فارسی اور اردو شعرا کا کلام درج ہے۔ مگر ان کے حالات موقوف ہیں۔ لہٰذا اس تذکرے کی حیثیت ایک بیاض کی سی رہ گئی ہے۔ یہ وہی تذکرہ ہے جس سے مشہور شاعر قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے "مجموعہ نغز" کی ترتیب میں مدد لی ہے مگر اس کا ذکر کہیں نہیں کیا البتہ شعرائے دکن کے کلام کی مماثلت و مطابقت اس بات کی دلیل ہے۔

"ایک اور تذکرہ شاہ کمال کڑا مانکپوری نے ۱۲۱۹ھ میں حیدر آباد میں مرتب کیا۔ جس میں تقریباً ۲۷۶ شعرا کے حالات موجود ہیں۔"[1]

"یادگار ضیغم" کے نام سے مولوی عبد اللہ خان ضیغم لکھنوی نے ۱۳۰۲ھ تا ۱۳۰۳ھ میں ترتیب دیا۔ اس تذکرہ ضیغم میں سن تصنیف مذکور نہیں ہے۔ یہ ایک بالتصویر تذکرہ ہے۔ ضیغم نے حیدر آبادی شعرا میں سے چند ہی کا ذکر کیا ہے۔ ترک علی شاہ ترکی نے "سخنواران چشمدیدہ" نامی تذکرہ ۱۳۳۲ھ میں مرتب کیا۔ مگر اس میں شاہ ترکی نے حیدر آبادی شعرا کا صرف فارسی کلام شامل کیا۔ یہ تذکرہ طبع ہو کر شائع ہوا۔

اس عہد کا سب سے اہم تذکرہ "تذکرہ شعرائے دکن" ہے جس کے مولف عبد الجبار خان ملکاپوری ہیں۔ دو جلدوں پر مشتمل ۳۹۶ شعرا کے ذکر پر مشتمل ایک قابل ذکر تذکرہ ہے۔ اس تذکرے کی ترتیب و تدوین میں اکثر فارسی اور اردو تذکروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ مطبوعہ ہے۔

ایک تذکرہ "تذکرہ شعرا" مولوی غلام غوث بغدادی چشتی نے دو جلدوں میں مدون کیا۔ پھر ۱۲۸۹ھ میں زیر تبصرہ "تذکرہ عروس الاذکار" لکھا گیا۔

کتاب کا تعارف:

نصیر الدین نقش کا تصنیف کردہ تذکرہ "عروس الاذکار" ۱۲۸۹ھ کا مصنفہ ہے۔ اس تذکرے کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں نصیر الدین نقش کے معاصر شعرا کے حالات درج ہیں جن میں سے اکثر کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔

گذشتہ صدی کے شعرائے دکن کے حوالے سے یہ ایک اہم ماخذ ہے۔ اس تذکرے کے اب تک دستیاب نسخوں کی بابت معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

> "اس تذکرے کے اب تک تین نسخوں کا علم ہوا ہے۔، دو کتب خانہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں موجود ہیں اور ایک "ادارہ ادبیات اردو" حیدر آباد دکن میں ہے۔"(۲)

سب سے پہلے اس تذکرے پر سخاوت مرزا نے ۱۹۵۸ء میں ایک مفصل تعارف لکھ کر رسالہ "اردو" کے جنوری کے شمارے میں شائع کیا تھا۔ مقالے کا عنوان "تذکرہ عروس الاذکار از نصیر الدین نقش" تھا۔

بعد ازاں افسر صدیقی امروہوی نے اسے مرتب کر کے کراچی سے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔

> "افسر امروہوی نے کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان اور ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں موجود نسخوں کو پیش نظر رکھ کر اس تذکرے کا متن تیار کیا اور ایک مفید مقدمے کے ساتھ اسے شائع کیا۔"(۳)

"تذکرہ عروس الاذکار" اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ دنیا میں اس کے صرف تین نسخے دستیاب ہیں۔ جن میں سے ایک ناقص نسخہ ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد دکن میں ہے۔ جسے تسکین کاظمی نے ادارے کو عطا کیا تھا۔

انجمن میں اس تذکرے کے دو نسخے ہیں جن میں سے ایک ناقص ہے۔ افسر امروہوی تذکرے کے مقدمے میں اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں کہ:

"انجمن میں جو دو نسخے ہیں ان میں سے ایک ناقص الطرفین ہے۔ آغاز میں دیباچے کی عبارت ضائع ہو گئی ہے۔ اور آخر میں حرف وائو کے دس شعرا میں سے تین شاعروں غلام صمدانی وصل، عماد الدین وصف اور سرفراز علی وصفی کے حالات وکلام کے بعد میر افتخار علی وطن کے حالات ایک نامکمل جملے پر ختم ہو گئے ہیں۔

"در فارسی شاگرد میر احمد علی صاحب عصر و در سخنوری اولاً شاگرد میر جعفر علی صاحب نیک پس وفات نیک..."(۴)

متذکرہ نسخے میں وائو کے ۷، ہ کے ۷ اور ی کے ۲ یوں گویا بیس شعرا کا تذکرہ مفقود ہے۔ اگرچہ یہ نسخہ ناقص ہے مگر دو نقات نے اس نسخے کو اہم بنا دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نسخہ کا تذکرہ تحریر اور اسلوب نقش کے اپنے قلم کی کاوش لگتی ہے۔ دوسرا مولوی عمر الیافعی نے اس نسخے میں متعدد مقام پر حواشی لکھے ہیں، جو حالات مصنف کی صوابدید میں معاون ہو سکتے ہیں۔

انجمن کا دوسرا نسخہ خط نستعلیق میں ہے۔ اس نسخے کا اختصاص یہ ہے کہ " اس میں ردیف کے حروف اور شعرا کے تخلص سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں... یہ نسخہ بالکل مکمل ہے۔"(۵)

افسر امروہوی نے اسی مکمل نسخے کو متن قرار دیا اور اول الذکر نسخے کو نسخہ ب قرار دیا جب کہ تیسرا نسخہ قابل رسائی نہ ہونے کی وجہ سے محروم تحقیق رہا۔ فاضل مولف نے "تذکرہ عروس الاذکار" کی تدوین و تالیف میں صرف انجمن میں موجود تذکرے کے دو نسخوں سے ہی استفادہ کیا۔

مصنف کا تعارف:

افسر امروہوی نے نصیر الدین نقش کے ذاتی حالات کے بارے میں انہی معلومات پر اکتفا کیا ہے جو انھوں نے اپنے حالات کے ضمن میں "تذکرہ عروس الاذکار" میں رقم کیے۔ البتہ سخاوت مرزا نے جو کہ افسر امروہوی سے قبل اس تذکرے کے تعارف کے طور پر ایک تفصیلی مقالہ لکھ کر رسالہ اردو میں ۱۹۵۸ء میں شائع کرا چکے ہیں۔ آپ مصنف کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"مولف کا نام تاریخی "برکات الحق نصیر الدین احمد ولد محمد غوث ملتانی" از بنی عباس یعنی عباسی والد کے نام کے ساتھ لفظ ملتانی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے آبائو اجداد ملتان کے رہنے والے تھے۔ تخلص نقش، ۱۲۶۰ھ میں بمقام حیدر آباد پیدا ہوئے۔"(۶)

ابتدائی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"عربی وفارسی کی تعلیم مروجہ طریقہ سے اساتذہ وقت سے حاصل کی۔ ابتدا میں فارسی میں شعر کہتے پھر اردو ریختہ میں کہنے لگے اور میر شمس الدین فیض کے آگے زانو تلمیذ تہہ کیا۔ نقش سرکاری ملازم تھے۔ اور بقول خود نہایت عدیم الفرصت رہا کرتے تھے۔ آپ اعلیٰ درجے کے مصنف اور نقاد تھے۔"(۷)

افسر امروہوی کی تحقیق کے مطابق نصیر الدین نقش نے خود اپنی تصانیف کی تعداد بارہ بتائی ہے۔ مگر ان میں سے صرف چار کتابیں (قلمی) صورت میں ہیں جب کہ تیرہویں تصنیف زیر تبصرہ "تذکرہ عروس الاذکار" ہے۔

سخاوت مرزا اپنے مقالے "تذکرہ عروس الاذکار" میں نقش کے استاد شاعر کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ:

"مولوی نصیر الدین نقش حیدر آبادی شمس الدین فیض کے تلامذہ میں سے تھے۔ جنھوں نے یہ تذکرہ ۱۲۸۷ھ تا ۱۲۹۲ھ مرتب کیا۔ اس تذکرے میں (۳۱۰)(۸) شعرا کے حالات درج کیے گئے ہیں۔"(۹(

اگرچہ سخاوت مرزا نے نقش کو فیض کا شاگرد بتایا ہے مگر افسر صدیقی امروہوی کی تحقیق کے مطابق :

"نقش در حقیقت حافظ عبداللہ حلیم ضیاء کے شاگرد تھے جو کہ فیض ہی کے ایک شاگرد تھے۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں افسر امروہوی ضیاء کی مثنوی "اشعار شہادت" کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس مثنوی میں نقش کا جو قطعہ تاریخ چھپا ہے اس میں نقش نے خود کو شاگردِ مصنف (ضیاؔ) سلمہ اللہ تعالیٰ لکھا ہے۔"(۱۰)

افسر امروہوی نے اس ضمن میں ضیا کی تصنیف "مطالب غرّا"۱۲۵۳ھ (جو مدراس سے شائع ہوئی) کے دیباچے کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں لکھتے ہیں کہ:

"کمترین خاک پائے انام نقش، تخلص محمد نصیر الدین نام، ساکن بلدہ فرخ بنیاد حیدر آباد دکن خدمت میں ارباب سخن، شائق علم و فن کی عرض کرتا ہے... مدت مدید سے اتفاق شعر گوئی کا حضور میں اساتذہ نامدار کے رہا۔ اعنی شفیق اشفق استاد برق صاحب طبع نقاد، ذہن وتاد پیر واصحاب صفا، محمد عبد الرحمی ضیا سلمہ اللہ تعالے اور اختر برج فصاحت، نیر برج بلاغت، گوہر دریا معانی، جوہر شمشیر نکتہ دانی، مولوی حافظ میر شمس الدین فیض نور اللہ مرقدہ کہ جناب موصوف بھی حضرت مغفور کے شاگردِ خاص ہیں۔"(۱۱)

اس عبارت کے پڑھنے کے بعد نقش کے ضیاء کا شاگرد ہونے پر اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

افسر امروہوی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ نقش کے سال وفات کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، صرف ایک جگہ عمر یافعی (جنھوں نے تذکرہ عروس الاذکار کے حواشی لکھے) نے ایک نسخے کے حاشیے میں لکھا ہے کہ "١٦ بہمن ٣٥ف کو انتقال کیا۔"(١٢)

اب ٣٥ھ سے مراد ١٣٣٥ھ ہو سکتی ہے۔ قدما میں اس طرح تاریخ لکھنے کا رواج عام تھا کہ صدی کے ہند سے حذف کر کے صرف متعلقہ سن لکھ دیا جاتا تھا اور یہ سن ١٣٤٤ھ سے مطابقت بھی رکھتا ہے۔

نصیر الدین نقش نے اس تذکرے میں زیادہ تر معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ بقول افسر امروہوی:

"تذکرے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاصرین کے حالات میں بھی ضروری تفصیلات سے گریز کیا گیا ہے۔ ان میں متعدد شعرا ایسے ہیں جن کی ولدیت بھی درج نہیں کی گئی حالانکہ وہ حیدر آباد میں موجود رہتے تھے اور بقول خود انھیں "بچشم خود" دیکھا تھا۔ حتی کہ بعض شعرا کے جو حالات کرناٹک یا مدراس کے تذکروں میں موجود تھے اور جن سے استفادہ دشوار بھی نہ تھا، انھیں بھی قطعاً نظر انداز کر دیا۔"(١٣)

اس تذکرے کو پڑھ کر ایسا گمان ہوتا ہے کہ نصیر الدین نقش نے نہ صرف ذاتی معلومات کا التزام نہیں رکھا بلکہ اس عہد کے موجودہ تذکروں اور سوانحات کو بھی پیش نظر نہیں رکھا۔ اس اعتراض کے جواب میں نصیر الدین نقش اعتراف کرتے ہیں کہ:

"دکن کے قدیم شعرا کے بارے میں جو کچھ بہم پہنچا تبرکاً درج تذکرہ کر دیا گیا
"بعضے از متقدمین ایں بلدہ آنچہ بہم رسیدہ یتمناً زیب قلم گرفت۔"(١٤)

مگر بعض شعرا کے ضمن میں صرف نام، تخلص اور ایک آدھ شعر کا ہی اہتمام نظر آتا ہے۔ مثلاً آرائش محفل کے مولف شیر علی افسوس جیسے مشہور شاعر کے نام اور حالات سے ناواقفیت حیران کن ہے۔

بعض ایسے شعرا کا بھی ذکر دکنی شعرا کے باب میں کیا گیا ہے کہ جن کو دکن سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا، مثلاً امانی جو میر آثمی کے بیٹے تھے اور امانی کے علاوہ بعض اوقات "اسد" بھی تخلص کرتے تھے۔ یار کن الدین عشق دہلوی جو دہلی سے عظیم آباد چلے گئے تھے اور کبھی دکن نہیں گئے جبکہ بعض ایسے شعرا تھے جو بالیقین دکن سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ یا ہجرت کر کے دوسرے علاقوں سے دکن آکر سکونت پذیر ہوئے۔ حتی کہ اس زمانے کے مختلف تذکروں میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے مگر ان کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے۔

افسر صدیقی امروہوی اپنے عمیق مطالعے کے تحت "تذکرہ عروس الاذکار" کے مقدمے میں چند ایسے شعرا کا ذکر کرتے ہیں جو اپنے علم و کمال کے اعتبار سے اس بات کے مستحق تھے کہ انھیں تذکرہ شعرا دکن میں شامل کیا جاتا مگر مصنف کی لاعلمی کہیں یا ذاتی پسند کی انھوں نے ان مشہور شعرا کو یکسر نظر انداز کیا۔ جبکہ ان کا ذکر دوسرے مطبوعہ تذکروں میں بھی شامل رہا۔

جن میں سر فہرست مرزا حیدر علی بیگ گرم ہیں جو کہ لکھنؤ کے باشندے تھے مگر تیرھویں صدی کے آغاز میں اپنے وطن سے نکلے اور کالپی سے ہوتے ہوئے حیدر آباد پہنچے اور یہیں کے ہو رہے۔ قدرت اللہ قاسم نے "تذکرہ شعرائے اردو" مجموعہ نغز (۱۲۲۱ھ) میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ مصحفی کے شاگرد تھے۔ صاحبِ دیوان تھے ان کے دیوان کا مخطوطہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ مجموعہ نغز کی تاریخ تصنیف ۱۲۲۱ھ ہے جبکہ یہ تذکرہ عروس الاذکار ۱۲۸۹ھ کا تصنیف شدہ ہے۔

ان کے علاوہ حسین علی خان ایما بھی دکن کے مشہور شاعر تھے اور ان کا ذکر بھی "مجموعہ نغز" میں موجود ہے۔ بلکہ ایک قصیدے کے چند اشعار بھی تذکرے میں نمونہ کلام کے طور پر شامل ہیں۔ مگر "تذکرہ عروس الاذکار" میں ان کا ذکر بھی ناپید ہے۔

شاہ ندا نامی شاعر دکن جو صاحب دیوان بھی تھے۔ ان کے دیوان کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی میں مخزون ہے۔ یہ بھی قابل ذکر ہونے کے باوجود تذکرہ عروس الاذکار میں جگہ نہ پا سکے۔

سید قمر الدین منت فارسی اور اردو کے مشہور شاعر میر نظام الدین ممنون کے والد تھے۔ ۱۲۰۰ھ کے قریب حیدر آباد میں متوطن ہوئے۔ مجموعہ نغز اور اعظم الدولہ سرور کے "عمدہ منتخبہ" میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

افسر امروہوی کی تحقیق کے مطابق اس کے علاوہ ایسے شعرائے دکن کی ایک طویل فہرست ہے جو نامور ہونے کے باوجود تذکرہ عروس الاذکار میں جگہ نہ پا سکے۔ جیسے مرزا علی رضا مخزون مشہدی دہلوی، میر نظام الدین ممنون کے شاگرد تھے۔ آپ بھی تیرھویں صدی کے اوائل میں حیدر آباد پہنچے۔ نظام الملک کی سرکار سے دو سو روپے ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔ آپ کا ذکر بھی زیر تبصرہ تذکرے میں مفقود رہا۔

اسد علی خان تمنا اورنگ آبادی جو تذکرہ "گل عجائب" کے مصنف تھے اور سید غلام علی آزاد بلگرامی کے نمایاں شاگردوں میں تھے۔ ان کا ذکر بھی "مجموعہ نغز" میں آیا ہے مگر نقش کے اس تذکرے میں آپ کا ذکر نہیں۔

پھر مزید، خواجہ ہمت علی خان ہمت جو کہ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ شیر محمد خان ایمان اور حسین علی خان ایماکے معاصر تھے۔ مجموعہ نغز میں شامل ہونے کے باوجود عروس الاذکار میں متروک رہے۔

سید عبدالولی عزلت کی جائے پیدائش اگرچہ سورت تھی مگر برسوں حیدر آباد دکن میں قیام رہا اور نظام دکن سے وظیفہ پاتے رہے۔ مگر عروس الاذکار میں جگہ نہ پاسکے۔

مقام حیرت ہے کہ نصیر الدین نقش کے تذکرے میں وہ مشہور شاعر بھی شامل نہ ہوسکے جو متعدد کتابوں کے مصنف اور شہرت کے حامل تھے۔ جیسے کہ لچھمی نرائن لچھمی کے بارے میں نہایت مختصر صرف ایک جملے پر مشتمل تعارف ہے۔ حالانکہ موصوف کی ایک درجن سے زائد تصانیف ہیں جن میں چمنستان شعرا، گل رعنا اور "شام غریباں" قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح مرزا علی لطف جو "تذکرہ گلشن ہند" کے مصنف ہیں ان کا ذکر بھی نہ ہونے کے برابر ہے، آپ آصف جاہ ثانی کے دربار سے متعلق تھے۔ آپ کی کیفیت میں بھی صرف "شخصے از طبقہ پیش" لکھ دینا نہایت افسوس کی بات ہے اس درجہ لاعلمی حیرت انگیز ہے افسر صدیقی امروہوی نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر کچھ ایسے دکنی شعرا کا بھی ذکر کیا ہے جن کا ذکر "مجموعہ نغز" میں ہے مگر بعد میں لکھے جانے والے زیر تبصرہ تذکرے میں نہیں ہے جن میں:

> "میر غلام علی احسان، مجاہد جنگ ارمان، محمد مولی احسن، میر صادق علی تاثیر، حمایت حیدر آبادی، خاص حیدر آبادی، غلام حیدر بیگم خاکی، تہمتین جنگ شوق، مداح سیف الملک، صدق حیدر آبادی، میر محمد علی عشق، کیقباد جنگ فراق، عبدالرزاق فیاض، محمد علی خان ماہ، ہادی حیدر آبادی۔"(۱۵)

اسی طرح دکن کا مشہور شاعر مشتاق بھی اس تذکرے میں ذکر سے محروم رہا۔ اس کی وجہ کے بارے میں تو صرف قیاس ہی کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ نہ مصحفی نے ۱۲۰۹ھ میں اپنے تصنیف کردہ "تذکرہ ریختہ" میں مشتاق کا ذکر کیا اور نہ ہی حکیم قدرت اللہ قاسم نے "مجموعہ نغز" میں انھیں شامل کیا۔ البتہ میر محمد خان سرور کے تذکرے "عمدہ منتخبہ" میں مشتاق کا مختصر ذکر ملتا ہے۔

بعد ازاں ۱۱۸۸ھ میں میر حسن نے اپنے تذکرے میں مصحفی کا ذکر کیا ہے مگر مشتاق (جو مصحفی سے دس سال قبل کا شاعر ہے) کا ذکر نہیں کیا۔

افسر امروہوی "عروس الاذکار" کے بالاستعیاب مطالعہ و تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تذکرے میں معاصرین کے حالات بھی تشنہ ہیں اور ان میں ضروری معلومات و تفصیلات سے گریز کیا گیا ہے۔ خود نقش حیدر آبادی کا بیان ہے کہ:

"بیشتر دریں ذکر معاصرین است کہ احوال ہر یکے بہ چشم خود دیدہ۔"(١٦)

عروس الاذکار کا سب سے بڑا سقم یہ ہی ہے کہ معاصرین، وہ بھی جنھیں نقش کے بیان کے مطابق "انھوں نے خود دیکھا" ان کے حالات بلکہ بعض جگہ تو ولدیت تک درج نہیں کی گئی، جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مصنف نے اس زمانے میں موجود تذکروں سے بھی خاطر خواہ استفادہ نہ کیا اور ذاتی معلومات بھی نہایت محدود رہیں ہوں گے۔

بہر حال افسر امروہوی نے متعدد شعرا کے بارے میں خود ذاتی تحقیق سے معلومات بہم پہنچائیں جہاں تک اس تذکرے کا تعلق ہے تو جن اصحاب ہنر کا ذکر کتاب مذکورہ میں ہونے سے رہ گیا ان کا ممکنہ ذکر مقدمے میں تسامحات کے ضمن میں آ گیا... افسر صدیقی امروہوی نے نہایت باریک بینی اور عرق ریزی سے اس تذکرے کی تدوین کی ہے۔

اس تذکرے کی ادبی اہمیت شاید اتنی زیادہ نہ ہو مگر تاریخی اعتبار سے تذکرہ شعرائے دکن کی روایت کی ایک کڑی ضرور ہے۔ اپنے تمام تر اسقام و تسامحات کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

ب) بیاض مراثی مؤلف افسر صدیقی امروہوی:

رثائی ادب کی ابتدا عرب سے ہوئی۔ زمانہ جاہلیت میں بھی عرب میں مراثی کہے جاتے تھے۔ عربی مراثی اپنے قوت تاثر کے باعث دلوں میں جوش اور انتقام کے جذبے کو فزوں تر کر دیتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے بعد زمانہ اسلام میں بھی مرثیے کو مزید ترقی حاصل ہوئی۔ ایران میں بھی مرثیوں کا رواج عام تھا جن پر عموماً عربی مراثی کے اسلوب کا گہرا اثر تھا۔ ایران میں چوتھی صدی ہجری سے عزاداری کا عام رواج ہو گیا تھا۔

بہمنی سلطنت کا قیام آٹھویں صدی ہجری کا واقعہ ہے جو ایرانی ہجرت کر کے دکن آئے تھے وہ اپنے ساتھ تہذیبی روایتیں اور رسم رواج بھی لائے تھے۔ ابتدا میں شاید اعلانیہ عزاداری نہ ہوتی ہو مگر ایرانیوں میں حضرت امام حسین سے عقیدت اور واقعہ کربلا کا بیان عام تھا۔

"دکن میں اہل ایران کے زیادہ جمع ہونے کیوجہ یہ بھی تھی کہ بہمنی عمل داری میں شروع ہی سے دابل اور گوا کا علاقہ بھی تھا۔ جہاں سے جہاز کے ذریعے ایران سے تجارت اور مسافروں کی آمدورفت کا برابر سلسلہ رہتا تھا۔"(۱۷)

اردو مرثیے کی روایت ان مخصوص سماجی اور تہذیبی عوامل کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں ایرانی اثرات سے رونما ہوئے۔

عزاداری ان رسوم کو کہتے ہیں جو حضرت امام حسینؑ اور واقعہ کربلا کی یاد میں رائج ہیں۔ ان سب کا آغاز ہندوستان میں ایرانیوں کے اثر سے ہوا۔ اور مرثیہ گوئی بھی دراصل عزاداری سے ہی متعلق ہے۔

دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام ۱۳۴۷ئ... ۷۴۷ھ عمل میں آیا۔ ابتدا میں سے سلطنت کے اہم عہدوں پر ایرانیوں کی بڑی تعداد فائز رہی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے تہذیبی اثرات دکنی تہذیب پر اثر انداز ہوئے اور اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ ان کے عقائد، مذہبی رسوم حتیٰ کے ضعیف الاعتقادی بھی دکنی تہذیب میں پیوست ہوتی گئی۔ دیگر عقائد کے ساتھ ساتھ عزاداری بھی ان کی تہذیب حصہ بنتی گئی۔

عزنداری کی ان رسوم نے مرثیہ کے لیے ایک راہ ہموار کی اور رفتہ رفتہ فارسی کی جگہ اردو مرثیہ نگاری نے رواج پایا۔ نصیر الدین ہاشمی کے بقول:

"دکن میں مرثیے کے اولین نمونے ہم کو وجہی اور محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں۔ ان دونوں میں سے مرثیہ پہلے کسی نے لکھا اس کے طے کرنے کے لیے ہمارے یہاں کوئی تاریخی بنیاد ایسی نہیں جس کی بنیاد پر ہم کسی ایک کو اولیت کا شرف بخش سکیں۔"(۱۸)

محمد قلی قطب شاہ اور وجہی کے مرثیے اردو کے قدیم ترین مرثیے سمجھے جاتے ہیں۔ اب تک قلی قطب شاہ کے دو مکمل اور دو نامکمل مرثیے ہم دست ہو پائے ہیں جن سے اس کی اہل بیت سے بے پناہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

"وجہی بھی قلی قطب شاہ کے معاصر ہیں لیکن ان کے چند مرثیوں کے جو اقتباسات نظر آئے ہیں ان میں وہ زورِ بیان نہیں جو محمد قلی کے یہاں نظر آتا ہے۔"(۱۹)

بہمنی سلطنت کے خاتمے سے نمو پانے والی ریاستوں میں عادل شاہی ریاست اور قطب شاہی ریاستوں میں بھی عزاداری کا رواج رہا۔ عادل شاہی حکومت میں مرزا کو مرثیہ گوئی میں جو قبولیت عام حاصل ہوئی وہ بہت کم

لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ مرزا نے زورِ بیان سے مرثیے گوئی میں نئے نئے اضافے کیے۔ اپنے عہد کی زبان کو استعمال میں لاتے ہوئے شوکت الفاظ اور ندرت خیال سے مرثیے کو ادبی حیثیت میں منفرد مقام عطا کیا۔

دکن میں ابتدا میں تو فارسی شعرا کا کلام ہی عزاداری کی مجالس میں پڑھا جاتا تھا۔ مگر چونکہ دکنی زبان عوام کی زبان تھی اس لیے مرثیوں کا دکنی زبان میں ہونا ناگزیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ کثرت سے مرثیے اور نوحے لکھے گئے۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے بانی امامیہ مذہب کے پیروکار تھے جبکہ نظام شاہی کا دوسرا بادشاہ اسمٰعیل بھی شعیہ فرقے میں شامل ہو چکا تھا۔ ان تینوں ریاستوں کا سرکاری مذہب شعیت قرار پا چکا تھا۔ ان سیاسی عوامل نے صنف مرثیہ نگاری کو بام عروج بخشا۔

اب تک سب سے قدیم ترین واقعاتِ کربلا پر مبنی جو کتاب ہم دست ہوئی ہے۔ وہ اشرف بیابانی کا "نوسرھار" ہے۔ اشرف نظام شاہی سلطنت سے تعلق رکھتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس صنف ادب کی ابتدا برصغیر میں دکن سے ہوئی جو آج بھی جاری و ساری ہے۔

کتاب کا تعارف:

زیر تبصرہ کتاب "بیاض مراثی" گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے مرثیوں کا مجموعہ ہے۔ انجمن ترقی اردو، پاکستان کے کتب خانہ خاص میں دو بیاضیں ایسی موجود ہیں کہ جن میں صرف نوحے اور مراثی ہیں۔ ایک بیاض جس کا نمبر ۶۱۱ ہے، ۲۱۴ صفحات کی حامل ہے۔ بیاض میں مختلف مرثیے اور نوحے مختلف خط میں لکھے جانے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کا کاتب ایک نہیں بلکہ کئی ہیں جنھوں نے اسے مختلف اوقات میں تحریر کیا۔ اس میں نہ تو کاتب کا کوئی نام ہے اور نہ سنہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ فارسی مثنوی کے ترجمے کے ساتھ "تاریخ تحریر شب پنجم محرم الحرام ۱۱۱۷ھ" درج ہے۔ بہر حال قیاس غالب ہے کہ پوری بیاض ۱۱۱۷ھ میں ہی لکھی گئی ہو۔

گیارہویں صدی کے اوخر اور بارہویں صدی کے اوائل کے عکاس یہ مراثی تین سو سال قبل کے لسانی صورت کے عکاس ہیں۔

افسر صدیقی امروہوی کی ان مراثی کو مدون کرنے کی سعی قابل ستائش ہے۔ کیونکہ تین سو سال قبل کی دکنی یا اردو کو سمجھنا کارِ دشوار ہے۔ لسانی پیچیدگیاں اور املا کے تفرق نے کافی مسائل پیدا کیے۔ مگر فاضل مصنف نے بہر حال ان مراثی کو قابل تفہیم بنا کر مرتب کیا۔

کتاب میں تقریباً ۷۶ قدیم شعرا کا مختصر تعارف اور ان کے مراثی ونوحے شامل ہیں۔ کتاب میں بعض ایسے شعرا کا ذکر بھی ہے جو کسی اور بیاض یا تذکرہ میں نہیں ملتا۔ افسر صدیقی نے اس بیاض میں شامل شعرا کے حالات تلاش کر کے شاعر کے کلام کے ساتھ شائع کیے ہیں۔ افسر صدیقی کی اس کاوش نے اس کتاب کو اردو ادب کے طالب علموں کے لیے ایک اہم ماخذ بنا دیا ہے۔

بعض شعرا کے کلام میں مقطع موجود نہ تھا جس کی بنیاد پر ان کی قطعی پہچان ممکن نہ تھی لہٰذا ان کو لا علم کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے محض قیاس پر یقین کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ لہٰذا یہ نکتہ مستقبل کے محققین کو دعوت تحقیق دے رہا ہے۔

"بیاض مراثی" میں "حرفِ چند" جمیل الدین عالی نے لکھا ہے جبکہ مختصر دیباچہ افسر صدیقی امروہوی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے کتاب کے تعارف، ترتیب اور بعض تسامحات کا ذکر کیا ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے۔

کتاب کے مندرجات:

اس کتاب "بیاض مراثی" میں تریسٹھ شعرا کے ایک سو چھتیس نوحے، چھ مرثیے، آٹھ سلام، ایک مستزاد اور تین نوحے شامل ہیں۔ کل اشعار کی تعداد (۳۱۹۶) تین ہزار ایک سو چھیانوے ہے۔ اس کتاب میں چار فارسی شعرا کے سات (۷) مرثیے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اردو اور فارسی کے چند ایسے مراثی بھی کتاب کا حصہ ہیں جن کے شاعر کے بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا یا کیوں کہ اس حوالے سے کوئی قابل ذکر دلیل نہ مل سکی۔ ایسے تمام نوحے، مرثیوں اور سلام کو "لا علم" کا عنوان دیا گیا ہے۔ ایسی اردو نگارشات کی تعداد سترہ جبکہ فارسی مرثیوں کی تعداد چار ہے جن کے شاعروں کا علم نہ ہو سکا۔

لسانی تجزیہ:

افسر صدیقی نے اس کتاب میں لسانی تجزیہ کے حوالے سے محض قدیم اردو یا دکنی الفاظ کے معنی دیئے ہیں۔ گیارہویں صدی کی زبان کو اٹھارویں صدی میں سمجھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

بیاض کا املا نہایت قدیم طرز پر ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ ہندوی روایت کی طرز پر بلکہ کاتب نے اکثر "یائے معروف" اور "یائے مجہول" میں فرق نہیں لکھا جیسا کہ اکثر قدیم مخطوطات میں ملتا ہے۔

اسی طرح "ک" اور "گ" میں بھی کوئی تمیز نہیں رکھی گئی۔ کسی جگہ 'ک' کو 'گ' اور اور "گ" کو "ک" لکھا گیا ہے۔ اب یہ قاری یا محقق کی صوابدید ہے کہ اصل مطلب تک رسائی حاصل کر پائے۔

"مرثیہ" کا تلفظ یا املا کاتب بیاض نے "مرسیہ" لکھا ہے۔ اسی طرح "بتول" کو "بطول"، "صبح" کو "سبا" اور "راضی کو "رازی" لکھا گیا ہے۔ اسی قسم کی بے شمار استقام ہیں جو تفہیم مطالب میں مانع ہوتے ہیں۔ بیاض کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی اغلاط کی فہرست کافی طویل ہے۔ مثلاً دکھوں کو دوکھوں، ان کو اون لکھنا تو ادب قدیم میں معمول ہے۔

ان تمام خامیوں اور کمیوں کے باوجود فاضل مصنف نے آخر میں ایک فرہنگ ترتیب دی ہے۔ کچھ صفحات پر غیر معروف الفاظ کے معنی پاورقی دیئے گئے ہیں جبکہ بعض صفحات کے معانی آخر میں دی گئی فرہنگ میں درج کیے گئے ہیں۔ یہ اندراج صفحات کی مناسبت سے کیا گیا ہے۔

"بیاض مراثی" کے مختصر دیباچے میں افسر صدیقی نے تمام ضروری معلومات و تسامحات کا احاطہ کیا ہے جو کہ اہم تھیں۔ مثال کے طور پر کتابت کی اغلاط کے سلسلے میں معذرت کے ساتھ افسر امروہوی نے ایک تسامح کی نشاندہی اور تصحیح بھی کی ہے کہ:

> "شاہی تخلص کے دو شاعر دکن میں گزرے ہیں اور دونوں مرثیے کہتے تھے۔ اس تخلص کے تحت جو کلام دیا گیا ہے وہ مخلوط ہو گیا ہے۔ اسی میں کچھ حصہ شاہ قلی خان شاہی کا ہے اور کچھ حصہ علی عادل شاہی کا۔ پہلے دو مرثیے شاہ قلی خان کے معلوم ہوتے ہیں اور تیسرا مرثیہ یقینی طور پر علی عادل شاہ کا ہے جیسا کہ اس کے مقطع سے ظاہر ہے۔"(۲۰)

افسر امروہوی نے نہایت ذمہ داری سے صرف انہی شعرا کا ذکر کیا ہے جن کے حالات مستند تھے۔ ۷۶ میں سے تقریباً ۳۷ شعرا کے حالات کا حصول ممکن نہ ہو سکا۔ دراصل یہ تمام شعرا گیارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے تھے اور اس زمانے میں خصوصاً دکن میں شعرا کے تذکروں کی روایت نہایت سست روی سے آگے چلی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کچھ اچھے شعرا کا کلام تو قلمی بیاضوں میں محفوظ ہو گیا مگر خود ان کے حالات کے ضمن میں کوئی کام نہ ہوا اور وہ معدوم ہو گئے۔ افسر صدیقی کو جن شعرا کے حالات دستیاب نہ ہو پائے ان کی تفصیل یہ ہے:

۔

۔ اعتقادی

۔ رضوان

۔ غلامی

۔ درویش

۔اکبر
۔رفیع
۔غمگین
۔قادر
۔پنتھی
۔رمزی
۔قربان علی
۔محمد علی
۔جعفر حسین
۔زاہد
۔مبارک
۔نظامی
۔چندر
۔سروری
۔مبتلا
۔حسن
۔شری
۔مظفر
۔حسینی
۔شرف
۔مظہر
۔داس
۔عابد
۔نصیری

- راحت
- عطائی
- ہدایت
- رحیم
- علی
- یوسف حسین
- رضا
- غازی

ان شعرا کے بارے میں جو کچھ مختصر معلومات ملیں، افسر امروہوی نے رقم کر دیں۔ ان کے علاوہ اس کتاب میں شامل کچھ مشہور شعرا کے مراثی بھی ہیں۔ جو اگر چہ غزل گوئی اور مثنوی گو کی حیثیت سے تاریخ اردو میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ مگر ان کے مراثی تک رسائی اب تک نہ تھی۔ جن میں ایک نظامی تخلص کا حامل شاعر ہے۔ جس کا مرثیہ صفحہ نمبر ۱۹۸ پر موجود ہے۔ فاضل مصنف کا قیاس ہے کہ یہ وہ نظامی تو نہیں ہو سکتا جو بہمنی دور کے اولین منظوم شاہکار "کدم رائو پدم رائو" کا مصنف تھا۔ کیونکہ زمانی تفرق اس قیاس کو تقویت نہیں دیتا۔ کہ یہ وہ شاعر ہو۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ احمد شاہ ولی کے دور کی تخلیق ہے۔ اس زمانے میں اردو زبان اس درجہ ترقی یافتہ نہ تھی۔ ہندی آمیز اردو میں کہیں کہیں فارسی الفاظ بھی شامل تھے۔ مگر یہاں صورت حال مختلف ہے۔ مرثیہ نظامی میں دکھنی اردو کی ترقی یافتہ شکل نظر آتی ہے۔ لسانی اعتبار سے متذکرہ مرثیہ (بلکہ اس کو سلام کہنا زیادہ درست ہو گا) اس نظامی کی ہو سکتی ہیں جن کی ایک مثنوی "خوفنامہ" کے نام سے انجمن ترقی اردو پاکستان میں موجود ہے۔[۲۱] "خوفنامہ" کی زبان کافی حد تک اس مرثیے کے مماثل ہے۔ لہٰذا بعد از قیاس نہیں کہ اس "سلام" کا شاعر وہی نظامی ہو۔

نظامی کے علاوہ ولی اورنگ آبادی کے مراثی اور سلام بھی اس بیاض میں موجود ہیں۔ اگر چہ "کلیات ولی" میں مرثیہ یا سلام شامل نہیں ہیں۔ مگر ولی جیسے شاعر جس نے شاعری کے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اس نے مرثیہ اور سلام بھی لکھا ہو۔ اور اس بیاض میں دستیاب مرثیوں میں اسی ولی دکنی کا کلام ہو۔ افسر امروہوی کے مطابق

"ولی کے کچھ اور مراثی بھی ہیں، جن کا ذکر یورپ میں دکنی مخطوطات میں کیا گیا ہے۔"(۲۲)

بیاض مراثی کے اول اول شاعر "احمد" نامی ہیں۔ جن کے ضمن میں افسر امروہوی نے قیاساً ڈاکٹر زور کے بیان پر اکتفا کیا ہے کہ "ان کا نام یتیم احمد اور وطن برہان پور ہے۔"(۲۳)

دکن میں احمد نام کے متعدد شاعر گزرے ہیں۔ مخزن الشعرا میں فائق نے تین احمد نامی شعرا کا ذکر کیا ہے۔ جن میں اول الذکر کا نام "مولانا مخذومنا سید احمد نور اللہ مرقدہ' ہے جو احمد آباد کے رہنے والے تھے۔"(۲۴)

مگر آپ کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"۱۲۵۵ھ میں کھمبایت میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو فارسی اور عربی سے نہایت دلچسپی تھی۔ اردو کی طرف آپ زیادہ ملتفت نہ تھے۔"(۲۵)

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ "بیاض مراثی" میں شامل اردو مرثیے ان کی تخلیق نہیں ہو سکتے۔

دوسرے شاعر "احمد" تخلص کرتے۔

"نام میر احمد اللہ، عرف سید چھوٹے، خلف میر حفیظ اللہ صاحب مرحوم تھے جن کا انتقال شعبان ۱۲۷۳ھ میں بمقام بھروچ، ہیفہ سے ہوا۔" آپ حسنی سید تھے۔ علم تصوف میں کامل تھے۔"(۲۶)

ممکن ہے آپ ہی وہ احمد ہوں جن کے مراثی بیاض میں شامل ہیں۔

تیسرے احمد نامی جس شاعر کا ذکر "تذکرہ مخزن الشعرا" میں ملتا ہے وہ بھی "احمد" تخلص کرتے تھے۔ سید تھے ان کا سلسلہ نسب شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ سے ملتا ہے اور سلسلہ قادریہ سے بیعت تھے۔ آپ ریختہ میں کلام کہتے تھے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ آپ ہی وہ احمد ہوں جن کے مراثی "بیاض مراثی" میں شامل ہیں۔

اس قیاس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گجرات میں بوہری فرقے کے لوگ آپ کے بڑے معتقد تھے۔ جو کہ شیعہ فرقے سے قریب تر ہے۔ ان کے یہاں اہل بیعت سے محبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ واقعہ کربلا پر عزاداری بھی مذہبی رسوم کا حصہ ہوتی ہیں۔

مگر ڈاکٹر زور قادری کے بیان کے مطابق:

"اڈانبرا کی ایک بیاض مراثی میں احمد کے سات مرثیے ہیں۔ جن کے اشعار کی تعداد ۱۶۰ ہے۔ احمد کے ہر مرثیے میں جذبات حزن وملال پوری قوت کے ساتھ نمایاں ہیں اور یہ ہی اس صنف سخن کا اصل مقصد ہے۔"(۲۷)

ہم نے مختلف تذکروں میں ملنے والے "احمد" تخلص کے شعرا کے مختصر حالات درج کر دیئے ہیں اور ان کا فیصلہ قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند" کے چھٹے باب میں سخاوت مرزا نے احمد گجراتی کا ذکر کیا ہے:

"احمد کا جو کلام دستیاب ہوا ہے اس کا بھی بڑا حصہ غیر مطبوعہ ہے صرف وہی چند غزلیں ابھی تک چھپی ہیں جو دو نایاب زمانہ بیاضوں میں شامل ہیں۔"(۲۸)

احمد گجراتی کا ذکر "نکات الشعرا"، "مخزن الشعرا" اور "چمنستان الشعرا" میں ملتا ہے۔ مگر اس بات کی کوئی واضح دلیل نہیں ہے کہ احمد گجراتی ہی وہ احمد ہے جس کے مراثی بیاض میں شامل ہیں۔

احمد اگرچہ غزل اور مثنوی کا شاعر ہے۔ تاہم اس کی شاعری میں اخلاقی مضامین بھی بکثرت ملتے ہیں۔ احمد کی ایک تصنیف "وفات نامہ حضرت فاطمہ" بھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانہ خاص کا مخزونہ ہے۔ جو کہ مثنوی کی داخلی شہادتوں کے مطابق ۱۷۲۴ء مطابق ۱۱۳۷ھ ہے۔ اگرچہ یہ مثنوی ادبی لحاظ سے کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں مگر لسانی نقطہ نظر سے گیارہویں صدی کی زبان کی ارتقاپذیری کا عکس ہے۔ کیونکہ تصوف اور اہل بیعت کی مداح احمد کی شاعری کا موضوع رہا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاید یہ ہی احمد ہو جس کے مراثی، بیاض مراثی میں شامل ہیں۔ کیونکہ اس کا زمانہ بھی گیارہویں صدی کے نصف اول کا ہے اور بیاض مراثی میں شامل مرثیے بھی گیارھویں اور بارہویں صدی کے ادب کا شاہکار ہیں۔

مجہول الاحوال شعرا کے احوال:

"بیاض مراثی" میں بعض شعرا کے احوال کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا گیا ہے۔ راقمہ کو ان میں سے چند کے بارے میں قدیم تذکروں میں جو تفصیلات ملیں وہ یہاں پیش ہیں:

۱۔ حسن:

بیاض مراثی کے صفحہ نمبر ۲۶ پر حسن کا ذکر ہے۔ جس میں ان کے حالات نہایت مختصر بیان کیے گئے ہیں۔

یہ بارہویں صدی کے اوائل کا شاعر ہے۔ قاضی نور الدین حسین خان رضوی فائق نے اپنے تذکرے "مخزن الشعرا" میں حسن کا ذکر کیا ہے جس کا اردو ترجمہ کلام حیدری نے "تذکرہ شعرائے گجرات" کے نام سے کیا ہے۔

"حسن تخلص، سید حسن نام، خلف میر باقر علی صاحب، فارسی کا علم اپنے باپ سے حاصل کیا۔ خوش نویسی میں آپ مشہور و معروف تھے۔ آپ احمد آباد کے مشہور شعرا میں سے ہیں۔ آپ نے بعد میں شعر گوئی ترک کر دی تھی۔"(۲۹)

نمونہ کلام:

میں بھی ہو ہوشیار مطلب کچھ تو کر لوں گا حصول
شب جو میرے بخت کی مانند وہ سو جائے گا(۳۰)

۲۔ عابد:

زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ نمبر ۶۸ پر عابد نامی شاعر کا مرثیہ درج ہے۔ افسر صدیقی لکھتے ہیں:

"تاریخ ادب صراحتاً ان کا نام، وطن اور زمانہ بتانے سے قاصر ہے۔ البتہ مستعملہ زبان بتاتی ہے کہ وہ گیارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔"(۳۱)

جبکہ مخزن الشعرا میں اور مترجم کلام حیدری "تذکرہ شعرائے گجرات" میں یوں رقمطراز ہیں:

"عابد تخلص، غلام زین العابدین نام، عرف میاں جان، منشی حسین الدین کے لڑکے تھے۔ آپ کی جائے پیدائش قصبہ رام دیر ہے۔ قصبہ مذکورہ کے تحصیل داری کی خدمت انگریزی سرکار کی طرف سے آپ کے والد کے سپرد کی گئی تھی۔ کچھ دنوں آپ نواب صاحب کھمبایت کے ملازموں میں شمار ہوتے تھے۔ فارسی میں آپ کی استعداد اچھی تھی۔ آپ کے افکار اعلیٰ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے میاں سمجھو سے اصلاح لی۔"(۳۲)

نمونہ کلام:

اس پری کو دیکھ غصہ ہوش عابد اڑ گیا
دشمنِ جانی ہوا ہے یار جانی ان دنوں (۳۳)

عابد کے دس مراثی، بیاض مراثی میں شامل ہیں۔

۳۔ علی:

زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ نمبر ۴۸ پر علی نامی شاعر کے حالات کے ضمن میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ مستقل مرثیہ گو تھے۔ مگر شاعر کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے۔

علی نامی شاعر کے مختصر حالات فائق نے مخزن الشعرا میں درج کیے ہیں۔

"کلام حیدری اس حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

"علی تخلص، شیخ علی نام، مہری الثاب بمبئی کے رہنے والے تھے اور وہاں کے مشہور شعرا میں سے ہیں۔ انھوں نے ایک عشقیہ قصہ نواب مناج کے نام موزوں کیا اور جو کچھ انعام واکرام حاصل کیا تھا سب رہزن لے گئے۔ فارسی میں بھی ان کو دست گاہ تھی۔"[۳۴]

نمونہ کلام:

مرا جلتا ہے دل اس بلبل بے کس کی غربت پر
کہ گل کے آسرے پر یوں لٹایا خانماں اپنا[۳۵]

۴۔ غمگین:

غمگین کا ایک مرثیہ "بیاض مراثی" کے صفحہ نمبر ۸۸ پر دیا گیاہ۔ افسر صدیقی کے مطابق غمگین کا ایک مرثیہ اڈانبرا یونیورسٹی کی بیاض سے ملا ہے جبکہ انجمن ترقی اردو، پاکستان کی مخزونہ بیاض سے ایک اور مرثیہ ملا ہے جو شامل تصنیف ہے۔ مگر غمگین کے ذاتی نام واحوال کے حوالے سے فاضل مصنف خاموش ہیں۔ ہمیں ان کے مختصر حالات دستیاب ہوئے ہیں وہ لفظ بہ لفظ درج کیے جاتے ہیں:

"غمگین تخلص، منشی فرید بخش نام، تیس برس کے قریب ہوئے کہ نواب ابراہیم خان والی سیجین کے خاص ساتھیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کی طبیعت شگفتہ ہے اور آپ خوش وضع بھی ہیں۔"[۳۶]

نمونہ کلام:

شمع رویوں کی ملاقات سے کرتا ہے منع
ناصحا آگ لگو اس ترے سمجھانے کو[۳۷]

۵۔ قادر:

زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ نمبر ۹۸ پر دکنی شاعر قادر کے مراثی درج ہیں۔ ان کے بارے میں سخاوت مرزا تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند کی پہلی جلد کے ساتویں باب میں لکھتے ہیں کہ:

"بقول قائم ان کا نام میر عبد القادر اور تخلص قادر تھا، اور وطن حیدر آباد دکن۔"[۳۸]

متذکرہ تاریخ میں ہی قادر کے ذیل میں مزید لکھا ہے کہ ": عمر جب پچاس برس سے اوپر ہوئی تو اپنے وطن کے ایک ایسے بزرگ کے مرید ہوئے جنھیں شیخ شہاب الدین سہروردی سے نسبت تھی۔ قادر نے اپنے ایک مرثیے کی تاریخ تصنیف ۱۷۳۶ئ / ۱۱۴۹ھ بتائی ہے۔"[۳۹]

"کتب خانہ ایڈ انبرا میں ایک بیاض میں قادر کے سترہ مرثیے محفوظ ہیں۔ جبکہ ایک مرثیہ کیمبرج میں، ایک کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں اور ایک کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے۔[۴۰]

"انجمن ترقی اردو، پاکستان کے کتب خانہ خاص میں قادر کی چند غزلیں اور مخمسات بھی محفوظ ہیں۔"[۴۱]

قادر کو غزل گوئی میں ولی اور اشرف کے بعد ایک اہم شاعر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ قادر کی علمی قابلیت بھی قابل ذکر ہے اس نے اپنے مرثیوں میں علم نجوم اور علم ہندسہ کی بعض اصطلاحات کا ذکر کیا ہے۔ جس سے اس کی علمی قابلیت اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ تشبیہات و استعارات کا بر محل استعمال کلام کا خاص وصف ہے۔

آج سرور چلے ہزاراں حیف
شہ کا ماتم ہے دین داراں حیف
غم سوں قاسم ہوے قراراں حیف
نو عروسی پہ دکھ کا باراں حیف[۴۲]

۶۔ نصیری:

زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۶۵ پر نصیری کے دو اردو مرثیے شامل تصنیف ہیں۔ مگر حالات کے ضمن میں صرف اتنا درج ہے کہ یہ گیارہویں صدی ہجری کے اواخر کے شاعر ہوں گے۔

ہمیں ان کے مختصر ترین حالات مخزن الشعرا میں دستیاب ہوئے جو بعینہ درج ہیں:

"نصیری تخلص، نواب امین الدین حسنی خان نام، کہ داجہ بڑودہ کی سرکار کے نامی امرا میں سے ہیں۔ غایت شہر سے ان کی صفات کے بیان کی حاجت نہیں۔ (۱۲۵۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔"[۴۳]

نمونہ کلام:

وائے یہ گردش طالع کہ شب اس محفل میں
پہنچی نوبت جو ہماری تو سبو ٹوٹ گیا[۴۴]

۷۔ درویش:

کتاب "بیاض مراثی" کے صفحہ نمبر ۱۷۷ پر درویش نامی شاعر کا ایک مرثیہ رقم ہے۔ جبکہ شاعر کے حالات نامعلوم ہیں۔ راقمہ کو درویش کے مختصر حالات جو دستیاب ہو سکے ذیل میں درج ہیں "درویش تخلص، سید درویش علی نام، خلف مولانا میر علی صاحب، بمہ خاندان جلاوطنی کے بعد سورت آئے تھے۔"(۴۵)

نمونہ کلام:

ساقی نہ آج سرپہ بیٹھا سجا گلابی
زاہد نہ ہووے کیوں کر اب دیکھئے گلابی(۴۶)

متذکرہ شعرا کے علاوہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی تذکرے میں کچھ اور نامعلوم شعرا کے حالات دستیاب ہو سکیں مگر قدیم ادب میں متن کی تلاش بجائے خود ایک مشکل امر ہے۔ جس قدر مآخذ دستیاب ہو سکے ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں بھی تحقیق میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی۔

"بیاض مراثی" افسر امروہوی کی ایک اچھی کاوش ہے۔ اس طرح کم از کم قدیم ادب کے مراثی اور لسانی تغیر پذیری کا پتہ چلتا ہے۔ بہر حال تحقیق کی گنجائش تو ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

ج) سنگھاسن بتیسی از فقیر دکنی:

کتاب کا تعارف

"سنگھاسن بتیسی از فقیر دکنی" کتابی شکل میں چورانوے صفحات کے پر مشتمل ہے آغاز فہرست مضامین سے ہوتا ہے۔ "حرف چند" جمیل الدین عالی نے جب کہ "پیش لفظ" افسر صدیقی امروہوی نے لکھا ہے۔ اس کے بعد "بیان منصف" اور پھر در میان نعت مصطفی کے عنوان سے نعت ہے۔ اس کے بعد بتیس پتلیوں کے بیان کی فہرست ہے۔ صفحہ نمبر ۱ تا ۹۴ مثنوی لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں افسر امروہوی نے صرف "پیش لفظ" لکھا ہے جو کہ نہ صرف سنگھاسن بتیسی کا تعارف ہے بلکہ اس کی ارتقائی لسانی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ نیز مثنوی سے متعلق دستیاب معلومات کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مگر افسر امروہوی نے نہ تو آخر میں فرہنگ شامل کی ہے اور نہ ہی غلط نامہ تحریر کیا ہے۔ مگر ضروری مقامات پر حوالے تحریر کئے گئے ہیں۔

"سنگھاسن بتیسی" کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر، افسر امروہوں کی یہ کاوش کسی حد تک قدیم ادب کی تدوین و تکمیل کے سلسلے کی اہم کڑی ثابت ہو سکتی ہے۔

مثنوی کا تعارف:

"سنگھاسن بتیسی" دراصل سنسکرت الاصل قصہ ہے۔ جسے ہندوئوں کی دیومالائی داستانوں میں شامل کیا جاتا ہے۔

> "اسے چتر بھوج داس بھٹ خلف سروپ چند نے ۱۶۰۵ء میں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا اور اسی فارسی ترجمے کو للو لال کوی اور مرزا کاظم علی جوان دہلوی نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے زمانے میں اردو میں منتقل کیا۔ (۴۷)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اردو کی منظوم داستانیں" کے صفحہ نمبر ۳۸۱ پر سنگھاسن بتیسی کے فورٹ ولیم کالج کے زیر سرپرستی تصنیف کا سال ۱۸۰۴ء بتائے ہیں۔ قدیم ادب اردو کی یہ داستان نہ صرف دنیا کی بہت سی مقبول زبانوں میں ترجمہ ہوئی بلکہ اس نثری داستان کو مقدد شعرا نے نظم کے قالب میں بھی ڈھالا ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر مقالے میں شامل ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے ترجمے سے قبل بارہویں صدی کے وسط میں دکن کے ایک غیر معروف شاعر جن کا تخلص فقیر تھا نے اس داستان کو دکنی اردو میں نظم کیا۔

> "سنگھاسن بتیسی" سے متعلق ایک اور اردو مثنوی مخطوطے کی صورت میں انجمن ترقی اردو، علی گڑھ میں موجود ہے چوں کہ ناقص باالآخر ہے اس لیے منصف اور سن تصیف کا سراغ نہیں ملتا مگر زبان وبیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی دکنی شاعر کے زور طبع کا نتیجہ ہے۔" (۴۸)

بقول افسر امروہوی:

> "اس داستان کا تعلق بکرماجیت کی روایتی داستان سے ہے۔ راجا بکرماجیت اہل ہند کے مذہبی فرمانرائواں میں شامل ہے اور اس کی ذات سے منسوب تمام تر خوبیاں مبالغہ آرائی کی حد تک بیان کی گئی ہیں۔ برصغیر کی قدیم تاریخ میں راجا بکرماجیت کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس سے وابستہ متعدد قصے کہانیاں مشہور ہیں۔" (۴۹)

افسر امروہوں کتاب کے "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں "حقیقت مین یہ راجہ گپت خاندان کا تیسرا فرمانروا تھا جس کا دور حکومت ۳۷۵ء سے ۴۱۳ء تک رہا۔"(۵۰)

اس راجہ کو چندر گپت ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ مگر تاریخ میں وہ چندر گپت وکرمادتیہ یا وکرماجیت کے نام سے مشہور ہوا۔

افسر امروہوی کی تحقیق کے مطابق جب وکرماجیت نے عنان حکومت سنبھالی تو ابتدا اس کا دارالحکومت اجودھیا تھا مگر جب اس نے مالوہ اور گجرات کو فتح کر لیا تو مالوہ کے قدیم شہر اجین کو اپنا نیا دارالحکومت بنالیا۔ اس نے اس شہر کو بے پناہ ترقی دے کر ایک قابل ذکر شہر بنا دیا۔ حتی کے مالوہ اور گجرات میں رائج سن کو بکرماجیت کی نسبت سے بکرمی سمبت کا نام دیا گیا یہ سمبت آج بھی ہندوئوں میں رائج ہے اور مذہبی معاملات میں آج بھی اسی بکرمی سمبت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس بکرمی تقویم کو یہاں محض معلومات کی غرض سے شامل کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ بکرمی کلینڈر کو پنجابی کلینڈر یا دیسی کلینڈر بھی کہا جاتا ہے۔

> "برصغیر پاک و ہند کو اعزاز حاصل ہے کہ اس خطے کی دیسی تقویم دنیا کی چند قدیم ترین تقاویم میں سے ایک ہے۔ بکرمی کلینڈر کا آغاز ۲۱ قبل مسیح میں اس وقت ہوا جب ہندوستان کے ایک راجہ بکرماجیت نے مالوہ کے قدیم شہر اجین کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اس شہر کو ہر طرح سے ترقی دے کر ایک اہم اور قابل ذکر شہر بنا دیا۔ گجرات میں ۵۷ قبل مسیح سے ایک سنہ رائج تھا۔ جب بکرماجیت نے ان علاقوں کو فتح کیا تو وہاں کے پنڈتوں نے راجہ کو خوش کرنے کے لیے اس سن کو اس کے نام کی نسبت سے بکرمی سمبت کہنا شروع کر دیا۔"(۵۱)

اس بکرمی کلینڈر کے سال کی ابتدا "ویساکھ" کے مہینے سے ہوتی ہے۔ تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دنوں پر مشتمل اس تقویم کے نو مہینے تیس (۳۰) دن کے ہوتے ہیں، ایک مہینہ ۳۱ دن کا ہوتا ہے اور دو مہینے بتیس (۳۲) دن کے ہوتے ہیں اکتیس دن پر مشتمل مہینہ "ویساکھ" کہلاتا ہے جب کہ بتیس دنوں پر مشتمل مہینوں نے نام بالترتیب "جیٹھ اور ہاڑ" کہلاتے ہیں۔ باقی مہینوں کی تفصیل یوں ہے کہ

۱۔	ویساکھ	وسط اپریل۔ وسط مئی	۳۱ دن
۲۔	جیٹھ	وسط مئی۔ وسط جون	۳۲ دن
۳۔	ہاڑھ	وسط جون۔ وسط جولائی	۳۲ دن
۴۔	ساون	وسط جولائی۔ وسط اگست	۳۰ دن

۵۔	بھادوں	وسط اگست۔وسط ستمبر	۳۰ دن
۶۔	اسو	وسط ستمبر۔وسط اکتوبر	۳۰ دن
۷۔	کاتک	وسط اکتوبر۔وسط نومبر	۳۰ دن
۸ ۔	مگھر	وسط نومبر۔وسط دسمبر	۳۰ دن
۹۔	پوہ	وسط دسمبر۔وسط جنوری	۳۰ دن
۱۰۔	ماگھ	وسط جنوری۔وسط فروری	۳۰ دن
۱۱۔	پھاگن	وسط فروری۔وسط مارچ	۳۰ دن
۱۲۔	چیت	وسط مارچ۔وسط اپریل	۳۰دن

بکرمی تقویم کے آٹھ پہر ہوتے ہیں جو کہ یہ ہیں۔ بکرمی تقویم کے مطابق ایک دن میں آٹھ پہر ہوتے ہیں۔ایک پہر جدید وقت یا گھڑی کے مطابق تقریبا تین گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ان آٹھ پہروں کے نام اور وقت یوں ہے۔

دَھمی ویلا۔	صبح ۶ بجے سے ۹ بجے تک
دوپہر ویلا۔	صبح ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک
پیشی ویلا۔	دوپہر کے ۱۲ بجے سے دن ۳ بجے تک
دیگر ویلا۔	سہ پہر ۳ بجے سے شام ۶ بجے تک
نماشاں ویلا۔	رات کے ابتدائی لمحات یعنی شام ۶ بجے سے رات ۹ بجے تک
کفتان ویلا۔	رات ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک
ادھ رات ویلا۔	رات ۱۲ بجے سے سحر ۳ بجے تک
اسور ویلا۔	صبح ۳ بجے سے ۶ بجے تک

بکرمی تقویم کے بارے میں دلچسپ معلومات میں سے ایک یہ بھی ہے

"کہ بکرمی سن میں سے ۵۶ عدد کم کر دینے سے سن عیسوی بن جاتا ہے۔ مثلا۲۰۳۶ء بکرمی سال کا سن عیسوی اسطرح معلوم کیا جائے گا۔ ۲۰۳۶۔۵۶۔۱۹۸۰ء۔"[۵۲]

بکرماجیت نے اپنے عہد میں علم وفضل کی ترقی اور علماد وماہرین فنون کی قدردانی اس قدر کی کہ اس کے دربار سے وابستہ نو یکتائے زمانہ افراد بکرماجیت کے "نورتن" کہلاتے تھے۔کالی داس بھی بکرماجیت کے نورتوں

میں شامل تھا۔ اس کے دور میں علم و فن کو بڑا فروغ ہوا اور بڑے بڑے ریاضی دان اور ہیت دان پیدا ہوئے۔ ہندوئوں کی تاریخ میں یہ دور عہد زرین کہلاتا ہے۔

افسر صدیقی امروہوی اس کتاب کے پیش لفظ میں بکرماجیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

" بکرماجیت سے متعلق دیگر بہت سی کہانیوں کی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک ایسا تخت بنوایا تھا جس کو بتیس پتلیاں اٹھائے ہوئے تھیں۔ وہ پتلیاں نہ صرف بول سکتی تھیں بلکہ علم و حکمت کے رموز سے بھی واقف تھیں۔ اور اچھے اخلاق کا درس دیتی تھیں"۔ (۵۳)

اس روایت کو بنیاد بنا کر یہ کہانی لکھی گئی تھی۔ بتیس کہانیوں کا یہ مجموعہ "سنگھاسن بتیسی" کے نام سے تاریخ اردو ادب میں مشہور ہوا۔ بنیادی طور پر یہ قصہ سنسکرت زبان میں تھا۔ مگر شاعر کی مقبولیت کا اندازاس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس نثری قصے کو بارہویں صدی میں ایک دکنی شاعر نے دکنی زبان میں منظوم کیا۔

شاعر کا تعارف:

افسر امروہوی انجمن ترقی اردو پاکستان کے مخطوطات کی فہرست مرتب کرتے ہوئے "سنگھاسن بتیسی" کے مصنف کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

مصنف کا تخلص فقیر ہے جو کئی موقعوں پر نظم ہوا ہے۔ حمد کے اختتام پر یوں ہے کہ:

فقیر عاصی بندوں میں پر عیب ہے
تو بخشا ئیو عالم الغیب ہے

ایک اور جگہ

فقیر اب یہاں ختم کر داستاں
کہو بھوج راجا کا آگے یہاں (۵۴)

سنگھاسن بتیسی" کا نام ایک جگہ مصنف فقیر دکنی نے "قصہ بیر بکرم" نظم کیا ہے:

کیا دکھنی بولی میں اس کو تمام
قصہ "بیر بکرم" رکھا اس کا نام (۵۵)

افسر امروہوی کے مطابق

"فقیر کا نام اور اس کے حالات کا علم نہ ہو سکا۔"(۵۶)

راقمہ کو تذکرہ چمنستان الشعرا میں ایک فقیر نامی شاعر کا مختصراً تعارف دستیاب ہوا جو کہ جوں کا توں رقم کیا جاتا ہے۔

> "فقیر میر ہاشم۔ بڑے خاندانی اور شاہ سامی کے یاروں میں ہیں۔ راقم سے ربط خاص رکھتے ہیں کبھی کبھی فقیر خانہ پر بھی تشریف لاتے ہیں۔"(۵۷)

اورنگ آبادی کے شعرا کے ضمن میں شیخ چاند حسن کا ایک مقالہ مجلہ عثمانیہ میں شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے اورنگ آبادی شعرا کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

> "مرحوم نے اورنگ آبادی شعرا کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۱۰۰ھ تا ۱۱۴۰ھ، جس میں ولی بابائے ریختہ اور ان کے معاصرین شامل ہیں۔ دوسرے دور ۱۱۴۰ھ تا ۱۱۸۰ھ میں سراج اور ان کے معاصرین جن میں اہم شعرا، داؤد، سراج، فقیر خواجہ ایوب وغیرہ کے نام لکھے ہیں۔"(۵۸)

اس بیان سے ایک تو متذکرہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ فقیر، سامی کے معاصرین میں سے تھے اور سامی سراج کے معاصر تھے۔ لہٰذا فقیر نامی شاعر بارہویں صدی کا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اورنگ آباد دکن کا باشندہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اردو کی منظوم داستان" میں لکھتے ہیں کہ:

> "سنگھا بتیسی" سے متعلق ایک اور مثنوی مخطوطے کی صورت میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں موجود ہے۔ چونکہ ناقص الا آخر ہے اس لیے مصنف اور سن تصنیف کا سراغ نہیں ملتا۔ لیکن زبان و بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی دکنی شاعر کے زورِ طبع کا نتیجہ ہے۔"(۵۹)

ممکن ہے کہ ایسا ہی غیر مطبوعہ نسخہ انجمن ترقی اردو، پاکستان میں بھی موجود ہو جس کی تدوین افسر امروہوی نے کی ہے۔ مگر اس بیان سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نسخہ دکنی زبان میں نظم ہوا تھا۔

گوپی چند نارنگ "سنگھاسن بتیسی، بکرماجیت" کے عنوان سے اپنی کتاب "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" میں دکنی اردو کے منظوم نسخے کا تعارف یوں کراتے ہیں کہ:

> "لٹن لائبریری کا یہ نسخہ "یا فتاح" اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے صفحے پر یہ عنوان درج ہے: از اصل کتاب لالہ بھوری مل برائے دلچسپی خود در چھاپہ خانہ گمنام تحریر شد۔"(۶۰)

اس حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی اردو میں ایک سے زائد نسخے منظوم ہوئے۔

وجہ تصنیف:

افسر امروہوی "فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو" میں سنگھاسن بتیسی" کی وجہ تصنیف کے ضمن میں مصنف کی رائے کو یوں بیان کیا ہے:

اول دور میں جو ہوئے راوایاں
قصہ ہندوی میں کٹے ہیں بیاں
بیاں بیر بکرم کا کہہ کر تمام
سنگھاسن بتیسی رکھا اس کا نام
جہانگیر کے وقت میں یہ کتاب
کئے ترجمہ فارسی میں صواب
یہ تصنیف در وقت اورنگ زیب
قدیمی زبان پہ کیا ہے فریب
جو اس شاہ عالم کے اب دور میں
یہ دکھنی زبان میں کیا غور میں
نثر کی نظم کر کے تصنیف میں
کیا بیر بکرم کی تعریف میں
اگر دل کسی کا جو ہوئے اداس
پڑے یہ کتاب اپنے دل سے قیاس (۶۱)

سنگھاسن بتیسی اختتامی اشعار:

"ہے بندوں میں بندہ یہ کمتر فقیر
کہا جس نے یہ قصۂ بے نظیر
جو رکھ شوق نامہ کرے سیر او
پڑے حق میں منجہ فاتحہ خیر او
یہہ نامیکوں یاں میں کیاں ہوں تمام
محمدؐ پو پڑھ کر درود و سلام (۶۲)

ترقیمہ نہیں ہے آخر میں "تمت شد" لکھا ہے اور اس کے متصل ایک مستطیل مہر ہے جو کتاب کی ابتدا میں بھی ہے۔ مہر کے الفاظ یہ ہیں۔ "محمد سراج الدین است، ۱۲۵۶ھ "(۶۳)

فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو میں افسر امروہوی کے مطابق " فقیر کچھ زیادہ پڑھا لکھا معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس نے جابجا مضحکہ خیز غلطیاں کی ہیں۔ "(۶۴)

مگر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ آج سے تقریباً چھ سو سال قبل جب زبان مختلف چولے بدل رہی تھی اور ارتقائی مدارج طے کر رہی تھی ایسے میں قواعد اور علم البیان کی پابندی کی امید رکھنا بے جا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت زبانِ اردو ارتقائی مراحل میں تھی اور قواعد اور قوانین شعری وضع نہیں ہوئے تھے۔ ہاں! مگر شاعری میں جن قواعدِ ہندی یا قواعد فارسی کی تقلید کی جاتی تھی۔ فقیر دکنی نے ان کا بھی خاطر خواہ خیال نہیں رکھا۔ اس کی ایک وجہ اس کی کم علمی بھی ہو سکتی ہے۔ افسر صدیقی لکھتے ہیں"وہ حروفِ صحیح کا سقوط جیسے عیب سے بھی نہیں بچ سکا۔ حروف قافیہ کے قواعد کی پابندی سے اکثر وبیشتر گریز کیا گیا ہے۔ "(۶۵)

وہ حاجب کیا کونچہ نامہ لے خاص

دیا جاکے نامہ وہ راجہ کے پاس

اس ظعر میں "س" اور "ص" کو قافیہ میں استعمال کیا گیا ہے جو کہ قواعد شعری کی رو سے غلط ہے۔ اس طرح "ر" کے ساتھ "ڑ" اور "ت" کے ساتھ "ط" کا قافیہ استعمال ہوا ہے۔

مگر راقمہ کی رائے میں یہ تقریباً دوڈھائی سو سال قبل کی زبان کا نمونہ ہے۔ اس زمانے میں زبان ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ قدیم ادب کے تقریباً تمام ادب پاروں میں اس قسم کے اسقام نہایت عام ہیں۔ ہم قدیم ادب کو جدید ادب کے قواعد پر نہیں پرکھ سکتے۔ قدیم ادب پاروں کی تفہیم کے لیے ہمیں اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کو بھی مد نظر رکھنا ہو گا۔ ایک ایسی زبان جو کہ بتدریج ارتقاپذیر ہے ہم تشکیلات لفظی اور قواعد کی پابندیوں کی امید نہیں کر سکتے۔

مگر یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قدیم ادب میں یا تو ہندوی روایت کے تحت ادب تخلیق ہوا یا پھر فارسی روایت کی پاسداری ہوئی۔ بلکہ شاعری میں تو خصوصاً فارسی قواعد کو ہی مد نظر رکھا گیا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ "سنگھاسن بتیسی" کے شاعر فقیر دکنی نے ان روایات کا بھی کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی جیسے اصول فارسی شاعری کی بنا تصویر کیے جاتے ہیں۔ مگر سنگھاسن بتیسی کے منظوم مرقعے میں یہ اصول وضوابط خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

افسر امروہوی کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ مصنف فقیر نے مختلف اجزائے ترکیبی اور حرکات وسکنات میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کیں ہیں۔

تب اس سوداگر نے سواس مرد کو

بلوا بھیجا اس چور بیدرد کو

یا یہ مثال دیکھیں:

کیا راجہ کس واسطے تو ہنسی

ترے خیال میں جا سرت سے پھنسی (۶۶)

مصنف کی کم علمی کی دلیل ایک ناقص روایت بھی ہے جو اس نے شعر کی صورت میں نظم کی ہے۔

وہ قادر نے قدرت کا بوجھا یقین

رکھا اک مچھر کے اوپر سر زمین (۶۷)

اس قسم کی کوئی روایت ہماری نظر سے تو نہیں گزری البتہ بعض ہندوئوں کے عقیدے کے مطابق دنیا گائے کے سر پر ٹھہری ہوئی ہے۔ مگر مچھر کے سر پر دنیا کا ہونا سمجھ سے بالا ہے۔

دوسری بات جو مصنف کی ناقص الاعلمی کی دلیل ہے کہ متذکرہ داستان "سنگھاسن بتیسی" راجا بکرماجیت سے متعلق ہے جس کا عہد تقریباً ساڑھے سولہ سو سال قبل کا ہے۔ گویا ظہور الاسلام سے دو سو سال قبل کا، مگر اس شعر میں "ہندو مسلمان" کا ذکر دیکھیں۔

"خوشحالی سب ہندو مسلمان میں

رعیت سبھی امن وآمان میں" (۶۸)

لسانی تجزیہ:

مصنف نے بعض ایسے عسیر الفہم الفاظ استعمال کیے ہیں جو نہ صرف اب متروک ہو چکے ہیں بلکہ بعض کے معنی بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ جیسے:

سے بے انتہا اس کو کیوں بوجھنا

سو کیوں آسماں بونٹ سے موچنا (۶۹)

مذکورہ شعر میں مستعمل لفظ افسر امروہوی کے مطابق عسیر الفہیم ہیں۔ مگر راقمہ کی کم ترین رائے کے مطابق یہ ایک محاورہ ہے۔ انگلی سے زمین کو کھودنا۔ گویا ناممکن کام... یہاں اسی مناسبت سے مصنف یہاں بے حد

مشکل یا ناممکن کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں کہ آسمان کو انگلی کے پور سے کھودا نہیں جا سکتا، یا سر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اس کا بوجھنا بھی ناممکن ہے۔ بہر حال "بونٹ" اب اردو زبان میں "سبز کچے چنے" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جبکہ مصنف نے اسے "انگلی کے پور" کے معنوں میں نظم کیا ہے۔

اس کے علاوہ مصنف نے قواعد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کی ہیں۔

رکھے چار شاہد بہت ہوشیار
دیا اپنے گھر سے زر ان کو بسیار (۷۰)

اس شعر میں "بسیار" کی "یا" کو مخلوط کیا ہے جبکہ "یا" ایک مستقل حرف کی صورت میں تھی۔

تب اس سوداگر نے سو اس مرد کو
بلوا بھیجا اس چور بیدرد کو (۷۱)

یہاں "بلوا" کے بجائے "بلا بھیجا" ہوتا تو بہتر لفظ کے ساتھ پڑھا جا سکتا تھا۔ اسی طرح ایک شعر میں شعر کا وزن برقرار رکھنے کے لیے لفظ "شکل" کو "شکیل" کر دیا ہے۔ مگر ناچیز کی رائے میں اس سے شعر کے معنوں میں فرق نہیں آتا۔

یہ تن کی نہیں معتبر ہے دلیل
ہے سرکردہ دنیا دلنیں خوش شکیل (۷۲)

اسی طرح ایک شعر میں مصنف فقیر دکنی نے "چاہتا" کو "چہتا" نظم کیا ہے۔ مگر قدامت زبان میں اتنی چھوٹ دینا تو روا ہے۔

کبھی پتلی اے بے خبر لے خبر
تو چہتا ہے اب بیٹھنے تخت پر (۷۳)

مگر بعض جگہ نہایت نادر الفاظ بھی بہت خوبی کے ساتھ نظم کیے ہیں جیسے:

جو اس سار کی کوئی خدمت کرے
قدم تخت اوپر دھرے (۷۴)

اس شعر میں "سار" عسیر الاستعمال لفظ ہے مگر بہت درست استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی "طریقے" یا "طرح" کے ہیں۔

افسر صدیقی "سنگھاسن بتیسی" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ:

"غروری کے باعث عبادت گئی
نہ راضی ہوا حق عبادت گئی (۷۵)

اس بیت میں کرنا کا ماضی مطلق، "کری" نہیں لکھا گیا۔ بلکہ کئی نظم کیا گیا ہے۔ "کئی" انھی معنوں میں سندھی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔" (۷۶)

افسر صدیقی نے یہاں خود ہی اپنے اعتراض کا جواب دے دیا ہے کہ "کئی" سندھی زبان میں انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دکھنی زبان میں سندھی اور مراٹھی زبان کے علاوہ دیگر زبانوں کے مستعمل الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ جس کی وجہ دکن میں مختلف الاقوام لوگوں کا یکجا ہونا تھا اور دوسری بات کہ ہم پہلے بھی اس طرح اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ زبان اردو کا ارتقائی دور تھا۔ جہاں لفظ اور ان کی ہیئت و معنی بنتے بگڑتے رہتے ہیں اور یہی تغیر پذیری بالآخر ایک شکل اور معنی پر جا ٹھہرتی ہے۔ اس طرح لفظ کا تعین ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا شعر میں مصنف نے "گئی اور کئی" کو محض ہم آواز ہونے کی بنا پر قافیہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ قافیہ کے استعمال کی ایک اور مثال دیکھیں:

وہ حاجب کیا کونچہ نامہ لے خاص
دیا جا کہ نامہ وہ راجہ کے پاس (۷۷)

اس شعر میں بھی "خاص" اور "پاس" کا قافیہ محض ہم آواز ہونے کی بنا پر کیا گیا ہے۔ اس طرح جابجا اشعار میں "ر" اور "ڑ" کا قافیہ اور "ت" اور "ط" کو ہم قافیہ نظم کیا گیا ہے۔ اس خصوصیت کو قدامت اور تاریخی اہمیت کے حوالے سے لسانی ارتقا کی ابتدائی کڑی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ منظوم ترجمہ اس دور کی تصنیف ہے جسے شاہ عالمی دور کہا جاتا ہے۔ یہ عہد ۱۱۷۳ھ سے ۱۲۳۰ھ کو محیط ہے۔

افسر صدیقی امروہوی "پیش لفظ" کے اختتام میں لکھتے ہیں کہ:

"سنگھاسن بتیسی کی داستانی حیثیت سے قطع نظر یہ قدیم اردو کے اس دور کی یادگار ہے جو شاہ عالمی دور کہلاتا ہے اور جو ۱۱۷۳ھ تا ۱۲۳۰ھ تک ہے۔ شمالی ہند میں اس دور کے مستند شعرا شاہ حاتم، خواجہ میر درد اور مرزا جانجاناں موجود تھے جو اردو کو بہت شستہ و رفتہ بنا چکے تھے۔ سنگھاسن بتیسی کے مصنف کی زبان اس درجے تک نہیں پہنچ سکی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شمالی ہند کی وہ زبان جو حملہ آوروں کے ذریعے دکن میں پہنچی تھی نسبتاً ترقی و اصلاح کی ان منازل سے ابھی تک محروم تھی جو شمالی ہندوستان کی زبان تھی۔" (۷۸)

جیسا کہ مصنف کے تعارف کے ذیل میں اس مقالے میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ مصنف شاہ قاسم، سراج اور سامی کا ہم عصر تھا۔

سخاوت مرزا اپنے مقالے "شاہ قاسم علی قاسم اورنگ آبادی" کے صفحہ نمبر ۲۹ پر لکھتے ہیں کہ مجلہ عثمانیہ ۱۳۳۷ھ / ۱۹۲۷ء میں شیخ چاند مرحوم نے ایک مقالہ بعنوان "اورنگ آباد اور اردو شاعری" لکھا جو مجلہ عثمانیہ سے طبع ہوا تھا۔ میں شیخ چاند نے اورنگ آبادی شعرا کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور ۱۱۰۰ھ تا ۱۱۴۰ھ جس میں بابائے ریختہ ولی اور ان کے معاصرین، دوسرے دور ۱۱۴۰ھ تا ۱۱۸۰ھ میں سراج اور ان کے معاصرین جن میں اہم شعرا، دائود، سراج، سامی، فقیر، خواجہ اور ایوب وغیرہ کے نام لکھے ہیں۔ یہ تمام شعرا وہ ہیں جو شاہ قاسم علی قاسم کے ہم عصر ہیں۔ جنھوں نے ایہام گوئی کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خصوصاً شاہ قاسم اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی اس قبیل کے سرخیل تھے۔ شمالی ہند میں مرزا مظہر تاباں، یقین اور شاہ حاتم، خواجہ میر داد وغیرہ نے شاعری کو جس عروج کمال پر پہنچایا۔ دکن میں شاہ قاسم اور سراج نے یہ کام سرانجام دیا۔ گویا دکنی شعرا کسی طور شمالی ہند کے شعرا سے کم نہ تھے۔ اس بیانیہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں اردو زبان خصوصاً جنوبی ہند میں مستحکم ہو چکی تھی۔ لہٰذا افسر امروہوی کے اس بیان سے کہ اس وقت شمالی ہند کی زبان ترقی یافتہ تھی اور دکن کی زبان ترقی واصلاح کی منازل سے محروم تھی کچھ قابل یقین نہیں لگتی۔

فقیر اس دور کا شاعر ہے جس میں اس کو غلام قادر سامی، عزلت، سراج اور شاہ قاسم جیسے شعرا کی رفاقت میسر رہی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فقیر دکنی کم علم ہو سکتا ہے مگر شاعرانہ اوصاف سے یکسر خالی نہیں ہو سکتا اور پھر فقیر دکنی کا یہ منظوم قلمی نسخہ ایک عرصہ تک غیر مطبوعہ رہا۔ اس صورت میں الفاظ وبیان کی تبدیلی میں کاتب کا بھی اہم کردار رہا ہو گا۔ جس کا اظہار سنگھاسن بتیسی کے پیش لفظ میں افسر امروہوی نے خود کیا ہے۔

مختصراً یہ کہ "سنگھاسن بتیسی" کی قبولیت عامہ نے ہی مصنف کو ایسے منظوم کرنے کی طرف راغب کیا ہو گا۔ متذکرہ تصنیف کے دیگر زبانوں میں بے شمار تراجم ہو چکے ہیں۔

گوپی چند نارنگ نے "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" میں سنگھاسن بتیسی کے تراجم کے بارے میں کہا ہے کہ گارساں دتاسی نے اپنی تصنیف "تاریخ ادبیات ہندوی وہندوستانی" میں "سنگھاسن بتیسی" کا ماخذ سنسکرت تصنیف "وکرماچرترم" کو قرار دیا ہے۔ جبکہ ایتھے نے سنسکرت نسخے کا نام "سہناسن ادواترنشتی" بتایا ہے جبکہ اردو کے علاوہ فارسی، فرانسیسی، جرمن اور انگریزی میں بھی سنگھاسن بتیسی کے متعدد تراجم ہو چکے ہیں۔

۱۔ برج بھاشا میں سنگھاسن بتیسی کو سندر داس کشبیر نے ۱۶۳۱ء میں ترجمہ کیا۔

۲۔ جرمن ترجمہ جاگ ۱۸۶۸ء میں کیا۔

۳۔ فرانسیسی زبان میں ترجمہ ۱۸۱۷ء میں Boron Lescallier نے کیا جو نیویارک سے شائع ہوا۔

۴۔ R. Roth نے سنگھاسن بتیسی کا خلاصہ ژورنال ۱۸۴۵ء میں پیش کیا تھا۔

۵۔ انگریزی میں تراجم Miss Busk اور ایڈگرٹن نے کیے ہیں۔

۶۔ فرینکلسن ایڈگرٹن نے چار مختلف نسخوں کی مدد سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ اور یہ ترجمہ سنسکرت متن کے ساتھ ہارورڈ اورینٹل سریز کے تحت ۱۹۲۶ء میں دو حصوں میں شائع ہوا تھا۔

۷۔ سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ منگولی زبان میں "ارجی بورجی خان" کے نام سے کیا گیا۔

اردو زبان میں کیے گئے سنگھاسن بتیسی کے وہ تراجم جو برصغیر کے مختلف علاقوں میں مختلف زمانوں میں ہوئے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۸۔ "سنگھاسن بتیسی" کا ایک ترجمہ جو کہ قدیم دکھنی زبان میں ہے۔ بارہویں صدی ہجری سے قبل کی تصنیف ہے۔ جس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ مخطوطہ نمبر ۹۱ میں موجود ہے۔ اس نسخے کے مصنف نے خود اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس نے یہ قصہ "چترَ بھج داس کی فارسی سنگھاسن بتیسی بہ نام "شاہ نامہ" سے ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کا مصنف نامعلوم ہے۔

۹۔ ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج کے تحت کاظم علی جوان اور للولال کوی نے سنگھاسن بتیسی کو برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔

۱۰۔ برٹش میوزیم لندن میں بارہ بنکی سے ۱۹۰۳ء کا چھپا ہوا ایک ایڈیشن محفوظ ہے۔

۱۱۔ سنگھاسن بتیسی (اردو نثر) واجادر گا پرشاد، آگرہ ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔

۱۲۔ سنگھاسن بتیسی مصور (اردو نثر) مصنف نامعلوم، نول کشور، لکھنو سے شائع ہوا اور اس نسخے کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۳۔ سنگھاسن بتیسی (اردو نثر) از عبداللہ فرضی نے ترجمہ کیا۔

۱۴۔ آسان، سلیس اور عام فہم اردو میں مجنوں گورکھپوری نے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کیا جو ۱۹۴۱ء میں لکھنو سے شائع ہوا۔

سنگھاسن بتیسی کے متعدد تراجم منظوم شکل میں مختلف زبانوں میں بھی کیے گئے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ سنگھاسن بتیسی بکرماجیت (قلمی) مصنف نامعلوم (شاگرد میر درد) سن کتابت ۱۲۶۷ھ اوراق ۹۱، لٹن لائبریری، علی گڑھ کا مخزونہ ہے۔ نشان نمبر ۱۱۵ ہے۔

۲۔ "ویر بکرم (قلمی) نامی نسخے کے مصنف کا بھی پتہ نہیں اور نہ ہی سن تصنیف درج ہے۔ یہ قلمی نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کا مخزونہ ہے۔ نشان نمبر ۴۹ / ۲۰۴ ہے۔ اس قلمی نسخے کا مصنف جو کہ گوپی چند نارنگ کے نزدیک نامعلوم ہے۔ یہ ہی قلمی نسخہ "فقیر دکنی" نامی کم معروف شاعر کی کاوش ہے۔ جو زیر نظر مقالہ کا ایک حصہ ہے۔ فقیر دکنی کا مختصر تعارف اس جز کے ابتدائی حصہ میں شامل ہے۔

۳۔ منشی منسارام ناتواں کے بارے میں روایت ہے کہ ناتواں نے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ اردو منثوی میں کیا تھا۔

۴۔ منشی رنگ لال چمن نے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ اردو میں کیا یہ ترجمہ مثنوی کی صورت میں، نول کشور، کانپور سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔

۵۔ سنگھاسن بتیسی کو رنگین لال متخلص بہ رنگین نے لکھا جو مطبع اودھ اخبار لکھنو، سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

۶۔ سنگھاسن بتیسی از مکھن لال۔

اس کے علاوہ فارسی میں بھی داستان کے دس (۱۰) تراجم ملتے ہیں۔ تراجم کے اس تعدد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ داستان اپنے زمانے میں کسی قدر قبولیت عام رکھتی ہوگی۔

"سنگھاسن بتیسی" کے ذیل میں گیان چند "اردو کی نثری داستانیں" میں لکھتے ہیں کہ:

> "سنگھاسن بتیسی کا منگولی زبان میں ترجمہ "ارجی بورجی خان" کے نام سے ہوا۔ مراٹھی میں جین منی شیمانکر نے ترجمہ کیا۔ بنگالی میں "وترس سنگھاسن" کے نام سے ۱۸۱۸ء میں سیرام پور میں ہوا۔"[۷۹]

فارسی تراجم کی تفصیل گیان چند کے مطابق درج ذیل ہے:

۱۔ شاہنامہ از چتر بھج داس کائیسھ۔ اکبر کے عہد میں۔

۲۔ نامۂ خردافزا۔ از عبدالقادر بدایونی۔ ۹۸۲ھ۔ نظر ثانی ۱۰۰۳ء

۳۔ از بھاڑامل کتھری ۱۰۱۹ھ سنسکرت سے

۴۔ ق لبب رائے ابن ہر کرن داس نے ۶۲۔۱۰۶۱ھ میں چتر بھج اور بھاڑامل کے تراجم کو ملا کر مرتب کیا۔

۵۔ کشن بلاس از کشن داس باسدیو تنبولی صوبہ لاہور برٹس میوزیم فارسی مخطوطات کی فہرست کے مطابق یہ عہد اورنگ زیب۔ انڈیا آفس فارسی مخطوطات کے مرتب کے بقول بہ عہد جہانگیر۔

۶۔ ق از چاند ابن مادھورام (کوپن ہیگن)

۷۔ ق مثنوی گل افشاں از قاسم کاہی

۸۔ ق مفتاح القلوب از عباد اللہ ۱۰۳۵ھ آصفیہ لائبریری میں موجود۔

۹۔ از سید امداد علی و شیو سہائے کائستھ۔ پہلی کے حکم سے ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔

۱۰۔ فارسی خلاصہ برٹس میوزیم میں۔ مترجم کا نام مذکور نہیں۔

۱۱۔ قدرے مختلف انڈیا آفس میں۔

۱۲۔ کیمبرج میں۔ مصنف نامعلوم۔ بحوالہ فہرست فارسی مخطوطات انڈیا آفس

۱۳۔ ق کان وجود نظم۔ سالار جنگ کتب خانہ میں

۱۴۔ ق نثری ترجمہ مکتوبہ ۱۲۲۵ھ۔ بحوالہ فہرست عربی فارسی اردو مخطوطات بمبئی یونیورسٹی۔"

قابل ذکر بات یہ ہے کہ گیان چند نے زیر تذکرہ مخطوطہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ صفحہ نمبر ۳۹۵ پر لکھتے ہیں:

"۲۔ مثنوی ویر بکرم از فقیر در عہد شاہ عالم۔ صاف دکنی زبان انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۵ئ۔"(۸۰)

بے شمار زبانوں میں سنگھاسن بتیسی کے مختلف ادوار میں کیے گئے تراجم اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ عوام الناس میں کس قدر مقبول تھی۔ مگر لسانی تجزیہ اس کی قدامت کے علاوہ لسانی ارتقا کی بھی اہم کڑی ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔

د) "نوسرہار" از شاہ اشرف بیابانی:

سولہویں صدی کے آغاز میں جب بہمنی سلطنت زوال پذیری کی طرف مائل تھی اور شہاب الدین محمود کی حکومت کوئی دن کی بات تھی اس سیاسی منظر نامے سے قطع نظر اشرف بیابانی اپنی شہرہ آفاق منظوم تصنیف "نوسرہار" کی تکمیل میں مصروف تھا۔ ۱۵۰۳ء مطابق ۹۰۹ھ میں مکمل ہونے والی یہ تصنیف دکنی رثائی ادب کا نقش اول قرار پائی۔ "نوسرہار" کے سن تصنیف کی دلیل خود اشرف کے درج ذیل دو مصرعے ہیں:

"ہجرت بنی نو سو نو۔"

اور

"کہیا اشرف نوسریو۔"(۸۱)

"نو سرھار" بہمنی دور کے آخری سالوں کا لسانی اور شعری تجربہ ہے۔ یہ مثنوی ۹ ابواب پر مشتمل ہے اسی لیے اسے نوھاروں کی تصنیف سمجھا گیا ہے۔"[۸۲]

"نو سرھار" کی لسانی اہمیت سے زیادہ قدامت قابل توجہ ہے۔ جس نے اس کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ اگرچہ "نو سرھار"، "کدم راؤ پدم راؤ" کے بعد کی تخلیق ہے۔ مگر رثائی ادب میں اس کو اولین حیثیت اس لیے بھی دی جاتی ہے کہ اب تک کے دستیاب ادب پاروں میں بہمنی دور کی یہ دو ہی تصانیف قابل ذکر ہیں۔ اشرف سے قبل کسی ایسے شاعر کا کوئی حوالہ نہیں ملتا جس نے واقعات کربلا کو اردو زبان میں نظم کیا ہو۔ ہاں البتہ اس حوالے سے "اوفتہ الشہدائ" کا ذکر کیا جاتا ہے جس کے مصنف کمال الدین بن علی واعظ کاشفی ہیں۔ مگر یہ تصنیف فارسی زبان میں ہے۔ اردو مرثیہ نگاری کی معلوم تاریخ میں "نو سرھار" ہی اولیت کے درجے پر فائز ہے۔ تبسم کاشمیری اردو ادب کی تاریخ میں لکھتے ہیں "نو سرھار" لسانی نقطہ نظر سے تاریخی اہمیت کی چیز ہے اور سرزمین دکن میں اہل بیت سے محبت کے اظہار کا اولین شعری نقش ہے۔"[۸۳]

دکن میں اعزاداری کی روایت سلطنت بہمنیہ کے قیام کے ساتھ ہی رواج پانے لگی۔ بہمنی دربار کی شان وشوکت، حکمرانوں کی طرف سے اہل علم وہنر کی قدر دانی، برصغیر کے دیگر حصوں میں امن وامان کی غیر یقینی صورت حال اور سیاسی شکست وریخت نے دکن کو جنوبی ہند کا پرکشش اور پر امن مقام بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ دبیل، گوا اور مالابار کی بندرگاہوں سے تاجروں کی آمد ورفت نے ایرانی ثقافت کے لیے جنوبی ہند میں گنجائش پیدا کر کے شعیہ مذہب کی راہیں ہموار کیں۔

مختلف جغرافیائی عوامل کے باعث ایرانیوں کی کثیر تعداد جنوبی ہند میں سکونت پذیر ہو چکی تھی۔ بہمنی سلاطین نے بھی شعیت کو رواج دیا۔ ایسے میں عزاداری کی محافل کا انعقاد بعد از قیاس نہیں اور یقینا ان محافل میں مراثی اور نوحے بھی پڑھے جاتے ہوں گے۔

اس تاریخی اور تہذیبی تناظر میں دکن کا پہلا مربوط رثائیہ شعری مجموعہ تصنیف ہوا۔ "اس مثنوی کی فنی ترتیب، مربوط رثائیہ تاثرات کی پیشکش اور ربط بیان کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "نو سرھار" سے قبل بھی دکنی زبان میں واقعات کربلا نظم کیے گئے ہوں گے۔"[۸۴]

بحیثیت مجموعی بہمنی دور کے اردو ادب کا طائرانہ جائزہ لینے پر ہمیں تین قسم کے موضوعات نظر آتے ہیں اول کسی دیومالائی داستان یا روایتی کہانیوں کو پند ونصاح کی شیرینی میں ڈبو کر شعری یا نثری صورت میں تصنیف کرنا جب کہ ثانیاً تاریخی واقعات کو بنیاد بنا کر عوام الناس کی دلچسپی کے لیے رنگینی بیان کے ساتھ نظم کرنا جس میں اکثر

اصل واقعات کہیں کھو جاتے تھے صرت رنگین بیان ہی رہ جاتی تھی۔ جبکہ تیسرا موضوع صوفیا کا وہ کلام تھا جو، رشد وہدایت کی خاطر طالب علموں کے لیے تخلیق کیا گیا۔

بہمنی دور کی شاہکار مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں بھی فخر دین نظامی نے ایک روایتی کہانی کو پیش کیا ہے۔ جو اپنے عہد کے معاشرتی اور مذہبی نظریات وعقائد کی عکاس ہے۔ اس مثنوی کا زمانہ تصنیف احمد شاہ دولی بہمنی کا عہد تھا جو کہ ۱۴۴۲ ائ۔ ۱۴۳۵ء مطابق ۸۲۶ھ تا ۸۳۹ھ تک تھا۔ احمد شاہ ولی کی شان میں کہے گئے اشعار مثنوی کے زمانہ تصنیف کی دلیل ہیں۔

بہمنی عہد کی تصانیف "کدم راؤ پدم راؤ" کی تصنیف کے بعد طویل عرصے تک کوئی قابل ذکر ادبی شاہکار دستیاب نہ ہو سکا۔ قیاساً اس عرصہ میں کچھ نہ کچھ تو تخلیق ہوا ہو گا مگر شاید دست بردِ زمانہ سے ان ادب پاروں تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہو سکی۔ اس دور میں ادبی تاریخ میں ایک پر سکوت خلا نظر آتا ہے۔

ستر اسی برس کے بعد کے عہد کی اشرف بیابانی کی تین مثنویاں دستیاب ہوئیں۔ جن میں "نو سرھار"، "لازم المبتدی" اور "واحد باری" شامل ہیں۔ جن کا عہد تصنیف ممکنہ طور پر ۱۵۲۸ء تک کا ہو سکتا ہے۔

شاعر کا تعارف (۱۴۵۹ء۔۱۵۲۸ء)

شاہ اشرف بیابانی کی ابتدائی تعلیم کے حوالے سے متعدد روایات ملتی ہیں ڈاکٹر نور الحسن نقوی 'تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں کہ

"سید شاہ اشرف بیابانی خضر آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد رشد وہدایت میں مشغول ہوئے ان کی تین تصانیف دستیاب ہیں۔ لازم المبتدی، واحد باری اور نو سرھار۔"(۸۵)

شاہ یشرف ایک روحانی نسبت رکھتے تھے۔ ان کا تعلق انیتس واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ "سید شاہ اشرف بیابانی خانوادہ رفاعیہ کے گل سرسبد تھے ان کا سلسلہ نسبت گیارہ واسطوں سے سلطان العارفین ابو العباس احمد کبیر رفاعی معشوق اللہ سے، اور انیتس واسطوں سے حضرت علی سے ملتا ہے۔"(۸۶)

تبسم کاشمیری اردو ادب کی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "اشرف بیابانی ۱۴۵۹ء / ۸۶۴ھ میں ایک روایتی عالم خاندان میں علائو الدین ہمایوں شاہ کے دور میں پیدا ہوا۔"(۸۷)

خواجہ حمید الدین شاہد "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند" کے نویں باب میں لکھتے ہیں کہ "سید شاہ اشرف نام اور اشرف تخلص ہے۔ اشرف کی ولادت ۱۴۵۹ء / ۲ ذیقعدہ ۸۶۴ھ میں فقرا تاد تعلقہ انبڑ ضلع اورنگ آباد (دکن) میں ہوئی۔" (۸۸)

اشرف بیابانی کی ولادت کے بارے میں سخاوت مرزا اپنے مقالے بعنوان "قدیم مثنوی، نوسرہار" میں لکھتے ہیں کہ "اشرف کے والد سید شاہ ضیاالدین بیابانی تھے۔" (۸۹)

ڈاکٹر زور "نوسرہار" کے مصنف کے نام کے بارے میں کہتے ہیں کہ "نوسرہار کے شاعر کا نام شیخ اشرف الدین ہے۔ جبکہ نصیر الدین ہاشمی نے شیخ محمد اشرف بتایا ہے۔" (۹۰)

مگر اشرف کا درست نام "سید شاہ اشرف بیابانی ہے" متذکرہ کتاب کے مقدمے میں افسر صدیقی امروہوی شاہ اشرف بیابانی کے حالات کے ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

> "حضرت مخدوم شاہ اشرف بیابانی دوسری ذیقعدہ ۸۶۴ھ کو بروز دوشنبہ بوقت ظہر فقر آباد میں تولد ہوئے۔ آپ کی عمر شریف تعلیم کے قابل ہوتے ہی حضرت والد ماجد قبلہ نے ابتدائی تعلیم دینی شروع کر دی۔ اس کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی تعلیم بھی حضرت والد بزرگوار ہی سے ہوئی۔ پھر حقائق و معارف کی تعلیم بھی والد ماجد قبلہ ہی سے پائی چونکہ آپ ابتدا ہی سے صوم وصلوٰۃ اور طہارت و تقوی کے بڑے پابند تھے۔ پورے عابد وزاہد پرہیز گار و متقی تھے۔ اس لیے اپنے والد ماجد قبلہ کے مرید ہو کر عبادات وریاضیات شروع کر دیں اور کثیر مجاہدات و مراقبات کرتے ہوئے سلوک کو ختم کر لیا اس سے والد ماجد بہت خوش ہوئے۔ آپ کو اور آپ کے ساتھ چاروں بھائیوں کو ۸۹۵ھ میں خلافتیں عطا فرمائیں اور آپ بعد وفات والد ماجد مسند آرائے سجادگی ہوئے۔" (۹۱)
>
> افسر صدیقی کی تحقیق کے مطابق "پنج گنج" نامی کتاب جو کہ شاہ اشرف بیابانی کے ایک پوتے کی تصنیف ہے۔ (۹۲)

میں نہ صرف شاہ ضیاالدین بیابانی اوران کے فرزند شاہ اشرف بیابانی کے مفصل حالات درج ہیں بلکہ شاہ اشرف بیابانی کی تصانیف کے ذیل میں "نوسرہار" کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اس مولف کی ایک اور کتاب "ضیائے بیابانی" میں اس خاندان کے دوسرے نامور اصحاب کے حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔ شاہ اشرف کے حالات جو افسر صدیقی نے مقدمے میں شامل کیے ہیں اسی کتاب "ضیائے بیابانی" سے ماخوذ ہیں۔

شاہ اشرف بیابانی کے بارے میں افسر صدیقی کہتے ہیں کہ "شاہ اشرف احمد نگر کے رہنے والے تھے۔"(۹۳)

مزید یہ کہ:

"نو سرھار" دکنی تصنیف نہیں ہے اور اس کے مصنف کو بھی دکنی علاقے سے کوئی واسطہ نہیں۔"(۹۴)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فاضل مرتب نے یہ دعویٰ کیوں کر کیا۔ حالانکہ مصنف کا تعلق احمد نگر سے تھا اور احمد نگر نظام شاہی سلطنت میں شامل تھا اور بہمنی سلطنت میں دراصل پانچ وحدتوں میں تقسیم ہو کر خود مختار ریاستوں کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ احمد نگر کا علاقہ تقسیم ہونے سے قبل بہمنی سلطنت کا حصہ تھا اور بعد میں دکنی ریاست نظام شاہی کا حصہ بنا۔ نظام شاہی سلطنت ۱۴۹۸ء میں قائم ہوئی اور ۱۶۳۳ء تک باقی رہی۔

اشرف اشرف بیابانی کی پیدائش ۱۴۵۹ء میں ہوئی اور تقریباً ۵۴ برس کی عمر میں اس نے "نو سرھار" تصنیف کی۔ اس دوران بہمنی سلطنت منتشر ہو کر پانچ ریاستوں میں منقسم ہو گئی۔ یوں اشرف بیابانی کا قیام احمد نگر میں بھی رہا تو یہ سلطنت نظام شاہی کا مرکز تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشرف بیابانی کی تصنیف دکنی ادب میں شامل ہے۔

اس ضمن میں تبسم کاشمیری لکھتے ہیں کہ:

"سلطان شہاب الدین محمود کے تخت پر لرزہ طاری ہے اور اس زمانے میں کہ وہ سلطنت کا قائم ہو رہا ہے۔ اشرف بیابانی اپنی مثنوی "نو سرھار" ۱۵۰۳ئ / ۹۰۹ھ میں مکمل کر کے دکنی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔"(۹۵)

اب افسر صدیقی کا یہ دعویٰ کہ "نو سرھار" دکنی تصنیف نہیں ہے تو اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی وجوہات میں اولین وجہ اس کا اسلوب، محاورات اور الفاظ ہیں جن کی تصنیف "لسانی جائزہ" کے ذیل میں آئے گی مگر ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جہاں پنجابی اور گجراتی زبانوں کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

سگلے لوگن بیعت آن
راضی ان سوں ہوئے جان

اور

بہنا بھی اب وو ہی باٹ
سب کون جانا اوسی گھاٹ (۹۶)

مثنوی کے ابتدائی اشعار میں بھی دیگر زبانوں کے الفاظ دیکھے جاسکتے ہیں۔

اللہ واحد حق سبحان
جن یہ سر جیا بھوئیں آسمان
چندر سورج تارے روکھ
بادل بجلی مینہ اچوک

اور یہ اشعار

نبڑے اپنے دور از کوس
دشمن آہے یا کہ دوس (۹۷)

نوسرہار کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی زبان پر کس زبان کی چھاپ زیادہ ہے۔ اس میں گوجری، پنجابی، برج بھاشا، سندھی اور مراٹھی زبانوں کا ملا جلا اثر نظر آتا ہے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ احمد نگر کا بادشاہ نظام شاہ اپنے لشکر کے ساتھ جنگل میں سفر کے دوران مخدوم شاہ اشرف بیابانی کی ملاقات کے لیے آیا تو آپ نے سارے لشکر کو کھانا کھلایا۔ جنگل میں یہ مہمان نوازی باعث حیرت تھی۔ لہٰذا اس واقعہ کے بعد سے یہ مثال مشہور ہوگئی کہ "شاہ اشرف بیابانی، بھوکے کو بھوجن پیاسے کو پانی۔"(۹۸)

نظام شاہ احمد نگر کا بادشاہ تھا اور احمد نگر دکن میں شامل تھا۔ ہماری نظر سے گزارنے والی تمام تواریخ بھی نوسرھار کو دکنی ادب کا شاہکار ادب پارہ تسلیم کرتی ہیں۔ فاضل مصنف افسر امروہوی نے نہ جانے کیوں یہ نکتہ اٹھایا ہے۔ جب کہ تمام قرائین اس کے خلاف ہیں۔

جبکہ خواجہ حمید الدین شاہد کا بیان ہے کہ:

"ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد ضیا الحق والدین مخدوم سید شاہ ضیا الدین رفاعی بیابانی چشتی سہروردی سے حاصل کر کے حقائق و معارف کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ۱۴۸۹ء / ۸۹۵ھ میں ان ہی سے خلافت ملی اور ان کی وفات کے بعد ۱۵۰۳ء / ۹۰۹ھ میں سجادہ نشین ہوئے۔"(۹۹)

اور یہ ہی وہ سال تھا جب "نوسرھار" کی تکمیل ہوئی۔

اشرف بیابانی کے وصال کے بارے میں افسر صدیقی امروہوی "فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو" میں یوں رقمطراز ہیں کہ "اشرف کا وصال قمری تقویم کی رو سے اکہتر (۷۱) سال کی عمر میں ۱۵۲۹ء / ۹۳۵ھ میں ہوا۔"(۱۰۰)

کتاب کا تعارف:

اشرف نے اپنی مثنوی "نو سرہار" میں نو ابواب کو نوھاروں سے تشبیہ دی ہے۔ نو ابواب میں بیس عنوانات ہیں یہ عنوانات فارسی زبان میں ہیں۔ بیس مختلف عنوانات کے تحت واقعات کربلا کو بیان کیا گیا ہے۔ مگر کسی قدر تحریف کے ساتھ۔ باب اول میں حمد میں (۴۵) پینتالیس اور نعت اکیس ابیات پر مشتمل ہیں۔ جبکہ مروجہ لوازم کے بعد تیسرے باب سے واقعات کربلا کا بیان ہے۔ "نو سرہار" اٹھارہ سو ابیات پر مشتمل ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد لکھتے ہیں کہ حمد ان دو اشعار پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

"لکھیا اشرف یہ بکھان
توحید حق کی موزوں آن
اللہ بخشے تجھے رحمت
لیکھے باراں خوب صفت"(۱۰۱)

حمد کے بعد نعت کے اشعار ہیں اور اس کے بعد "در سبب ساختن و تالیف والتماس مصنف وا تفراق آن" کے تحت اشعار لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد تیسرے باب سے حضرت امام حسینؓ اور امتِ رسول کا حال بیان کیا گیا ہے۔

لسانی تجزیہ:

"نو سرہار" کی زبان بول چال کی مروجہ زبان سے قریب تر ہے۔ جس کی تائید ڈاکٹر نذیر احمد اپنے مضمون میں کرتے ہیں کہ "اس مثنوی کی زبان بول چال کی زبان سے بہت قریب ہے۔ اس میں روز مرہ و محاورات کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔"(۱۰۲)

محاورات کا بکثرت استعمال اس بات کا غماز ہے کہ اردو زبان اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی اس قابل ہو چکی تھی کہ محاورات کے ذریعے مدعا و مطالب کا اظہار ممکن ہو سکے۔

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بیان میں اشرف کی منظر نگاری ملاحظہ ہو:

انبر گرجا لرزے بھیں

جانو قیامت ہوئیں

سورج دوکھوں پکڑے تاب

چاند گھٹے نت چھر چھر آپ

ڈونگر بکسے سو کے گھاٹ

پتھر ترقے سینا پھاٹ

دوکھوں سیتی پانت بکھر

دوکھوں ہووے دھس کھانگر

پھولوں باڑی کملائے

سیوتی چنپا جوئی جائے

گھنگھی سینہ لوہو بھر

کالا ٹیکا مکھ پر دھر

دوکھوں لینا جنگل جائے

باغ ملے تے بے پروائے

ڈونگر دوکھوں بنوا لاگ

سٹے جیوں کی ہیسی آگ

پون پر ہوا حکم خدا

روتے رہے ترلوگ سدا(۱۰۳)

حضرت قاسم کی معرکہ آرائی کے ذیل میں اشرف کا زور بیان ملاحظہ ہو:

بلوند گھوڑا بجلی باد

اک مل بیٹھا رادت رائو

حملہ کیتا جیوں ان آغاز

گوٹ پڑیا جیوں بیری باز

بیروں باھیں کھوں بجائو

برسن لاگا کھانڈے گھائو

جس کاٹن کر دھوند کا جیوں

پھوٹے کافر سینہ تیوں
جیو اُن بیٹھا پہلی پھوڑ
کتے بیری گھالے کوڑ
اتنے کافر سٹے مار
کرنا سکے کوئی شمار
بیروں کیری باٹ برو
زخموں بھیتر تکہ تکہ ہو
ہر حملے ہر ہر گھائو
لوھو گہری کھال بھائو
بازاں جیوں آیا وقت
بے تاب ہوا قاسم سخت
پانی بن بھی دھیااڑ
سینا کالج سوس پکڑ
ناگہ انپڑیاں کاری گھائو
قاسم سب تن لوہو نہائو
بازاں حکم الٰہی کے
پڑیا قاسم جیوڑا دے (۱۰۴)

"نو سر ھار" کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مثنوی مجالس میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ لہٰذا اس میں قافیہ اور ردیف جیسی قواعد کی پابندیاں مفقود ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں:

"نو سر ھار اکھڑے اکھڑے اسلوب کی مثنوی ہے۔ اشرف کی شعری لغت بھی متاثر نہیں کرتی۔ دراصل مثنوی میں آہنگ کے فطری بہاؤ کے فقدان کے سبب قاری بہت جلد تھک جاتا ہے۔"(۱۰۵)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے اس اعتراض کے جواب میں ہم "نو سر ھار" کے چند اشعار پیش کرتے ہیں جن کی قرآت درج بالا رائے کی تصدیق یا تردید میں معاون ہو گی۔ مثنوی نو سر ھار میں اشرف بیابانی حضرت زینب کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

"زینب اھے اس کا نام
نین سلونے جوں بادام
از حد صاحب حسن و جمال
زیبا موزوں صورت حال
ماتھا جانوں سورج پاٹ
یا کے جانوں چاند الاٹ
دانت بتیسی تیسی جان
جیسے ہیر نیہ کسیری کھان
سر گاں جیسے لمبے بال
چندر سورج دونوں گال
چاند پیشانی دانت رتن
خنداں رو ہم سمیں تن
اس کا صورت خوب از حد
سبز رنگ ہور موزوں قد (۱۰۶)

مثنوی کا آہنگ اس بات کا عکاس ہے کہ مثنوی عزاداری کی محفلوں میں بیان کے لیے لکھی گئی ہو گی۔
اشرف بیابانی اپنی زبان کو ہندوی کہتا ہے:

ایک ایک بول یہ موزوں آں
تقریر ہندی سب لکھاں
نظم لکھی سب موزوں آن
یوں میں ہندوی کر آسان (۱۰۷)

واضح ہے کہ یہ ہندوی یا ہندی اردو کی ابتدائی شکل ہی ہے اور سیدہ جعفر کی رائے میں اس زمانے میں شاید اس زبان کے نام کا تعین بھی نہیں ہوا تھا۔ سیدہ جعفر تاریخ ادب اردو میں لکھتی ہیں:

"منتخب اللباب حصہ سوم میں خافی خان نے بہمنی سلطنت میں جس مقامی زبان کے دفتری زبان بننے کا ذکر کیا ہے وہ یہی قدیم اردو ہے جو اس وقت تشکیلی مراحل سے گزر رہی تھی۔"(۱۰۸)

اشرف کی زبان پر مجموعی طور پر ہندوی کا اثر نمایاں محسوس ہوتا ہے جبکہ تشکیلات الفاظ اور محاورات کے برمحل استعمال میں وہ فارسی روایت کا مقلد نظر آتا ہے۔

کسی بھی زبان کے ارتقائی عہد میں ہم اس زبان کی ایسی غلطیوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جب کسی چیز کی مکمل شکل ترتیب پاتی ہے تب ہی اسے قواعد وضوابط سے آراستہ کیا جاتا ہے۔

اشرف نے مثنوی میں بعض جگہ مصرعوں کو موزوں رکھنے کی پابندی سے یوں احتراز کیا ہے کہ بحر ہی تبدیل ہوگئی ہے۔ شاعر نے صرف شعری ضرورت کو ترجیح دی ہے اور صحت لفظی کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ بعض جگہ اسمائے معرفہ کی صورت بھی شعری ضرورت کی بھینٹ چڑھتی نظر آتی ہے۔ جیسے:

مسلم بن عقید اس نام
سیانا عاقل در ہر کام
یازید نعین بد حرکت
سبب زینب کے سنگدل سخت (۱۰۹)

اشرف نے حسب منشا الفاظ کی حرکات کو تبدیل کر دیا ہے اور بعض جگہ الفاظ کے اجزائے ترکیبی تک کو بدل دیا ہے اور غلط قافیہ بندی کی تو بے شمار مثالیں مثنوی میں موجود ہیں۔

آئو گھیر اگھر اس کا
منگنے لاگے سر حسین کا
حسن حسین مارے ناحق
ہوا میرے جیو میں دکھ (۱۱۰)

ہوں میں دیکھتا تری باٹ
فاطمہ، علی، حسن سات
نیڑے اپنے دوراز کوس
دشمن آہے باکہ دوس (۱۱۱)

اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں۔ مگر ہم اس کو مصنف کی نااہلی سے زیادہ قدامت زبان یا کاتب کے حصہ میں ڈال سکتے ہیں۔ کیونکہ بعض قافیے محض آواز کے ردھم پر تشکیل دیے گئے ہیں۔ اسی طرح کچھ جگھوں پر زیر کی آواز کو "یا" سے تبدیل کیا گیا ہے۔ جیسے یہ مثال:

پیٹن لاگیا سینا سیر
روتا آیا گھر کی دھیر
کی اس تاکید تمام
جو ترا مطعی ہو مدام
بازاں ایذ دکا کوئی یار
بصرے میں تھا تھانیدار (۱۱۲)

مگر اس بات سے بھی صرف نظر نہیں ہے کہ کاتب کی غلطیوں میں کسی لفظ کو ملا کر لکھ دینا۔ جیسے "اس طفیل" کو "استفیل" یا اظہار" کو "ازھار" یا "ہور" کو "حور" لکھنا بہر حال کاتب کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں بحر ہی تبدیل ہو گئی ہے وہ تو بہر حال مصنف کی کم علمی پر ہی محمول کی جائے گی۔

قطع نظر ان اسقام کے "نو سرھار" میں جابجا محاورات کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ محاورات کا استعمال اس بات کا عکاس ہے کہ زبان اردو کی حالت اس درجہ ناپختہ بھی نہیں تھی کہ شاعر کی ان کمی کوتاہیوں کو نظر انداز کیا جا سکے۔ کسی بھی زبان میں محاورات و تلمیحات کا استعمال زبان کے پختہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے اور اگر زبان میں اس قدر پختگی چھ سو سال قبل کے اس ادب پارے میں موجود ہے تو سوچیں اس دور میں مروجہ زبان میں اشاروں کنایوں اور محاورات کے ذریعے گفتگو ممکن ہو پائی۔

"نو سرھار" میں جو محاورات استعمال ہوئے ہیں ان میں سے اکثر اردو زبان کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ آج وہ متروک ہو چکے ہیں مگر ان کی قدامت ہی ان کی اہمیت ہے۔

جالوں تجھ کو چولھے گھال
جیوبے گاڑوں سات پتال (۱۱۳)

"چولھے میں ڈالنا اور زندہ گاڑنا" یہ محاورہ آج بھی الفاظ کی تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اردو زبان میں رائج ہے۔

"تو نہ ہوئوں بارہ باٹ
کوٹے میں جیور سی کاٹ (۱۱۴)

"بارہ باٹ" ہونا محاورہ ہے جو آج بھی زبان اردو میں مروج ہے اور دور ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض محاورات کے معنی تبدیل ہو گئے ہیں مگر کم و بیش ان ہی الفاظ کے ساتھ آج بھی مستعمل ہیں۔ مگر نوسرھار میں انتظار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

بال بیاہی جس کی تھی
تو نہ گزری اس سے بھی
ناک چڑھا کر رہیا یوں
بھوکن لاگا کتتا جیوں
آنکھیں کیرا کاجل پونچھ
بال پٹیاں سب ڈالے لونچ
دیکھ اے مادرِ مہرباں
ہوا مجہ تاریک جہاں
دیکھیں تری باٹ کھڑیاں
بھر بھر شربت ہاتھ کھڑیاں
کالا مونہ نیلے پائوں
کولے لاگی جم پچھتائوں (۱۱۵)

محاورات کے علاوہ اشرف نے نئی نئی تراکیب کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ایسے الفاظ جو زبان میں اضافہ کا باعث ہوں۔ اس بات کے عکاس ہیں کہ اگرچہ شمالی ہند میں زبان کا وہ ادبی معیار ابھی قائم نہ ہوا تھا جو کہ ادبیات کے لیے سود مند ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جنوبی ہند میں اردو زبان نے نویں صدی ہجری میں وہ ترقی پائی تھی کہ ادبیات میں نئے نئے الفاظ کی تشکیلات عمل میں آئیں اور محاورات کو شاعری میں جگہ دی گئی۔ جو کہ اس دور کے لسانی شعور کے ارتقا کی حیرت انگیز شکل ہے۔ ذیل میں چند لفظی تشکیلات کی مثالیں دیکھیں:

کوفے کیرا مارگ سٹ
لہرے بڑے سب نابٹ
لہریں بڑیں عورت مرد
کوئیں پائیں ہوا درد
بازاں ہوا اٹھ کھڑا
روتا سب لہرا وبڑا (۱۱٦)

"لہر اوبڑا" چھوٹے بڑے کے معنوں میں ایک سے زائد جگہ استعمال ہوا ہے۔

کوئی کہے کہ مکے جائیں
کوئی کہے کہ کوفے مائیں

"دب دب" بمعنی "جلدی جلدی"۔

بازاں یوسن شاہ حسین
دب دب پائوں کفشاں پین (۱۱۷)

"باتریاں۔ باتیں۔ اتریاں۔ داتیں"

واری ہوں تجھ باتریاں
کالا سر اس راتریاں

قدیم دکنی میں موجود "راتریاں اور باتریاں" جدید دکنی میں راتاں اور باتاں کی شکل میں آج بھی مروج ہے۔

ایک لفظ "کولیس" ہے جو کہ لگتا ہے اس زمانے کی عام زبان میں مروج تھا کیونکہ اس کا استعمال "کدم راؤ پدم راؤ" میں بھی ہوا ہے۔ بمعنی "طرف" استعمال ہوا ہے۔

آئو یذ یدا ب مجہ کولیس
آساں لاگی راتاں دیس (۱۱۸)

اس کے علاوہ بھی اس قسم کی بے شمار مثالیں نو سر ھار میں پائی جاتی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ "نو سر ھار" کی زبان پر دیگر متعدد زبانوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ لسانی تجزیہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "نو سر ھار" کی زبان پر سندھی، گجراتی، کچھی، برج بھاشا اور پنجابی کے اثرات نمایاں ہیں۔

کیونکہ اشرف نے کہیں بھی علامت فاعل یعنی "نے" نہیں استعمال کیا۔ حتی کے فعلِ متعدی میں بھی 'نے' کا استعمال مفقود ہے اور یہ طریقہ سندھی، کچھی، گجراتی اور برج بھاشا میں مستعمل ہے۔

اسم معرفہ میں "وون" کا اضافہ بھی ان ہی زبانوں میں خاصہ ہے جیسے ان کو "اوونوں" واحد کو جمع کی طرف پیش کرنا قدیم ہندوستانی بولیوں میں رائج تھا۔ حروف روابط کا مفقود استعمال بتاتا ہے کہ "نو سر ھار" کی زبان سندھی، کچھی، گجراتی، پنجابی اور برج بھاشا کا امتزاج ہے۔

جیسا کہ ما قبل ذکر ہوا کہ "نو سر ھار" واقعات کربلا پر مبنی ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ "نو سر ھار" کی تصنیف کی بنیاد ضعیف اور غیر ثقہ روایتوں پر رکھی گئی ہے اور مصنف کا تاریخی مطالعہ اور ذوق برائے نام ہے۔ محسوس یہ ہوتا

ہے کہ "نو سرھار" کا سرچشمہ فیضان دراصل وہ مجالس ہیں جو ماہ محرم میں جابجا منعقد ہوتی ہیں اور ان میں واقعات کربلا کو مبالغہ آرائی کی حد تک مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے اور ان مجالس کا مقصد اگرچہ ذکر مصائب اہل بیت ہوتا ہے مگر متاثر کن رنگینی بیان سے بعض اوقات اصل واقعات مسخ ہو جاتے ہیں۔ حقائق زورِ بیان میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے کچھ اسقام نو سرھار میں بھی پائے جاتے ہیں جیسے حضرت علی اکبر کی عمر بارہ برس بتاتی ہے۔

روڑا آیا حسین کن

بارہ برس کیرا سن (۱۱۹)

جبکہ مستند روایات میں حضرت علی اکبر کی عمر مبارک سانحہ کربلا کے وقت ۱۸ سال بیان کی گئی ہے۔

مرتب نے اس مثنوی کو تین نسخوں کی مدد سے مدون کیا ہے جس کی بابت افسر امروہوی لکھتے ہیں کہ:

"اب تک اس کے تین نسخوں کا پتا چلا ہے ایک نسخہ یہ ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسرا ہندوستان میں ہے اور انجمن ترقی اردو کے کتب خانے کی زینت ہے اور تیسرا ادارہ ادبیات حیدر آباد میں موجود ہے۔" (۱۲۰)

اس کے عبد ان نسخوں کا تعارف نہیں کرایا گیا۔ کس نسخے کو بنیاد بنایا گیا اور کن خصوصیات کی بنا پر یہ صراحت بھی کہیں درج نہیں کی گئی۔ بعض مقامات پر حواشی میں قدیم الفاظ کو جدید املا کے مطابق تحریر کیا گیا ہے۔

وہ مجھے دے گا گھوڑے گانو

تو کیا کیجیے دوسری لانو

حاشیہ میں "لانو" کو لائوں درج کیا گیا ہے۔

"کہیں پائوں جے دس رس"

"دس رس" کو حواشی میں دسترس لکھا گیا ہے۔

بعض جگہ کتابت کی اغلاط کو متن میں ہی درست کر دیا گیا ہے۔

"بدبخت یذید بد حرکت" کے بارے میں حاشیے میں لکھا ہے کہ اصل لفظ "ہر کت" تھا۔ کہیں کتابت کے اغلاط کو متن میں ہی درست کر دیا گیا ہے۔ مگر کہیں اسی طرح رہنے دیا گیا ہے اور حاشیے میں اس کی تصحیح کی گئی ہے۔ حاشیہ میں بعض الفاظ کے معنی بھی دیے گئے ہیں۔ جن

اشعار کے قافیہ ہم وزن نہیں ان کے بارے میں حاشیہ میں شعر کا قافیے کو غلط قرار دیا گیا ہے۔

اس بیت میں بھی قافیہ کی غلطی ہے۔"(۱۲۱)

اور جن اشعار میں قافیوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا ان کی نشاندہی بھی حاشیے میں یوں کی گئی ہے۔

کہن لا گایوں اس کوں

سونپا میں تجہ اللہ کوں

حاشیہ میں لکھا ہے "اس بیت میں قافیہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔"(۱۲۲)

درج بالا مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب کے لسانی تصرفات کیا تھے۔ اردو ادب کے ابتدائی زمانے کی اس تحریر میں قواعد ادبی و شعری پر اختلاف کچھ نامناسب ہے۔ ہم ایسے اس عہد کے لسانی ارتقا کی ایک کڑی کے طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

آج ہم زبان وادب کے جس مقام پر کھڑے ہیں وہاں شعری وادبی روایات کی موجودگی میں ہم "نوسرھار" جیسے ادب پارے کو نہیں پرکھ سکتے۔ ان ادبیات کے معیار کو جانچنے کے لیے ہمیں ادب پارے کو اس کے عہد کے مطابق پرکھنا ہو گا۔ اس ضمن میں بہتری کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سخاوت مرزا، (مقالہ)، تذکرہ عروس الاذکار، مشمولہ: رسالہ اردو، جنوری ۱۹۵۸ء،
۲۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو تحقیق: موضوعات اور معیار، محولہ بالا، انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۷ء، ص ۴۷
۳۔ افسر امروہوی، مقدمہ، تذکرہ عروس الاذکار، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۵ء، ص ۱۱
۴۔ ایضاً، ص ۱۲
۵۔ ایضاً، ص ۱۳
۶۔ سخاوت مرزا، مقالہ، تذکرہ عروس الاذکار، محولہ بالا، ص ۴
۷۔ ایضاً، ص ۵
۸۔ راقمہ نے جب شعرا کی تعداد کا شمار کیا تو ۳۷۰ پائی۔
۹۔ سخاوت مرزا، تذکرہ عروس الاذکار، مقالہ، (محولہ بالا)، ص ا
۱۰۔ افسر امروہوی، مرتب، تذکرہ عروس الاذکار، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۵ء، ص ۲
۱۱۔ ایضاً، ص ۳
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲
۱۳۔ ایضاً، ص ۵
۱۴۔ ایضاً، ص ۶
۱۵۔ ایضاً، ص ۸
۱۶۔ ایضاً، ص ۵
۱۷۔ مسیح الزمان، اردو مرثیہ کا ارتقا: ابتدا سے انیس تک، کتاب گھر، لکھنو، ۱۹۶۸ء، ص ۱۸
۱۸۔ ایضاً، ص ۲۱
۱۹۔ ایضاً، ص ا
۲۰۔ افسر صدیقی امروہوی، (مرتب)، بیاض مراثی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۵ء، ص ۳
۲۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، باب ششم، پنجاب یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء، ص ۲۰۵
۲۲۔ افسر صدیقی امروہوی، (مرتب)، بیاض مراثی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۵ء، ص ۱۹۹
۲۳۔ محی الدین قادری، زور، اردو شہ پارے، جلد اول، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد، دکن، ۱۹۲۹ء، ص ۱۴۲
۲۴۔ قاضی نور الدین فائق، تذکرہ مخزن الشعرا، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو ۱۹۸۵ء، ص ۷

۲۵۔ کلام حیدری (مترجم) تذکرہ شعرائے گجرات، دی کلچرل اکیڈمی، جگجیون روڈ، گیا، ۱۹۸۳ء
۲۶۔ قاضی نور الدین فائق، تذکرہ مخزن الشعرا، (محولہ بالا)، ص۸
۲۷۔ افسر صدیقی امروہوی، بیاض مراثی، ص۱
۲۸۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، پنجاب یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء، ص ۲۳۲
۲۹۔ کلام حیدری، تذکرہ شعرائے گجرات، (محولہ بالا)، ص۱۹
۳۰۔ ایضاً، ص۵۷
۳۱۔ افسر صدیقی امروہوی، بیاض مراثی، ص۶۸
۳۲۔ کلام حیدری، تذکرہ شعرائے گجرات، ص ۳۰
۳۳۔ ایضاً، ص۶۳
۳۴۔ ایضاً، ص۸۴
۳۵۔ ایضاً، ص۳۱
۳۶۔ ایضاً، ص۳۳
۳۷۔ ایضاً، ص۶۴
۳۸۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند (محولہ بالا)، ص ۲۳۴
۳۹۔ محی الدین قادری زور، اردو شہ پارے، جلد اول، (محولہ بالا)، ص ۱۵۴
۴۰۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، (محولہ بالا)، ص ۲۳۴
۴۱۔ ایضاً
۴۲۔ ایضاً
۴۳۔ کلام حیدری، تذکرہ شعرائے گجرات، ص ۴۴
۴۴۔ ایضاً، ص۱۷
۴۵۔ ایضاً، ص ۲۴
۴۶۔ ایضاً، ص۵۸
۴۷۔ افسر صدیقی امروہوی، (مرتب)، سنگھاسن بتیسی از فقیر دکنی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۴ء، پیش لفظ، ص ۳
۴۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی منظوم داستانیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۴۴۱
۴۹۔ افسر صدیقی امروہوی، (مرتب)، سنگھاسن بتیسی، از فقیر دکنی، پیش لفظ، ص ۱

۵۰۔ ایضاً، ص ۲

۵۱۔ سرفراز علی رضوی، ماخذات، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۰ء، (حرف آغاز) ص ۲

۵۲۔ افسر صدیقی امروہوی، سنگھاسن بتیسی از فقیر دکنی (محولہ بالا)، ص ۲

۵۳۔ افسر صدیقی امروہوی، فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان، انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۱۳۴

۵۴۔ ایضاً

۵۵۔ ایضاً

۵۶۔ سید شاہ عطاالرحمن عطاکاکوی (مرتب)، تذکرہ چمستان الشعرا مولفہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی، ۱۹۶۸ء، ص ۶۲

۵۷۔ سخاوت مرزا، شاہ قاسم علی قاسم (مقالہ)، مشمولہ رسالہ اردو، جنوری ۱۹۵۷ء، ص ۲۹

۵۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی منظوم داستان، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۴۴۱

۵۹۔ گوپی چند نارنگ، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۴

۶۰۔ افسر صدیقی امروہوی، فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو (محولہ بالا) ص ۱۳۴

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۶۳۔ افسر صدیقی امروہوی (پیش لفظ)، سنگھاسن بتیسی (محولہ بالا)

۶۴۔ ایضاً

۶۵۔ ایضاً، ص ۵

۶۶۔ ایضاً، ص ۵

۶۷۔ ایضاً، ص ۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۴

۶۹۔ ایضاً، ص ۵

۷۰۔ ایضاً، ص ۶

۷۱۔ ایضاً، ص ۶

۷۲۔ ایضاً، ص ۶

۷۳۔ ایضاً

۷۴۔ ایضاً

۷۵۔ ایضاً، ص ۴

۷۶۔ ایضاً، ص ۶

۷۷۔ ایضاً

۷۸۔ ایضاً، ص ۵

۷۹۔ گیان چند جین، اردو کی نثری داستانیں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۷ء، ص ۳۹۳

۸۰۔ ایضاً، ص ۳۹۵

۸۱۔ سیدہ جعفر، پروفیسر، گیان چند، پروفیسر، تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک، جلد اول، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص ۱۲۱

۸۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۹۹

۸۳۔ ایضاً،

۸۴۔ سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء، جلد پنجم، ص ۳۱۱

۸۵۔ نور الحسن نقوی، پروفیسر، تاریخ ادب اردو، نیشنل انسٹیٹیوٹ آف کشمیر اسٹڈیز، میر پور خاص، ۲۰۱۵ء، ص ۵۹

۸۶۔ سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ص ۱۱۵

۸۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، ص ۹۹

۸۸۔ خواجہ حمید الدین شاہد، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، جلد اول، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷۴

۸۹۔ سخاوت مرزا (مقالہ)، قدیم مثنوی نوسرھار، مشمولہ ہماری زبان، شمارہ ۲۱، ج ۱۸، جون ۱۹۵۹ء، ص ۱

۹۰۔ سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، ج دوم، ص ۱۱۵

۹۱۔ افسر صدیقی امروہوی (مرتب) نوسرھار، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۸۳ء، (پیش لفظ) ص ز

۹۲۔ مطبوعہ، "پنج گنج" کا سن تالیف مرتب میر تہور علی نے ۱۱۹۵ھ لکھا ہے۔

۹۳۔ ایضاً

۹۴۔ ایضاً

۹۵۔ تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، ص ۹۹

۹۶۔ افسر صدیقی امروہوی، فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو، پاکستان، جلد اول، ص ۶۴

۹۷۔ ایضاً

۹۸۔ افسر صدیقی امروہوی، مرتب، نوسرھار (مقدمہ)، ص ط

۹۹۔ خواجہ حمید الدین شاہد، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، جلد اول، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷۴

۱۰۰۔ افسر صدیقی امروہوی، سید سرفراز علی رضوی، فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو، پاکستان، جلد اول، ۱۹۶۵ء، ص ۹۴

۱۰۱۔ خواجہ حمید الدین شاہد، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، ص ۲۷۵

۱۰۲۔ نذیر احمد، ڈاکٹر، نوسرہار (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو ادب، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۵۷ء، ص ۴۸

۱۰۳۔ سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو (محولہ بالا)، ص ۱۲۲

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۱۰۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، ص ۹۹

۱۰۶۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان، جلد اول، چھٹا باب، ص ۲۰۵

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۲۰۶

۱۰۸۔ سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، ص ۱۲۷

۱۰۹۔ افسر صدیقی امروہوی، مرتب، نوسرہار از اشرف بیابانی (مقدمہ)، ص ک

۱۱۰۔ ایضاً، مقدمہ، ص ی

۱۱۱۔ ایضاً، مقدمہ، ص ک

۱۱۲۔ ایضاً، مقدمہ، ص ل

۱۱۳۔ ایضاً، ص ن

۱۱۴۔ ایضاً، ص س

۱۱۵۔ ایضاً، ص س

۱۱۶۔ ایضاً، ص س

۱۱۷۔ ایضاً، ص ع

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۴۸

۱۲۰۔ کلم الدین احمد (مرتب) دو تذکرے، لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۵۹ء (مقدمہ)، ضمیمہ ۳، ص ۱

۱۲۱۔ عظمت رباب، ڈاکٹر، اردو تدوین متن کی روایت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۴۰۹

۱۲۲۔ ایضاً، ص ۴۰۸

باب چہارم

تحقیق دکنیات میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا کردار: تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جن دکنی متون کو مرتب کیا ان کی زبان کے مراکز گولکنڈہ اور بیجاپور تھے۔ اس دور کے املا اور سن کی قرات کے ساتھ ساتھ قدیم متون کی تحقیق کے لیے مقامی بولیوں کے الفاظ اور امتیازات سے واقفیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اردو میں ابتدا ہی سے اعراب لگانے کا التزام باید و شاید ہی کیا جاتا ہے اور اردو زبان کا یہ اختصاص ہے کہ ایک ہی لفظ کو کئی معنوں میں لیا جاتا ہے۔ لہٰذا مدون کو علاقائی اور مقامی زبانوں سے واقفیت ہونا نہایت اہم ہے اور جمیل جالبی نے جب "کدم راؤ پدم راؤ" کی تدوین کا بیڑا اٹھایا تو کماحقہ زبانوں اور لہجوں سے واقفیت حاصل کی۔ اس کے بعد تدوین کی طرف آئے۔

جمیل جالبی کے یہاں الفاظ کی قرآت کا بھی بڑا اہتمام نظر آتا ہے۔ دراصل درست قرات نہ ہونے کے باعث متن کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے اور ایک احتیاط یہ بھی کی کہ ایک صفحے پر متن کا حقیقی عکس اور اس کے سامنے کے صفحے پر تفہیم شدہ عبارت درج کی گئی ہے۔ اس سے جہاں مصنف کی حد درجہ احتیاط کا پتہ چلتا ہے وہاں نئے محققین کے لیے تحقیق کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ چوں کہ تحقیق میں مفروضات کو دلائل سے پرکھا جاتا ہے لہٰذا جمیل جالبی نے بھی محمود شیرانی کی طرح دلائل کو مختلف نکات کی شکل میں درج کر کے ایک ایک نکتہ کی توجیہہ بیان کی ہے۔ حتیٰ کہ قاری آخری دلیل تک پہنچتے پہنچتے قائل ہو ہی جاتا ہے مگر اختلاف کی گنجائش بہر حال باقی رہتی ہے۔

جمیل جالبی فن متون کو مدون کیا ہے۔ اس میں ان کی بنیادی کوشش یہ ہی رہی ہے کہ اصل متن کی جوں کی توں ترسیل کی جائے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

تحقیق میں مفروضے اور دعوے سند کے بغیر قابل قبول نہیں ہوئے اور سند قابل اعتماد ہونا مختلف حالات وزمانے میں مختلف بنیادوں پر ہو سکتا ہے۔ اس کی قطعی حد بندی تو ممکن نہیں ہے۔ مگر اگر دلیل منطق کے مطابق ہو اور روایت کی بھی پاسداری کرتی نظر آئے تو وہ دلیل قابل قبول ہوتی ہے۔

"کدم راؤ پدم راؤ" کی قرأت، املا، اعراب اور امتیازی علامات کی عدم موجودگی نے متن کی تفہیم کو مشکل کر دیا تھا۔

قدیم متون میں عموماً یائے مصروف (ی) اور یائے مجہول (ے) کے درمیان فرق نہیں رکھا جاتا تھا اور اسی وجہ سے نا صرف متن کی قرأت مشکل ہو جاتی تھی بلکہ تذکیر و تانیث کا امتیاز بھی واضح نہیں ہو پاتا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بڑی کوشش اور دقتِ نظر کے ساتھ ان اشتباہات کو دور کر کے متن کو قابلِ تفہیم بنایا۔

اسی طرح ک، گ میں کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا تھا۔ ہم بہ صورت "کدم راؤ پدم راؤ" کے اصل متن میں جابجا دیکھ سکتے ہیں۔ قدیم متون کی درت تفہیم کا دار و مدار قاری کی صوابدید پر منحصر ہوتا تھا۔ اس سے التباس کے بڑے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔ قدیم متون میں املا کی امتیازی علامات کا کوئی خاص اہتمام والتزام نہیں کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے ب، پ، ت، ث وغیرہ یا ج، ح، خ وغیرہ کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ یا تو بھی دو لفظ ملا کر لکھ دیئے جاتے اور کبھی ایک سے زائد حروف بھی غیر واضح ہونے کی وجہ سے اصل مفہوم تک رسائی مشکل ہو جاتی۔

"کدم راؤ پدم راؤ" میں کبھی زیر اور پیش کی حرکات کو واضح کرنے کے لیے "ی" اور "و" کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ جیسے اون، اوس، مونہہ وغیرہ۔ ایسے الفاظ کو امتیاز علی عرشی اور عبدالودود نے دستور فصاحت میں تبدیل کر دیا ہے۔ مگر جمیل جالبی نے ان الفاظ کو یا تو قوسین میں جملے کے درمیان واضح کیا ہے یا پھر حاشیہ میں۔

اگر الفاظ کو جدید املا کے مطابق کر دیا جائے تو اس کی تفہیم تو آسان ہو جاتی ہے مگر اصل متن برباد ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی معمولی تبدیلیاں اگر جاری رہیں تو دو تین مرتبہ کی تدوین کے بعد اصل متن کی شکل ہی بر قرار نہیں رہے گی۔

ایک صورت قدیم شعری متون میں یہ بھی رہی ہے کہ بعض الفاظ ضرورت شعری کے تحت مخفف شکلوں میں استعمال ہوتے رہے اور یہ صورت حال زیر تبصرہ متن میں بھی جابجا موجود ہے۔ مثلاً اوس / اس، ترا / تیرا، خاموش / خامشی، سیاہ / سیہ، میہمان / مہمان وغیرہ۔ امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود نے مطابق انہیں جدید الفاظ سے تبدیل کر دینا چاہیے۔ مگر ڈاکٹر نذیر احمد کے مطابق شعری متون میں ترمیم و اضافہ کرنے سے راہ اعتدال سے بھٹک جانے کا امکان رہتا ہے۔

کسی بھی متن کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنا ہی تدوین متن کہلاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی تحریفات سے اصل متن اپنی اصل صورت میں بر قرار نہیں رہ پاتا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جمیل جالبی نے حتی الواسعٰ یہ ہی کوشش کی ہے کہ متن کو اس کی اصل شکل میں بر قرار رکھا جائے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے قدیم متن کو ایک صفحہ پر اور جدید تفہیم یافتہ متن کو سامنے کے صفحے پر عکسی صورت میں دیا ہے۔ اس طریقہ ہائے کار سے

دوسرے محققین کے لیے بھی راہیں کھلتی ہیں کہ اگر وہ اس میں بہتر اضافے کر سکتے ہیں تو ضرور اس امکان کو وجود میں لائیں۔ "کدم راؤ پدم راؤ" کا کیوں کہ صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہے لہٰذا اس کا تقابلی جائزہ ممکن نہ تھا۔ اس کی موجودہ حالت ہی کو غنیمت و مختتم سمجھنا مدون کی مجبوری تھی۔

الف۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ:

دکنی ادب کی وسعت جو ولی دکنی سے پیچھے ایک ابہام کی صورت تھی۔ دکنی ادب کے نظم و نثر اور لسانی ارتقا محض قیاسات پر مبنی تھا کہ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی اشاعت نے اردو ادب کے معلوم دائرے کو وسیع کر کے دسویں صدی ہجری تک پہنچا دیا اور نظامی دکنی "کدم راؤ پدم راؤ" اس وسعت کو بڑھا کر مزید دو صدیاں پیچھے لے گئی۔

مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کی تدوین نے صرف ادبی ہی نہیں بلکہ لسانی تغیرات و تشکیلات کا بھی دروازہ کھول دیا اور لسانی تغیرات کی جو روایت ولی دکنی پر منتج ہوتی تھی اب اس کا دائرہ وسیع ہو کر گزشتہ دو صدیوں کو محیط ہو گیا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے قلمی نسخے میں موجود قدیم طرز املا، تسامحات، کتابت اور خصائص کتابت کو سمجھنے اور تفہیم کی دقتوں کو سمجھنے کے لیے جس ژرف نگاہی اور احتیاط کی ضرورت تھی ہر قدم پر اس احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اس مثنوی کی اشاعت انجمن ترقی اردو پاکستان کا اہم علمی کارنامہ ہے۔

ایک ہزار بتیس اشعار کے اس مجموعے میں اب چند ہی قابل تحقیق مقامات رہ گئے ہیں۔ خصوصاً ابتدا ساتھ صفحات پر مشتمل مقدمہ اور آخر میں سلاطین بہمنی کے علاوہ ان شخصیات کے بارے میں معلومات ہیں کہ جن کا ذکر مثنوی میں کیا گیا ہے۔

مثنوی کی دریافت:

اس مثنوی کا تعارف سب سے پہلے نصیر الدین ہاشمی نے ایک مضمون "بہمنی عہد حکومت کا ایک دکنی شاعر" مطبوعہ رسالہ "المعارف" (اعظم گڑھ) اکتوبر ۱۹۳۲ء میں کروایا تھا۔

نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب "دکن میں اُردو" کے صفحہ نمبر ۳۴ پر رقمطراز ہیں کہ "یہ مثنوی جو "کدم راؤ پدم راؤ" کے نام سے موسوم تھی ہم نے لطیف الدین ادریسی (تاجر کتب) کے پاس دیکھی تھی۔"[1]

ہاشمی صاحب کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ نام مثنوی کو تاجر کتب نے دیا تھا۔ جس کو بعد ازاں نصیر الدین ہاشمی سمیت سب نے قبول کیا۔

چونکہ مثنوی کے ابتدا اور اختتام کے صفحات موجود نہیں تھے لہٰذا نہ تو مثنوی کا درست نام معلوم ہو سکا اور نہ ہی اس کی تصنیف و کتابت کے سن کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ لہٰذا مثنوی کے مرکزی کرداروں کے نام پر مثنوی کا نام "کدم راؤ پدم راؤ" رکھ دیا گیا جو کہ آگے چل کر معروف ہوا۔

یہاں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس مثنوی کا اب تک صرف ایک ہی معلوم نسخہ جو کہ انجمن ترقی اردو، پاکستان کا مخزونہ ہے۔

شاعر کا تعارف:

مثنوی کی داخلی شہادتوں سے یہ بات درجہ اعتبار پاتی ہے کہ مصنف کا نام "فخر دین" اور تخلص "نظامی" تھا۔ مثنوی میں کئی جگہ یہ نام استعمال ہوا ہے۔ مثنوی کے صفحہ ۴۲ پر یہ شعر دیکھیں:

کہے فخر دین ایک ساچا بچن
پہلے پر کھٹے جے کرے کوئی کن (۲)

یا یہ کہ:

سنوئے فخر دین توں بسر آنکھیا
محمد نبی خاتم انبیا (۳)

فخر دین نظامی کے حالات زندگی کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ دکنی ادب کے محققین نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی قیاسات پر مبنی ہے۔ مگر اشرف وہابی اپنی "تاریخ ادب اردو" میں ایک مزار کی نشاندہی کرتے ہیں:

ان کا مزار چلر گی مریم پور بتایا جاتا ہے۔ یہ بیدر سے سولہ کلومیٹر پر واقع ہے۔ دروازے پر یہ تحریر درج ہے:

"حضرت خواجہ سید شاہ مولانا فخر دین صاحب قدس سرہ"

لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اسی شخص کا مزار ہے جس نے "کدم راؤ پدم راؤ" تصنیف کی۔"(۴)

تحقیق میں قیاسات اولین قدم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اس قیاس کو بھی اہل تحقیق کی صوابدید پر چھوڑتے ہوئے یہاں نقل کر دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا واحد نسخہ ہے جو انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کے ابتدائی اور اختتامی صفحات نہ ہونے کے وجہ سے نہ تو مصنف کے نام کا پتہ چلتا

ہے نہ کاتب کے نام کا، نہ سن تصنیف کی کوئی جھلک ملتی ہے نہ ہی مثنوی کا اصل نام سامنے آتا ہے۔ اگرچہ درمیانی صفحات بھی درمیان میں سے غائب تھے۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ جمیل جالبی "ادبی تحقیق" میں لکھتے ہیں کہ:

> "پہلے صفحے پر مولوی عبدالحق نے اپنے ہاتھ سے "مثنوی کدم رائو پدم رائو، فخر الدین نظامی" کے الفاظ لکھے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ۸۲۵ھ (احمد شاہ ولی کی تخت نشینی کا سن) وفات ۸۳۸ھ م ۱۴۳۴ء اس کے نیچے "عبدالحق" لکھا ہوا ہے۔"[۵]

مثنوی میں متعدد جگہ شاعر نے اپنا نام "فخر دین" لکھا ہے۔ اگر شاعر کا نام "فخر الدین" ہوتا تو شاعر کے لیے اس کا بیان کرنا مشکل نہ تھا۔ اور اس قسم کے نام خصوصاً پنجاب میں آج بھی رائج ہیں۔ لہٰذا مثنوی کی داخلی مضبوط شہادتوں کے بعد مصنف کا نام "فخر الدین نظامی" نہیں بلکہ "فخر دین نظامی" ہی درست قرار پاتا ہے۔

مثنوی کے اشعار کی تعداد: ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق "مثنوی کے درست اشعار کی تعداد ۱۰۳۲ ہے جبکہ آخری شعر نامکمل ہے۔ اس کے بعد کے اشعار ضائع ہو گئے۔"[۶]

زمانہ تصنیف:

> انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانے میں محفوظ اس نسخے کا سائز ۲۔۷ انچ ۵ء۱۱ انچ ہے۔ اس میں اول و آخر کے علاوہ بیچ بیچ میں سے صفحات غائب ہیں۔ جبکہ تمام عنوانات فارسی میں سرح روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ مثنوی میں ۱۰۳۲ اشعار ہیں جبکہ ۱۰۳۳ واں شعر نامکمل ہے۔

مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے الفاظ لکھے ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "۸۲۵ھ (یہ سنہ احمد شاہ "ولی" کی تخت نشینی کا ہے) وفات ۸۳۸ھ / ۱۴۳۴ء۔ ان کے نیچے "عبدالحق" لکھا ہے۔ اسی صفحے پر یہ بھی لکھا ہوا ملتا ہے کہ "علاء الدین بن احمد شاہ ۸۳۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ ۸۶۲ھ میں وفات پائی۔ احمد شاہ ثالث بن علاء الدین ۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ۔"[۷]

اگرچہ مثنوی میں تاریخ تصنیف درج نہیں مگر مثنوی کی داخلی شہادتوں سے عہد تصنیف کا تعین کیا گیا ہے۔ حسب روایت نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بادشاہ وقت کی مداح میں جو اشعار لکھے گئے ہیں اس کا عنوان ہے "مدح"، "سلطان علاء الدین بہمنی نور اللہ مرقدہ۔" اس عنوان کے تحت پہلا شعر دیکھیں:

بڑا شاہ وہ شاہ جس شاہ جگ
رہیں سیوتے جرم تس پائے لگ

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار

پرت پال سنسار کرتار ادھار

بارہ اشعار کے بعد اسی "مدح" میں یہ اشعار ملتے ہیں:

دھنیس تاج کا کوں راجا ابھنگ

کنور شاہ کا شاہ احمد بجنگ

لقب شہ علی آلِ احمد ولی

ولی تھی بہت بدھ تد آگلی

جہانگیر توں شاہ گڑوا کہیر

سمندر منو کت سمندر سریر (۸)

مذکورہ اشعار کی بنیاد پر نصیر الدین ہاشمی کا موقف یہ تھا کہ اشعار میں احمد کے شہزادہ ہونے کا ذکر ہے گویا اس وقت بادشاہ علاء الدین بہمنی زندہ تھا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"خاندان بہمنی کے سلسلے یہ واضح ہوتا ہے کہ سوائے گیارھویں حکمران علاء الدین ہمایوں شاہ کے کوئی ایسا حکمران نہیں ہوا جس کا لقب علاالدین اور احمد شاہ اس کے ولی عہد کا نام ہو۔ یہ احمد شاہ ثالث ۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ تک حکمران رہا۔ لہٰذا مثنوی کی تصنیف اسی زمانے میں قرار دینی چاہیے۔"(۹)

مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ:

"اگر تاریخ فرشتہ میں احمد شاہ ثالث کا لقب نظام شاہ بہمنی لکھا ہے۔ مگر جو سکے ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک مضروب ہوئے۔ ان پر بادشاہ کا نام احمد شاہ مسکوک ہے۔"(۱۰)

کسی بھی قدیم تذکرے میں فخر دین نظامی کے حالات درج نہیں البتہ مثنوی کی داخلی شہادتوں کی بنا پر اس مثنوی کی تصنیف کے عہد کے بارے میں اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ مثنوی کی تصنیف احمد شاہ ولی بہمنی کے دور میں بیدر میں مقیم تھا۔ مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ شاہی دربار میں اس کی رسائی یا وابستگی ہو۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر تاریخ ادب اردو میں لکھتی ہیں کہ نصیر الدین ہاشمی کے بقول مثنوی کی تصنیف کے وقت علاء الدین بہمنی کا انتقال ہو چکا تھا اور احمد شہزادہ تھا۔ مزید لکھتے ہیں کہ:

"ہم کو مثنوی سے نہ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی علاء الدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی اور اس کا ولی عہد احمد تھا... احمد شاہ ثالث ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک حکمران رہا اس لیے اس مثنوی کی تصنیف کو بھی اسی زمانے میں قرار دینا چاہیے۔"(۱۱)

افسر صدیقی امروہوی مثنوی کے زمانہ تصنیف کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ہاشمی صاحب سے متفق نہیں:

"ہاشمی صاحب کو علاء الدین کی سرخی کے تحت احمد شاہ کا نام آجانے سے یہ شبہ ہوا کہ احمد شاہ علاء الدین کا لڑکا اور ولی عہد ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں، جس سلطان علا الدین کا نام عنوان میں لکھا گیا ہے... وہ نظام شاہ کا باپ سلطان علا الدین نہیں بلکہ وہ سلطان علاء الدین ہے جس نے اپنی شجاعت اور قابلیت کی بنیاد پر سلطنت بہمنیہ کی بنیاد رکھی اور سلطان اول کی حیثیت سے ۷۴۸ھ میں تخت نشین ہوا۔"(۱۲)

افسر امروہوی کے بیان کے مطابق سلاطین بہمنیہ میں ایک ہی سلطان علاء الدین حسن، بانی سلطنت کا پوتا تھا جو رعایا میں احمد شاہ ولی کے نام سے مشہور تھا۔ یہ خاندان بہمنیہ کا نواں سلطان تھا اور اس کا عہد حکومت ۸۲۵ھ سے ۸۳۸ھ تک تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق مذکورہ بیانات کی روشنی میں اس بات پر منتج ہوتی ہے کہ:

"مثنوی کی مدحیہ اشعار میں دو احمد بیان ہوئے ہیں۔ ایک وہ احمد شاہ جسے بڑا شہنشہ ظاہر کیا گیا ہے اور دوسرا احمد وہ جسے بادشاہ کا کنور ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کا لقب احمد شاہ ولی بہمنی ہے۔ جو احمد خان کا بیٹا اور علاء الدین حسن بہمنی کا پوتا ہے۔"(۱۳)

جبکہ جمیل جالبی کے مطابق" :علاء الدین شاہ کے دورِ حکومت ۸۲۵ھ تا ۸۳۹ھ / ۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۵ء میں مثنوی لکھی گئی ہے۔"(۱۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی مثنوی کے مقدمے میں مقام تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"اس کا بھی امکان ہے کہ یہ مثنوی بیدر میں لکھی گئی ہو۔ اس لیے کہ احمد شاہ ولی نے ۸۳۴ھ / ۱۴۳۰ء میں اپنا دارالسلطنت گلبرگہ کے بجائے بیدر کو بنالیا تھا۔"(۱۵)

مثنوی میں بیان کردہ قصہ:

قصہ کی ابتدا کچھ یوں ہوتی ہے کہ:

کدم راؤ (راجہ) پدم راؤ (وزیر جو کہ ناگ ہے) سے کہہ رہا ہے کہ بات سوچ سمجھ کر کرنی چاہیے لہٰذا نہایت سوچ کر جواب دو۔ (یہاں سے مثنوی کے اوراق کا سلسلہ معطل ہے) بادشاہ کا سوال واضح نہیں۔ بہر حال وزیر سے یہ گفتگو کر کے راجہ غصہ میں بھرا ہوا محل میں گیا اس کو دیکھ کر محل کی رانیاں متفکر ہوئی مگر راجہ کی دل بستگی ممکن نہ ہوئی بالآخر راجہ نے رانی سے کہا کہ کسی غیر عورت کے ساتھ برا کام کرنے سے زیادہ دنیا میں کچھ برا نہیں دنیا میں باعزت وہی ہے جو دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھے۔ المختصر بادشاہ عورتوں سے بدگمان ہو گیا۔ رانی نے التجا کی کہ دوسروں کا قصور میرے سر نہ ڈالو۔ بے شک دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ رانی کی کسی بات کا کدم راؤ پر اثر نہ ہوا۔

راجہ کدم راؤ نے وزیر پدم راؤ سے کہا کہ میں تو دوست اس کو جانتا ہوں جو لالچ کے بغیر دوستی نبھائے۔ جیسے کہ تم... پدم راؤ خوش ہوا۔ راجہ نے اس کے سر پر کستوری ملی جو کہ جاہ و عزت کی نشانی تھی۔

راجہ نے وزیر سے خواہش ظاہر کی کہ میں پردیسیوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ وزیر نے کہا پردیسی اعتبار کے لائق نہیں ہوتے مگر راجہ نہ مانا اور وزیر کو حکم دیا کہ کسی مسافر پردیسی کو لاؤ کہ میں اس کی خدمت کروں۔ میں تو راجہ ہوں کسی کی کیا مجال کہ مجھے نقصان پہنچا سکے۔

پدم راؤ نے راجہ کو منانے کی بہت کوشش کی مگر راجہ اپنی بات پر مُصر رہا۔ بالآخر وزیر کو انعام واکرام سے نواز کر اپنی بات منوالی اور وعدہ کیا کہ میں تمہاری نصیحتوں کو یاد رکھوں گا۔ درباریوں میں سے ایک درباری نے بتایا کہ مچھندر کا بیٹا رگھو ناتھ آیا ہوا ہے۔ بڑا جوگی ہے اور بہت سے علوم پر دسترس رکھتا ہے۔ راجہ نے اسے فوراً طلب کیا۔ رگھو ناتھ نے راجہ کو جھوٹی سچی باتیں سنا کر اپنا گرویدہ کر لیا۔ پھر اپنے جادو کے علم کا مظاہرہ کیا۔ راجہ بہت متاثر ہوا اور اس سے یہ علم سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ رگو ناتھ نے پہلے "دھنور بید" سکھایا اور پھر "امر بید" سکھانے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ یہ میرے تمہارے درمیان راز رہے گا اور کہا کہ کوئی جانور لاؤ۔ راجہ ملکہ کا طوطا لے آیا۔ رگھو ناتھ نے اس کی گردن مروڑ دی۔ طوطا مر گیا۔ رگھو ناتھ نے اپنی روح طوطے کے جسم میں داخل کی اور راجہ سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد دوبارے اپنے جسم میں روح کو داخل کیا اور زندہ ہو گیا۔ راجہ بڑا حیران ہوا اور حکم دیا کہ مجھے یہ منتر سکھاؤ۔

ایک دن رگو ناتھ نے راجہ سے کہا کہ اپنی روح طوطے میں داخل کرو۔ جیسے ہی راجہ نے اپنی روح طوطے میں ڈالی رگھو ناتھ نے اپنی روح راجہ کے جسم میں ڈال دی۔ اب راجہ طوطا بن گیا اور جوگی راجہ اب رگھو ناتھ راجہ بن کر محل میں راج سنبھالنے لگا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ راج پاٹ کا طریقہ معلوم نہ تھا نہ ہی وہ دربار کے رسم

ورواج سے واقف تھا۔ پدم راؤ کو راجہ کے رویہ میں بدلاؤ محسوس ہوا۔ رگھوناتھ نے اس سے کہا کہ دیکھو میں نے جوگی کو مار ڈالا اور جوگی کی لاش سب کو دکھا دی۔

اس کے بعد جوگی کو یہ خطرہ بھی محسوس ہوا کہ کہیں وہ طوطا واپس نہ آجائے۔ لہٰذا منادی کرا دی کہ طوطا مجھے برا بھلا کہہ کر کہیں چلا گیا ہے جو بھی اس طوطے کو پکڑ کر لائے گا بڑا انعام پائے گا۔

اِدھر وزیر نے راجہ کی خفیہ نگرانی شروع کر دی۔ ادھر طوطا بنا راجہ کبھی خود کو شکاریوں سے بچاتا، کبھی دھوپ سے تو کبھی بڑے پرندوں کے حملوں سے۔ ایک دن اپنے محل کے قریب سے گزرا تو اس نے اپنے وزیر پدم راؤ کو دیکھا، وہ فوراً وہاں اتر گیا اور وزیر کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ پدم راؤ نے راجہ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

رات کو پدم راؤ راجہ کے محل میں گیا اور جوگی کے پیر پر کاٹ لیا۔ جوگی مر گیا اور کدم راؤ اپنے جسم میں دوبارہ اپنی روح داخل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور راجہ بن گیا۔ پورے ملک میں جشن منایا گیا۔ یہ قصہ مخطوطے میں یہیں تک ہے آگے کے صفحات غائب ہیں یعنی احتمال ہے کہ ضائع ہو گئے ہیں۔"

اس قصے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصہ کا اسلوب کس قدر رواں اور سلیس ہے۔ قصہ بھی ہندوی روایت سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جب کہ اس کی مماثلت قرآن میں موجود حضرت سلیمان کے قصے سے بھی ہے جب ایک جن نے حضرت سلیمان کا روپ دھار کر ان کی جگہ حکومت کی مگر جلد ہی اسکا یہ بہروپ سامنے آیا اور حضرت سلیمان دوبارہ بادشاہ بن گئے۔

کوئی بھی کہانی اپنے زمانے، عہد اور اجتماعی سوچ کا مظہر ہوتی ہے۔ اس کہانی کا تعلق بھی ایک ایسے معاشرے سے ہے جہاں سحر وساحری کو علوم میں عظیم درجہ حاصل تھا۔ لہٰذا اس کہانی میں ایسے اعتقاد بھی ملتے ہیں جو جدید دنیا میں محض خیال وخواب ہیں۔

اس دور کے سیدھے سادھے انسان کے ان عقائد کی ٹھوس وجوہات تھیں۔ درواڑی قوم میں آریا پہلے پردیسیوں کی شکل میں آئے پھر فاتح بن گئے اور اصل قوم کو مفتوح بنا لیا۔ یہی تاریخ اور میں بھی دہرائی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوگ تاجد کی شکل میں لوگ آئے اور پھر رفتہ رفتہ حکومتی امور میں اس درجہ مخل ہوئے کہ بالآخر حکومت ہی پر قابض ہو گئے۔ اس حوالے سے جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ جیمس فریزر اپنی کتاب "شاخ زریں" میں لکھتا ہے کہ:

"اجنبیوں کے مضر اثرات کے خلاف پیش بندی اس زمانے میں ضروری سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ جب وہ سفیر، جنھیں مشرقی روما کے شہنشاہ جسٹن دوم نے ترکوں کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے بھیجا تھا، اپنی منزل مقصود پر پہنچے تو انھیں لینے کے لیے شامن (آئمہ مذہب) وہاں موجود تھے جنھوں نے ان سفیروں کے مضر اثرات دور کرنے کے لیے ایک باضابطہ رسم تزکیہ ادا کی۔"(۱۶)

ڈاکٹر جالبی نے صرف مثنوی کی لسانی تشریح ہی نہیں کی بلکہ قصہ کے بین السطور عقائد کی بھی تشریح کی ہے۔ جو کہ ان کے متنوع الجہات علوم پر دسترس اور وسیع مطالعہ کی عکاس ہے۔

درج بالا تحقیق پر ایک نظر ڈال کر ہمیں جمیل جالبی کے تحقیقی خصائص اور رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔
روح کی جسم میں داخل ہونا اور جسم کی تبدیلی قدیم یونانی دیومالائوں میں بھی ملتی ہے جبکہ Golden Ass نامی کہانی میں ایک لڑکے کی روح ایک گدھے میں ڈال دی جاتی ہے اور وہ اس روپ میں مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔

جمیل جالبی "ادبی تحقیق" میں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"اسی قسم کی ایک کہانی ملایا والوں کے ہاں بھی ملتی ہے کہ کسی بادشاہ نے اپنی روح ایک بندر میں منتقل کر دی تو وزیر نے اپنی روح فوراً بادشاہ کے جسم میں داخل کر دی اور بادشاہ بن بیٹھا... مگر ایک اور موقع پر جیسے ہی نام نہاد بادشاہ نے اپنی اپنی روح مینڈھے میں منتقل کی تو اصل بادشاہ نے فوراً اپنی روح اپنے جسم میں داخل کر دی اور وزیر مینڈھا بن کر کیفر کردار کو پہنچا۔"(۱۷)

گویا قدیم قصے کہانیوں میں "دھنور بید" اور "امر بید" (جو کہ سامری کے انتہائی مدارج ہیں) کا ذکر اکثر کسی نہ کسی فروعی تبدیلی کے ساتھ ملتا ہے۔ جیسے "گلزار نسیم" میں بھی تبدیلی جسم کی مثال ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مثنوی قدیم عقائد کی عکاس ہے۔

ایک عقیدہ اس کہانی میں یہ بھی ہے کہ اس دور میں "پردیسیوں" سے اجتناب برتا جاتا تھا۔ کیونکہ لوگ سمجھتے تھے کہ پردیسی دور دراز سے آکر ہماری حکومت چھین سکتے ہیں۔ یا وہ ساحر ہوتے ہیں۔ یا شاید ان کی حقیقت نامعلوم ہونے کی وجہ سے ان سے خوفزدہ رہتے تھے۔ خصوصاً بادشاہوں کو پردیسیوں سے دور رکھا جاتا تھا۔

جدید تحقیق کی رو سے اب تک یہ بات درجہ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ احمد شاہ ولی کے دور حکومت میں ہی یہ مثنوی تصنیف ہوئی کہ بہمنی سلاطین میں علاؤ الدین بہمنی (بانی سلطنت) کا پوتا تھا۔ اس کا دور حکومت

۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء تا ۸۳۹ھ / ۱۴۳۵ء تک تھا اور اسی کی مداح کے اشعار مثنوی میں شامل ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب "مثنوی نظامی دکنی المعروف کدم راؤ پدم راؤ" اور "ادبی تحقیق" میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ بہمنی دور کی تصنیف ہے۔

مثنوی کی داخلی شہادتوں کے پیش نظر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نظامی احمد شاہ ولی بہمنی (بادشاہ) کے عہد میں بیدر میں تھے مگر شاہی دربار سے وابستگی کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نظامی ہندی زبان پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان سے بھی واقفیت رکھتا تھا کیونکہ اس نے مثنوی کے تمام عنوانات فارسی زبان میں تحریر کیے ہیں۔ مثنوی کا خط نسخ ہے اعراب بھی دیئے گئے ہیں۔ گ، چ اور ٹ کے لیے کوئی علامت نہیں اسی طرح ہائے معروف اور مجہول میں بھی کوئی تفریق نہیں رکھی گئی۔

دیگر زبانوں کے اثرات:

مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے اسلوب میں دیگر زبانوں کا جو اثر اور شائبہ نظر آتا ہے اس میں سر فہرست دکنی زبان میں "چ تاکیدی" اور "نکو" کا استعمال ہے۔ چ کا لاحقہ "ہی" کے معنی میں مرہٹی زبان میں استعمال ہوتا تھا جو کہ مقامی زبان میں مدغم ہو کر دکنی اردو میں شامل ہوا اور آج تک مستعمل ہے۔ اسی طرح انکار کے معنی میں لفظ "نکو" مراٹھی زبان میں رائج تھا اور ہے، جو کہ اب دکنی اردو میں استعمال ہوتا ہے۔

ڈھٹائی نکو کر... جیئو دھیٹ
نہ جیئو تے بہن ڈر نپٹ جوئے ایٹ (۱۸)

اسی طرح پنجابی کا بھی اردو کے ساتھ تعلق نہایت قدیم ہے۔ "کدم راؤ پدم راؤ" میں بھی یہ اثرات نظر آتے ہیں۔

اکھیاں... آنکھیں: جو اکھیاں تجے ہوئے آنکھوں تجے (صفحہ نمبر: ۸۴۶)
نیکا... چھوٹا: جو نیکا اٹھے ترن بن رکھ کوئی (صفحہ نمبر: ۱۹۷)
دوجا... دوسرا: جو دوجا نہ ویکھے پرکھ تب لگ (صفحہ نمبر: ۲۴۰)

گجراتی زبان بھی اردو زبان میں ابتدا ہی سے اثر انداز رہی اور اس زبان کا کافی اثر نہ صرف بول چال کی زبان پر رہا بلکہ ادبی سطح پر بھی گجراتی کی آمیزش نظر آتی ہے۔ جمیل جالبی نے مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے اسلوب میں جن گجراتی اثرات کی نشاندہی کی ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں جس سے زبان کی ارتقائی تصویر کا اندازہ ہوتا ہے۔

پونگڑا۔ لڑکا، بچہ... پچھو پونگڑا کھائے جن پیچ مائے (صفحہ نمبر:۹۵۰)

باپڑا۔ بیچارہ، غریب... کہیں باپڑا، فارہوں میاں کاں (صفحہ نمبر:۶۵۰)

اسی طرح بہت سے الفاظ گجراتی زبان کے اس مثنوی میں ملتے ہیں۔ پنجابی، گجراتی اور مراٹھی کے علاوہ سرائیکی اور سندھی زبان کی اردو میں آمیزش کے امکان کو کبھی بھی رد نہیں کیا گیا۔ یہاں بھی اس چھ سو سال قبل کی زبان اردو میں سندھی اور سرائیکی الفاظ کا استعمال دیکھیں:

گھرے۔ مانگنا، چاہنا... گھرے کوئی اپچار ناچار پاپ (صفحہ نمبر:۲۲۸)

اچہ۔ آئو... سکھی راج توں اچہ تھر راج کر (صفحہ نمبر:۶۰۷)

تلہار۔ نیچے... نہ منجہ سدھ اوپر نہ تلہار سدھ (صفحہ نمبر:۹۴۰)

یہ چند مثالیں ہیں جس سے اردو کی چند زبانوں کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس مثنوی میں دوسری بہت سی مقامی اور مروجہ زبانوں کے اثرات یقیناً پائے جاتے ہیں جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اردو زبان نہ صرف مختلف زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے بلکہ یہی وہ زبان ہے جو عرصہ قدیم سے برصغیر میں لنگوا فرانیکا کے طور پر قبولیت عام رکھتی ہے۔

مثنوی کی تشکیلات واسلوب:

شمس الرحمن فاروقی اپنی کتاب "اردو کا ابتدائی زمانہ" کے باب چہارم میں لکھتے ہیں کہ:

"کدم راؤ پدم راؤ کا نمایاں ترین پہلو اس کی غیر مذہبیت ہے۔ اس سے کچھ اخلاقی سبق بھی شاید حاصل کیا جا سکتا ہو، لیکن بنیادی طور پر یہ نظم آداب حکومت، انمل بے جوڑ جنسی ملاپ یا شادی، دنیاوی علم اور سحر و ساحری اور اسرار پر مستعمل ہے اور اتنی ہی اہم بات یہ ہے کہ یہ نظم شعوری طور پر "ادبی" ہے۔ اس کے مصنف کو غالباً اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ وہ کوئی ادبی (نہ کہ اصلاحی، صوفیانہ یا اخلاقی) کارگزاری انجام دے رہا ہے۔"[۱۹]

گویا مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کو عوام الناس کے لیے تخلیق کیا گیا تھا اور عوام الناس میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے۔ یہ محض تفریح طبع کے لیے تخلیق کی گئی تھی یہ ہی وجہ ہے کہ اس میں قرآنی واقعات کی مماثلت بھی پائی جاتی ہے اور ہندو دیومالائی قصوں اور نظریات کا عکس بھی ملتا ہے۔

نظامی کی نظر میں ایہام یا ذو معنین الفاظ کا استعمال شعر گوئی کا خاص جوہر ہے۔

دو آرت سبد حسن کوت میں نہ ہوئے

دو آرت سبد باج اچھے نہ کوئے[۲۰]

اس مثنوی کا اسلوب اس بات کا گواہ ہے کہ نظامی کے عہد میں یا اس سے قبل اس قسم کے لسانی شاہکار ضرور تضیف پائے ہوں گے کیونکہ جس زمانے میں اس مثنوی کی تصنیف متوقع ہے، اس زمانے کی لسانی تشکیلات، محاورات کا بر محل استعمال اور اسلوب کی پختگی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس زمانے میں پر امن اور ساز گار ماحول نے تخلیقی محرکات کا ایک خاص معیار متعین کر دیا تھا۔

یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ اس سے قبل بھی اسی معیار کی تحاریر وجود میں آئی ہوں مگر اب تک ہماری دسترس سے باہر ہیں یا ان تک ہماری رسائی ممکن نہ ہو سکی ہو۔

شمس الرحمن فاروقی اس حوالے سے "اردو کا ابتدائی زمانہ" میں لکھتے ہیں کہ:

> "یہ بات یہاں دھیان میں رکھنے کی ہے کہ خسرو نے "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں اپنے بارے میں دعویٰ کیا تھا کہ میں ایک نئی قسم کے ایہام کا موجد ہوں... جب کہ نظری تنقید کی یہ ہلکی سی رمق جو ہم فخر دین نظامی کے یہاں دیکھتے ہیں، اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تخلیق اظہار کے وسیلے کے طور پر ہندی / ہندوی اب پختگی کی منزل کو پہنچ چکی ہے اسی طرح یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اردو میں نظری تنقید اور شعریات کے قدیم ترین اشاروں کا سلسلہ ایران یا عرب نہیں بلکہ ہندوستان کے عظیم ادبی نظریہ ساز سے قائم ہوتا ہے۔"[۲۱]

مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" مروجہ عشقیہ مثنویوں کی طرز پر بیان کی گئی ہے جس میں ایک واقعے کو داستان یا دیومالائی انداز میں منظوم کیا گیا ہے۔ اس کی خاص بات جزئیات نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری ہے جس کی نہایت ابتدائی شکل اس مثنوی کے بیانیہ میں نظر آتی ہے۔

مثنوی کے عنوانات فارسی زبان میں ہیں جبکہ متن دکنی زبان میں ہے۔ اس تفرق کی بنیادی وجہ تو یہ ہی ہو سکتی ہے کہ فارسی اس زمانے کی جدید زبان تھی جبکہ عوام الناس کی زبان دکنی تھی۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ نظامی کے پیش نظر عوام الناس میں مثنوی کا قبولیت عامہ حاصل کرنا ہو گا لہٰذا قصہ کی اصل زبان دکنی ہی رہی۔

شمس الرحمن فاروقی کہتے ہیں کہ "یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ فخر دین نظامی کا حدوث، شیخ باجن کے حدوث سے بالکل متوازی اور غیر متعلق ہے۔"[۲۲]

افسر صدیقی امروہوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے لسانی تشکیلات اور اسلوب کے حوالے سے کہتے ہیں کہ "نظامی اور باجن ایک ہی دور کے شاہر ہیں لیکن دونوں کی زبان میں بڑا فرق ہے۔"[۲۳]

افسر صدیقی کے خیال میں دونوں کا زمانہ بے شک ایک ہے مگر مقام الگ الگ گجرات اور دہلی قریب ہونے کے باوجود مقامی زبان میں کافی فرق رکھتے تھے۔ پھر ایک وجہ یہ بھی رہی ہو گی کہ شیخ باجن نے جو جکریاں (۴) کہی ہیں وہ تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں اور ان کا مقصد معرفتِ الٰہی، ذکر و شغل اور جذب و مستی کی کیفیات کا بیان ہے اور یہ بیان ایک خاص ذہنی سطح رکھنے والوں کے لیے تھا جب کہ نظامی کی مثنوی عوام الناس کے لیے تھی لہٰذا اس میں عوامی الفاظ کی بہتات اور محاورات کا کثرت سے استعمال نظر آتا ہے۔ واضح رہے کہ "شیخ باجن خود اپنی شاعری کی زبان کو دہلوی کہتے ہیں۔"[۲۴]

یہاں زبان کے تفرق کی مثال کے طور پر شیخ باجن اور نظامی کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

یوں باجن باجے رے اسرار چھاجے
مندل من میں دھمکے
رباب رنگ میں جھمکے
صوفی ان پر ٹھمکے
یوں باجن باجے رے اسرار چھاجے [۲۵]

جبکہ نظامی کا اسلوب کچھ یوں ہے:

جو کچ کال کرناسوں تو آج کر
نہ گھال آج کا کام توں کال پر
بھلے کوں بھلائی کرے کچ نہ ہوئے
برے کوں بھلائی کرے ہوئے توئے[۲۶]

نظامی کی مثنوی میں جابجا محاورات کا استعمال ملتا ہے۔ جو زبان کی پختگی کی دلیل ہے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ تلمیحات کا بکثرت استعمال شاعر کے زبان و بیان پر عبور اور فصاحت کا عکاس ہے تو ان کو شعوری سطح پر پرکھنے کا سہرا جمیل جالبی کے سر جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ مثنوی میں بیان کردہ قصہ ہندوی رنگ میں ہے مگر اس میں جو تلمیحات استعمال ہوئی ہیں وہ ہندو دھرم کے علاوہ مسلمانوں کے تاریخی واقعات اور شخصیات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں جیسے کہ کہ:

براہیم ادھم کہ جیوں چھوڑ راج

گیاراج تھل دے سنور آپ کاج (کتاب میں موجود شعر نمبر: ۲۱۵)

گویا یہ مثنوی مسلمان وہندوؤں کے امتزاجی قبولیت عامہ کی طالب تھی اور عوام میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے۔"کدم راؤ پدم راؤ" میں بعض اشعار ایسے بھی شامل ہیں جو نہایت آسانی اور قابل فہم زبان میں ہیں جبکہ نظامی کی زبان تقریباً ساڑھے چھ سو سال قبل کی زبان ہے۔

نظامی کے شعری اسلوب کے بہت خصائص ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ قابل توجہ یہ ہے کہ غیر مانوس الفاظ کے جابجا استعمال کے باوجود اشعار میں ایک آہنگ پایا جاتا ہے۔ نظامی کو اس تحریر کی بنیاد پر ایک کہنہ مشق استاد کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔"کدم رائو پدم رائو" کی شعری بحور شاہنامہ فردوسی کی مماثل معلوم ہوتی ہیں۔ مختلف تراکیب کا چابکدستی سے استعمال اور محاورات کا بر محل بیانیہ ایک خاص شعری لحن بناتا ہے جو خاص اس عہد کا عکاس ہے۔

> "کدم راؤ پدم راؤ" کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خلجی اور تغلق عہد میں شمال کی طرف سے جو نقل لسان ہوئی تھی اس نے دکن میں جڑ پکڑ لی تھی اور بہمنی دور میں اس پودے پر برگ وبار آگئے تھے اور یہ مثنوی نظامی نقل لسان کے ابتدائی ثمرات میں سے ایک ہے۔ سنسکرت پراکرتوں کے ساتھ ساتھ اس پر پنجابی اور سرائیکی لغات کا بھی اثر ہے اور یہ عمل پنجاب سے دلی اور دلی سے دکن تک زبان کے لسانی سفر کی کہانی کا اہم حصہ ہے اور اس کی شہادت قدیم اردو کی اس اولین تصنیف سے مل جاتی ہے۔"(۶۷)

اس مثنوی میں ساخت کے اعتبار سے فارسی روایت کا رنگ ملتا ہے۔ بحور کا انتخاب، مصرعوں کی تراش خراش اور اشعار کا باہمی ربط اس حقیقت کا عکاس ہے کہ نظامی فارسی کی شعری روایت سے آشنا تھا جبکہ زبان و محاورہ خالصتاً ہندوی اسلوبیات کا مظہر ہے۔

مثنوی کی قدامت کے بارے میں مختلف ماہرین کی مختلف آراء:

"نصیر الدین ہاشمی اور عبدالحق کے مطابق اس کا زمانہ تصنیف ۸۶۵ھ اور ۸۶۷ھ کے درمیان ہے۔ جبکہ افسر امروہوی اسے ۸۲۵ھ اور ۸۳۸ھ کے درمیان بتاتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں جمیل جالبی کے مباحث خاصے اہم ثابت ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ نظامی نے اسے ۸۳۴ھ اور ۸۳۹ھ کے درمیان تصنیف کیا یعنی ۱۴۳۰ء اور ۱۴۳۵ء کے بیچ، وہ اسے احمد شاہ ولی بہمنی کے دور کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ نظامی نے اس کا ذکر کیا ہے اور شہزادے احمد شاہ ولی کی تعریف بھی کی ہے۔"۶۸

جیسا کہ قدیم تصانیف میں یہ روایت ملتی ہے کہ وقت کے بادشاہ کی مدح مثنویوں میں شامل کی جاتی تھی۔ اور چوں کہ اس مثنوی میں احمد شاہ ولی کی مدح شامل ہے اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی احمد شاہ ولی کے عہد حکومت میں لکھی گئی

سیدہ جعفر کے مطابق

"مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" علاء الدین احمد شاہ ثانی (۱۴۳۵ء تا ۱۴۵۸ء) کے دورِ حکومت میں لکھی گئی۔ جیسا کہ مثنوی کی داخلی شہادت اور اشعار کے مفہوم سے ظاہر ہے۔"(۲۹)

مثنوی کے اشعار کی تعداد:

جمیل جالبی کی مرتبہ مثنوی "کدم رائو پدم رائو" کے اشعار کی تعداد ۱۰۳۲ ہے جبکہ افسر امروہوی نے ۱۰۲۹ ااشعار، نصیر الدین ہاشمی نے ۱۸۲۵ء اشعار اور سخاوت مرزا ۱۹۹۴ اشعار کی تعداد درج کی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ جمیل جالبی کا بیان ہی مستند سمجھا جائے گا۔

مثنوی کا ماخذ:

مثنوی کے ماخذ کے حوالے سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ کوئی قدیم کتاب یا قصہ نظامی کے پیش نظر رہا ہو گا اس سلسلے میں مختلف آرا ہیں۔

سخاوت مرزا نے لکھا ہے کہ:

" ممکن ہے یہ "سنگھاسن بتیسی" سے ماخوذ ہو۔ اس لیے کہ اس میں ایک لفظ "سنگھاسن" آیا ہے۔ لیکن سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ سخاوت مرزا کو تسامح ہوا ہے۔ "سنگھاسن بتیسی" نثری تصنیف ہے اور اس سے کدم راؤ پدم راؤ کا کوئی تعلق نہیں۔"(۳۰)

سیدہ جعفر کی رائے میں:

"کدم راؤ پدم راؤ" کا قصہ ہندوستانی لوک قصوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور اس میں ہندوستانی معاشرت اور ہندوستانی طرز فکر کا اثر نمایاں ہے۔"

ڈاکٹر پرکاش مونس نے "کدم رائو پدم رائو" کے اصل ماخذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح "فسانہ عجائب" از رجب علی بیگ سرور کا ماخذ جزوی طور پر "مکند اور وکرم" کی کتھائوں کا وہ حصہ ہے جو

سر گیندر کی تصنیف "پریم پیوندی" میں بیان کی گئی ہے جس میں "شہزادے کے جسم میں دغا بازی سے داخل ہونے والا خود اس کا وزیر زادہ ہے۔

مگر مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں "شہزادے کے جسم میں وہی جوگی داخل ہوتا ہے جس نے اس کو یہ فن سکھایا تھا۔"(۳۱)

لسانی تجزیہ:

سیدہ جعفر کے بقول"کدم راؤ پدم راؤ میں استعمال ہونے والے بارہ ہزار الفاظ میں سے دس ہزار سنسکرت کے ہیں اور عربی و فارس کےلگ بھگ دو سو۔"(۳۲)

جبکہ جمیل جالبی کے بیان کے مطابق "اس مثنوی میں تقریباً بارہ ہزار الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ان میں سے صرف سوا سو کے قریب الفاظ عربی و فارسی کے ہیں۔"(۳۳)

عربی و فارسی کے جو الفاظ مثنوی میں ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

"قلم، سرشت، فلک، فرشتے، توحید، نفر گفتار، نور، بنیاد، شرع، کسری و کے، درویش، خدا با صفا، الوالامر، نعت، مدح، سلطان، شاہ، شاد، عطادر، مسخر، علم، بر فون، طبل، جوزا، بارگہ، شر، گنج، در، کلر، تاج، شہنشہ، آل، ولی، لقب، جہانگیر، بہستی، دوں، تفنگ، گشتہ سر (یعنی سر گشتہ)، ولے، برائے، سلام، دنیا، ذکر، اردگاں، زنب، راہ رو، دل، بد، نابات، نقش، قضا، خر، فاختا (فاختہ)، جنت، عدل، قبا، وزارت، شہر، نقش باز، ہائے بند، بادبنی، امت، انشا اللہ تعالیٰ، فراش، سقا، مطبخی، سخی، حلال، جلال، میزبانی۔"(۳۴)

چونکہ مثنوی کی زبان ساڑھے چھ سو سال قبل کی ہے اور اس میں مقامی بولیوں کے علاوہ سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ بھی جابجا ملتے ہیں اس لیے مثنوی کی زبان عمومی قاری کے لیے غیر الفہم ہے تاہم نظامی نے جس قادر الکلامی سے مثنوی میں محاورات وضرب الامثال کا استعمال کیا ہے وہ اسے ایک بڑے شاعر کی صف میں شامل کرتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اہل علم کو جو دعوت فکر دی ہے تو محمد علی اثر اور وحید قریشی کے مطابق مثنوی میں درج ذیل مقامات پر ڈاکٹر جالبی سے اختلاف کی گنجائش نکلتی ہے۔

کپٹ بھائو تھیں مجہ اٹھے سیس اگ
بلندی چلے پائے تھیں سیس لگ (ص ۱۰۵، سطر ۲)

یہاں دوسرے مصرع میں "چلنے" کے بجائے معنوی اعتبار سے "چلے" ہونا چاہیے۔

بتولانہ کسنبلی پرن دیہہ گانٹھ (ص ۱۰۱، سطر ۴)

یہاں پر "بتولا" کی جگہ "پتولا" اور "کسنبلی" کی جگہ "کنبلی" ہونا چاہیے۔

کون پرس جونا گرے پائو تھیں (ص ۹۶، سطر ۱)

یہاں "قرس" کی جگہ "پرک" ہونا چاہیے تھا۔

دنیا جھوٹ ہے جیونا جھونٹ جان (ص ۸۹، سطر ۲)

اس مصرعے میں "جیونا" کی جگہ "جیوناں" اور "جھونٹ" کی جگہ "جھوٹ" ہونا چاہیے۔

نہ گل لاو مجہ کوں سدا سیو لک

تن او جھل نہ کر پلک ڈھانک چک (ص ۷۷، سطر ۱۲)

اس شعر کے پہلے مصرعے میں "سیو... لک" الگ الگ نہیں بلکہ "سیولک" ہونا چاہیے جبکہ دوسرے مصرعے میں "کر" کی جگہ "کرناں" ہونا چاہیے۔"[۳۵]

اسی طرح دیگر مقامات پر بھی معنوی ولسانی بہتری کے امکانات ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے چند ممکنات کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک مضمون "کدم رائو پدم رائو" میں کاتب نے چند مقامات پر اپنی مرضی سے متن کو تبدیل کر کے کچھ کا کچھ کر دیا ہے:

"۱۔ شعر ۷: "ادھک" کو "ادک" لکھا ہے۔

۲۔ شعر ۶۶: "تھئی" کو "تھی" لکھا ہے۔

۳۔ شعر ۳۹۱: "چند" کو "چندر" لکھا ہے۔

۴۔ شعر ۴۶۰: میں "روچند" کو "روجند" لکھا ہے۔

۵۔ شعر ۵۲۶: میں "توہیں" کو "تمہیں" لکھا ہے۔

۷۔ شعر ۷۵۱: میں "تر" کو "یہ" لکھا ہے۔

۸۔ شعر ۹۷۰ "گھات" کو "نات" لکھا ہے۔"[۳۶]

ڈاکٹر وحید قریشی اپنے مضمون "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" میں بعض جگہ فاضل مصنف جمیل جالبی سے اختلاف کرتے ہوئے چند تسامحات وممکنات کی نشاندہی یوں کرتے ہیں کہ:

"۱۔ شعر نمبر ۷۵ میں "بیجلی" نسخے میں "بجلی" ہے یہاں "اردو شہ پارے کی فرہنگ میں درج شدہ لفظی صورت کو ترجیح دی گئی ہے۔ نسخے میں اگر یہ کاتب کی ترمیم نہیں تو "بجلی" کو تشدید کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے اور علاقائی زبانوں میں آج بھی یہ صورت رائج ہے۔

۲۔ شعر نمبر ۱۰۰ اور ۵۹۱ میں "دنیا" کا لفظ درج ہے۔ قلمی نسخے میں "دُنی" لکھا ہے۔ اگر چھپائی میں چھوٹا الفا حذف نہیں ہوا تو اِسے "دُنی" پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ بدیں صورت دیباچے کے صفحہ ۳۸ کی مثال حذف ہو سکتی ہے۔

۳۔ شعر ۲۰۲ کے پہلے مصرعے میں "کہ" کے بعد قوسین میں "ہوئے" کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

۴۔ شعر نمبر ۲۲۷ میں پہلے مصرعے میں "نہ" کے بعد ایک اور "نہ" پڑھا جائے قلمی نسخے میں بھی یہ ہی صورت زیادہ موزوں ہے۔

۵۔ شعر ۲۳۱ کے دوسرے مصرعے میں قوسین کے اندر "اور" کی جگہ "ہور" کو رکھنا شاید زیادہ مناسب ہوتا۔

۶۔ شعر ۳۳۸ کا پہلا مصرعہ یوں پڑھا جا سکتا ہے "بہت جیو گھا(وا) ہوا گھائو توں"۔

۷۔ شعر ۳۳۵ کا پہلا مصرعہ یوں ہو سکتا ہے "دیے کپڑے ایکس اک تن و تن" اس طرح کی وائو مطف قدیم زمانے میں رائج تھی اور کاتب نے "ر" اور "و" کی املا میں جابجا ایک سا انداز رکھا ہے۔

۸۔ شعر نمبر ر ۴۴۵ کے دوسرے مصرعے میں "کذبہ" کی بجائے "کذب" پڑھا جائے۔

۹۔ شعر نمبر ۴۷۱ میں دوسرا مصرعہ قیاساً یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے "کہ دِنماں توں بدی مُنجہ (کوں) سکھائو"

۱۰۔ شعر نمبر ۵۰۳ میں دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیے کہ "اس بدھ تمھیں کیوں جلنہار ہوئے" "جلن ہار" کا لفظ شعر نمبر ۲۳۳ کے املا پر قیاس کر کے پڑھا گیا ہے۔

۱۱۔ شعر ۵۳۵ کا دوسرا مصرعہ یوں ہے "پڑی آس پر منجہ کروں تجہ حرام"

۱۲۔ شعر نمبر ۵۸۶ میں "کچ" کو میں "کُچ" پڑھتا ہوں۔ اسی طرح شعر ۵۰۷ اور ۹۵۷ میں بھی ہے۔

۱۳۔ شعر ۲۲۲ کا دوسرا مصرعہ مرتب نے یوں پڑھا ہے "اسنگت کے وہ من لگے بھی نہیں"۔ اور شعر نمبر ۶۵۰ کا پہلا مصرعہ یوں درج کیا ہے "کہیں باپڑا نار ہوں میان کال"۔ دونوں جگہ

"نہیں" اور "کہیں" کی املا مسودے میں ایک سی ہے یا دونوں جگہ "نہیں" پڑھا جائے یا دونوں جگہ "کہیں" پڑھا جائے یا "تمہیں" پڑھنا بھی ممکن ہے۔

۱۴۔ شعر نمبر ۶۹۸ یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے:

"کٹھا کھیل شطرنج بازی سو کھیل
ولے سینہ پکڑے گرا چھوڑ کھیل

۱۵۔ شعر ۶۹۹ میں دوسرا مصرعہ طریقہ کار کے تحت جو دیگر مقامات پر پیش نظر رکھا گیا ہے یوں ہو گا:

"پکڑ بیڑئیں ذات سولی دھرے"۔

۱۶۔ اشعار ۶۸۷، ۲۹۷ میں "منھکری" اور "پنجھکری" بظاہر ایک ہی لفظ ہے ممکن ہے پنجابی انداز میں "پنچیں گھڑی" (پانچوں وقت" لکھا ہو اور کاتب نے ادل بدل کر دی ہو۔ لفظ کو اس طرح پڑھنے سے دونوں شعر پورے ہو جاتے ہیں۔ باعتبار وزن بھی، اور باعتبار معنی بھی۔

۱۷۔ شعر ۷۳۹ میں "ہوا" نہیں بلکہ "ہول" پڑھا جائے "ل" کا املا واضح طور پر نسخے میں ہے۔ ان معنوں میں ہول (دہل ہو کر) کے معنوں میں شمار ہو گا۔

۱۸۔ شعر ۷۴۹ کو میں یوں پڑھتا ہوں:

اگر چور وہ جوئی یا ہوئے ساہ
پکڑ پیٹھ کو تس بھتر گھوڑے باہ

قلمی نسخے میں "جوئی" صاف درج ہے۔ "بکسر" کو شعر ۲۰۱ کے قیاس پر "پکڑ" پڑھیں گے "باہ" بمعنی "بیٹھ کر" ہے۔

۱۹۔ شعر نمبر ۸۵۴ کا پہلا مصرعہ یوں ہو سکتا ہے: "جو بونٹ اس دکھاوے (کہوں) بونٹ (توڑ) (۳۷)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک ادبی تحقیق ہوتی رہے گی لسانی روایت کی شناخت کے مباحث و موضوعات بھی غور و فکر کی نئی نئی جہات منکشف کرتے رہیں گے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے شیرانی کی جس روایت کی تقلید کی اس کی بنا پر انھوں نے قلمی نسخے کے اندازِ کتابت اور املائی خصوصیات کو سیاق عبارت کے ساتھ منطبق کر کے نتائج اخذ کیے ہیں۔ لہٰذا اغلاط و ابہام کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ مگر تحقیق میں بہتری کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔

ب۔ دیوان حسن شوقی:

قبل اس کے کہ ہم حسن شوقی کے "فتح نام نظام شاہ" اور "میز بانی نامہ" کی بات کریں ان بیاضوں کا مختصر تعارف کراتے چلیں جن بیاضوں سے یہ دونوں مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں۔

بیاض نمبر ا: مخزون انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی

یہ بیاض ۲/ا۔۹ انچ ۲/ا۔۵ انچ کی تقطیع پر لکھی گئی ہے۔ متن میں ۱۷ سطریں اور حاشیے پر ۳۴ سطور ہیں۔ عنوانات فارسی میں ہیں اور سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ خط نستعلیق خوشنما ہے۔ کل صفحات کی تعداد ۱۰۷ ہے۔ اس بیاض میں دس مثنویاں مشمول "فتح نامہ" اور "میز بانی نامہ" ہیں۔

"فتح نامہ نظام شاہ" کا ترقیمہ یہ ہے۔

"مرتب شد فتح نامہ نظام شاہ گفتار حسن شوقی۔"(۳۸)

جبکہ "میز بانی نامہ" کا ترقیمہ یہ ہے۔

"مرتب شد میز بانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ گفتار حسن شوقی۔"(۳۹)

کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں ہے۔

بیاض نمبر ۲: مخزون انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی۔

اس بیاض کے ابتدائی صفحات ضائع ہو چکے ہیں جبکہ کچھ ابتدائی صفحات آخر میں لگ گئے ہیں۔ "فتح نامہ" کا نسخہ ثانی اسی بیاض سے ماخوذ ہے۔ جو کہ بیاض اول کے نسخے کے مقابلے میں ناقص ہے۔ مگر تقابل اور درستگی کے لیے ہمیں اسی دوسرے معدوم نسخے پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

یہ بیاض ۲/ا۔۸ ۵ انچ کی تقطیع پر مشتمل ہے۔ کل صفحات کی تعداد ۱۶۰ ہے اور ہر صفحہ پر اوسطاً پندرہ سطور ہیں۔ صفحہ نمبر ا تا ۶ "فتح نامہ وجیا نگر" (فتح نامہ نظام شاہ) کا آخری حصہ ہے جس میں کل ۵۷ اشعار ہیں اور صفحہ نمبر ۱۴۹ سے ۱۶۰ تک اسی مثنوی "فتح نامہ نظام شاہ" کے اختتام تک کا حصہ موجود ہے۔ درمیان میں کوئی دوسرا "فتح نامہ" جو کہ جے سنگھ اور کسی صلابت خان کی جنگ کے بارے میں ہے لگا ہوا ہے۔

اس بیاض کا خط شکستہ ہے جدولیں نہیں ہیں مجموعی طور پر کرم خوردہ ہے۔ کہیں افقی انداز میں لکھا گیا ہے تو کہیں آڑا ترچھا۔ اس بیاض میں متفرق فارسی مکتوبات ہیں۔ چھ صفحات پر علم رمل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نعمت اللہ شاہ کا ایک فارسی مرثیہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شعرا کے مراثی کے علاوہ مقیمی کی ایک مختصر فارسی مثنوی بھی اس میں شامل ہے۔

کاتب کا نام موجود نہیں ہے جبکہ "فتح نامہ نظام شاہ" کا ترقیمہ ہے۔

من نوشتم انچہ دیدم در کتاب

عاقبت واللہ العلم بالصواب

تحریر فی التاریخ ششم، شہر ربیع الاول ۱۰۹۶ھ میں مقام بالاپور نوکری ہرجی راجہ۔[۴۰]

شاعر کا تعارف:

"نام شیخ حسن، شوقی تخلص، شوقی شاہ حبیب قدس سرہ کے مرید تھے۔"[۴۱]

حسن شوقی کی ابتدائی زندگی کے حالات پردہ اخفا میں ہیں۔ کوئی نہیں جانتا وہ کب اور کہاں پیدا ہوا اور زندگی کے ابتدائی ایام کیوں کر گزرے۔ اس کے اساتذہ کون تھے اور ادبی تربیت کس کے زیر سایہ ہوئی۔

ان کے کلام کی داخلی شہادتوں اور چنیدہ تذکروں سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حسن شوقی نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام احمد نگر میں گزارے اور یہاں وہ نظام شاہی دربار سے وابستہ تھا مگر جب ۱۶۰۰ء میں مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کیا تو بہت سے لوگ قریبی شہروں میں ہجرت کر گئے۔ حسن شوقی نے بھی بیجاپور ہجرت کی اور یہاں بھی شاہی دربار سے وابستہ ہوا۔ محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستگی کے نتیجے میں ہی "میزبانی نامہ" جو کہ محمد عادل شاہ کی شادی کی تقریب کی منظوم روداد ہے لکھی۔

"حسن شوقی نے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ نظام شاہ، محمد عادل اور ابراہیم عادل شاہ۔"[۴۲]

حسن شوقی کا سن پیدائش نامعلوم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک تحقیق کے مطابق اس کی عمر کا تعین ۱۵۴۱ئ۔ ۹۴۸ھ فرض کیا ہے۔ یہ تحقیق بھی ایک تخمینہ پر ہے کہ اگر جنگ تالی کوٹ کے موقع پر شوقی کی عمر تقریباً پچیس سال کی فرض کر لی جائے تو ۱۵۴۱ء اس کی پیدائش کا سال ہو سکتا ہے۔

اس ضمن میں تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

"گویا وہ گولکنڈہ کے پہلے حکمران سلطان قلی قطب الملک (م ۱۵۴۳ء)، بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ اور احمد نگر کے بادشاہ برہان نظام شاہ ۱۵۵۳ء۔ ۱۵۰۸ء کے زمانے میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز گولکنڈہ کے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰ء۔ ۱۵۵۰ء) بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ اول ۱۵۵۰ء۔ ۱۵۳۵ء اور احمد نگر کے حسین نظام شاہ ۱۵۶۴ء۔ ۱۵۵۳ء کے دور میں کیا ہو گا۔"[۴۳]

حسن شوقی غالباً ایک طویل عرصہ تک نظام شاہی دربار سے وابستہ رہا اور اپنی مشہور مثنوی "فتح نامہ نظام شاہ" قیام احمد نگر کے دوراں ۱۵۶۴ء میں لکھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب احمد نگر تباہی کے قریب تھا۔ مغلوں کی طرف سے مختلف ریاستوں پر پیش قدمی جاری تھی۔ احمد نگر پر مغلوں کا پہلا حملہ ۱۵۹۵ء میں شہزادہ مراد کی سرکردگی میں ہوا۔ اس کے بعد حملوں کا یہ سلسلہ چالیس سال تک جاری رہا اور ریاست کو کچھ نہ کچھ کمزور کرتا رہا۔ بالآخر ۱۶۳۵ء میں احمد نگر کا مکمل خاتمہ ہو کر مغلوں کا تسلط قائم ہوا۔ لہٰذا حسن شوقی احمد نگر سے ہجرت کر کے بیجاپور آ گیا اور یہاں بھی وہ دربار شاہی سے وابستہ ہو گیا اور یہیں بادشاہ محمد عادل شاہ(۱۶۵۶ء۔۱۶۲۷ء) کی شادی کی روئیداد "میزبانی نامہ" کی صورت میں لکھی۔ مگر جلد ہی اسے مصائب زمانہ اور سیاسی شکست وریخت نے دوبارہ ہجرت پر مجبور کر دیا۔ لہٰذا زندگی کے آخری ایام میں اس نے گولکنڈہ ہجرت کی۔ یہ زمانہ محمد قطب شاہ(۱۶۲۶ء۔۱۶۱۱ء) کا تھا اور یہاں بھی وہ شاہی دربار سے وابستہ ہوا۔ گولکنڈہ میں ہی حسن شوقی کا انتقال ہوا۔

کتاب کا تعارف:

"دیوان حسن شوقی" کے نام سے شائع ہونے والی کتاب ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی۔ جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں حسن شوقی کی دو مثنویاں اور (۶۹) انہتّر غزلیں شامل ہیں۔ مثنوی اول "فتح نامہ نظام شاہ" ۶۲۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ جبکہ دوسری مثنوی "میزبانی نامہ" ۲۱۴ اشعار کا مجموعہ ہے۔

اول الذکر "فتح نامہ نظام شاہ میں احمد نگر کے بادشاہ نظام شاہ کی مدح سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی جنگ تالیکوٹ کے بیان پر مشتمل ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ دکن کی مشہور جنگِ تالی کوٹ ۹۷۲ھ / ۱۵۶۴ء میں لڑی گئی۔ جس میں نظام شاہ کے علاوہ علی عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ اور علی برید شاہ بھی شامل تھے۔

یہ جنگ وجیا نگر کے راجہ رام راج اور نظام شاہ کی متحدہ فوج کے درمیان لڑی گئی۔ جس میں رام راج کو شکست ہوئی اور وجیا نگر کی سلطنت ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے نابود ہو گئی۔ وجیا نگر کے راجہ رام راج کو نظام شاہ سے خاص دشمنی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ وقتاً فوقتاً احمد نگر اور آس پاس کی مسلم ریاستوں پر حملے کرتا رہتا تھا اور اس طرح وہ دکن کے ایک بڑے حصہ کا دعوی دار بن چکا ہے۔ مسلمانوں سے شدید نفرت کے باعث وہ مسلمان ریاستوں پر ہر قسم کی زیادتی اور ظلم روا رکھتا تھا۔ مسلمان ایلچیوں تک سے بہت برا سلوک کرتا تھا۔ مسلمان ریاستیں آپس کے نااتفاقی کے باعث اس کی تمام زیادتیاں برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ مگر رام راج کی سیاست کا سارا دارومدار مسلمان ریاستوں سے میل ملاپ پر تھا وہ کبھی ایک بادشاہ سے مل جاتا اور دوسروں کو تنگ کرتا کبھی

دوسرے سے اتحاد کرلیتا۔ بالآخر مسلمان بادشاہوں نے آپس میں اتحاد کرلیا اور تاریخ ساز جنگ کی۔ جیسے جنگ تالیکوٹ کا نام دیا گیا جس میں رام راج کو شکست ہوئی وہ قتل ہوا اور وجیا نگر کا نام ونشان مٹ گیا۔

اس تاریخ ساز جنگ میں احمد نگر کے نظام شاہ کے علاوہ ابراہیم قطب شاہ، (قطب شاہی سلطنت کا)، علی عادل شاہ، (عادل شاہی سلطنت کا) اور علی برید شاہ، برید شاہی سلطنت کا بادشاہ بھی شامل تھے اور یہ فتح ان سب کی مشترکہ فتح تھی۔ مگر حسن شوقی نے اس فتح کا سہرا ''نظام شاہ" کے سر باندھا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ خود احمد نگر کا باشندہ تھا اور اپنے بادشاہ سے انسیت رکھتا تھا۔ یا شاید کسی مالی اعانت یا انعام کے لالچ میں اس نے ایسا کیا۔ قطع نظر ان حقائق کے حسن شوقی نے مثنوی "فتح نامہ نظام شاہ" کی صورت میں قدیم ادب کا شاہکار تخلیق کر دیا ہے۔

اس رزمیہ مثنوی میں حسن شوقی نے اصل حقائق پر مبنی تاریخ کو نہایت چابکدستی سے قلم بند کیا ہے۔ رام راج کی دشمنی، جنگی تیاریاں، پھر میدان کارزار کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ اس عہد کی پوری تصویر تاریخی حقائق کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ الفاظ وبیان ایسا ہے کہ جیسے کسی مشاق شاعر کا ہوتا ہے۔ اس پر آگے تفصیلاً بات ہوگی۔

دوسری مثنوی "میزبانی نامہ" ہے جس میں بادشاہ محمد عادل شاہ کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا ہے جو اس زمانے کی معاشرت کی بہترین عکاس ہے۔

اس کے علاوہ ''دیوان حسن شوقی" میں حسن شوقی کی کچھ غزلیں بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں ایک فکر انگیز مقدمہ بھی شامل ہے۔ حسن شوقی قدیم دکنی ادب کا ایک باکمال شاعر تھا۔

حسن شوقی کا تعارف جولائی ۱۹۳۹ء میں مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" میں ایک مقالے کے ذریعے کرایا۔ اس مقالے میں انھوں نے حسن شوقی کے ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ دستیاب دو مثنویوں اور تین غزلوں کا بھی تعارف پیش کیا ہے۔

۱۹۵۴ء میں سخاوت مرزا نے رسالہ "اردو" (کراچی) کے اپریل کے شمارے میں حسن شوقی کی تین مزید غزلوں کا تعارف پیش کیا۔ جو انھوں نے انجمن ترقی اردو کی مختلف بیاضوں سے دریافت کیں تھیں۔

۱۹۶۵ء میں حسینی شاہد نے (قدیم اردو، جلد اول مرتبہ مسعود حسین خان) پانچ اور غزلیں شائع کیں۔

بعد ازاں ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی کی تیس غزلیں، فتح نامہ نظام شاہ" اور "میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ" پر مشتمل دیوان حسن شوقی کو مرتب کر کے شائع کرایا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ قدیم ادب ہی دراصل جدید ادب کی اصل ہے۔ لہٰذا ہمیں غزل کے ابتدائی نقوش دکنی شعرا فیروز، لطفی، خیالی اور مشتاق وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں جو باقاعدہ غزل کی شکل میں حسن شوقی کے کلام میں یک جا کر منفرد رنگ میں جلوہ گر ہوتی نظر آتی ہے اور مختلف شعرا کے ارتقائی تجربات سے گزرتی ہوئی ولی دکنی تک پہنچتی ہے۔ مگر باقاعدہ غزل کے ابتدائی نمونے حسن شوقی کے یہاں ہی ملتے ہیں۔ گویا ڈاکٹر جمیل جالبی حسن شوقی کو دیوان حسن شوقی کے مقدمے میں روایت کا سنگم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"قدیم ادب میں حسن شوقی روایت کے ایک ایسے درمیانی پل کی حیثیت رکھتا ہے جس پر سے گزرے بغیر ولی کی روایت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔"(۴۴)

حسن شوقی کے حالات کا ذکر کسی قدیم تذکرے میں نہیں ملتا۔ اس کے حالاتِ زندگی کا اندازہ اس کی دستیاب قلمی کاوشوں کے داخلی شواہد سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ بقول جمیل جالبی:

"فتح نامہ نظام شاہ" سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حسن شوقی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دکن کی نظام شاہی ریاست میں گزارا ہو گا۔ کیونکہ مثنوی میں جس جنگِ تالیکوٹ کا ذکر کیا گیا ہے وہ ۱۵۶۴ء / ۹۷۲ھ میں ہوئی تھی۔ اس وقت غالباً حسن شوقی نظام شاہی دربار سے وابستہ تھا کیونکہ مثنوی میں نظام شاہ کی شان میں مدح سرائی کی گئی ہے۔(۴۵)

جنگ تالیکوٹ میں صرف نظام شاہ نے ہی رام راج کا مقابلہ نہیں کیا تھا بلکہ مسلمان ریاستوں کے حکمرانوں نے متحد ہو کر وجیا نگر کے رام راج سے مقابلہ کیا تھا۔ جن میں عادل شاہ اول، علی برید شاہ، حسین نظام شاہ اول اور ابراہیم قطب شاہ شامل تھے۔ مگر حسن شوقی نے تمام تر کامیابیوں کا سہرا صرف اور صرف نظام شاہ کے سر تسلیم کیا ہے اور جنگ کا اصل ہیرو نظام شاہ کو قرار دیا ہے۔ اس بات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حسن شوقی نے اس مثنوی کا عنوان جنگ تالیکوٹ کے نام پر نہیں بلکہ نظام شاہ کی فتح کے نام پر "فتح نامہ نظام شاہ" رکھا۔ لہٰذا اس نے اپنے بادشاہ کو اس جنگ کا ہیرو قرار دیا۔ یہ امر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ نظام شاہی دربار سے وابستہ تھا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اس مثنوی کا لب و لہجہ فارسی اسلوب میں ڈوبا ہوا ہے جو کہ نظام شاہی دور کے شعرا کی صفت تھی۔

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "فتح نامہ نظام شاہ" کی تصنیف کے وقت حسن شوقی نظام شاہی دربار سے وابستہ تھا۔

"فتح نامہ نظام شاہ" کے انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی میں دو نسخے ہیں۔ ایک وہ جس کا تعارف ۱۹۲۹ء میں مولوی عبدالحق نے کرایا تھا۔ شاید اولین ہونے کی وجہ سے مولوی عبدالحق اسے نسخہ اول قرار دیتے ہیں جبکہ

دوسرا نسخہ جو مولوی صاحب کے مطابق ناقص ہے۔ اس ناقص نسخے میں نہ صرف آخر کے کچھ دعائیہ اشعار زائد ہیں بلکہ اس نسخے میں فتح وجیا نگر کا سن بھی دیا گیا ہے۔ نظام شاہ کے بارے میں دعائیہ اشعار سے مولوی عبد الحق کا قیاس ہے کہ یہ اشعار الحاقی ہیں۔ یہ دونوں نسخے مولوی عبد الحق کی ملکیت تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی "دیوان حسن شوقی" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ میرے پیش نظر بھی یہ ہی دو نسخے رہے ہیں۔ مگر جمیل جالبی مولوی عبد الحق سے متفق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"نسخہ ثانی جس میں اشعار کے الحاقی ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے کہ شروع کے صفحات پر مولوی صاحب نے اپنے قلم سے "جنگ وجیا نگر از ص ا تا ص ۳۶" کے الفاظ لکھے ہیں۔"(۴۶)

لیکن جب جالبی صاحب نے بیاض میں شامل اس مثنوی کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ جنگ وجیا نگر کا قصہ صفحہ نمبر ٦ پر ختم ہو جاتا ہے اور صفحہ نمبر ٦ سے ہی دوسری مثنوی جس میں مغل سپہ سالار راجہ جے سنگھ سے بیجاپور کی کسی جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے، شروع ہوتی ہے۔ صفحہ نمبر ٦ پر شوقی کے فتح نامہ کے اختتام پر کاتب نے یہ ترقیمہ درج کیا ہے۔

من نوشتم انچہ دیدم در کتاب

عاقبت اللہ والعلم بالصواب

کاتب کا نام موجود نہیں ہے مگر:

"تحریری التاریخ ششم بشر ربیع الاول ۱۰۹۶ھ من مقام بالا پور" کے الفاظ لکھ کر تاریخ اور سن کتابت دے دیا ہے۔"(۴۷)

اس نسخے میں صفحہ نمبر ۱۴۹ پر دوبارہ "فتح نامہ نظام شاہ" شروع ہو جاتا ہے جو کہ ص ۱٦۰ تک جاتا ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق اس نسخے کے شروع کے صفحات ضائع ہو گئے اور کچھ ابتدائی صفحات آخر میں لگ گئے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ نسخہ ثانی کے اشعار نسخہ اول کی نسبت زیادہ مکمل ہیں۔ اس میں جنگ کے بعد کے حالات اور میدان جنگ کے واقعات زیادہ ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں۔ جمیل جالبی کا خیال ہے کہ اگر دونوں نسخوں کو ملا کر پڑھا جائے تو مثنوی مکمل ہو جاتی ہے۔

"فتح نامہ نظام شاہ" کے مقابلے میں "میزبانی نامہ" میں زبان واسلوب زیادہ پختہ نظر آتا ہے۔ اول الذکر میں جہاں منظر کشی اور میدان کارزار کا بہترین نقشہ کھینچا گیا ہے جہاں الفاظ و محاورے پر عبور کے ساتھ ساتھ روانی بیان اور تشبیہات و محاورات کا جابجا استعمال نظر آتا ہے اور جنگی سامان کی تفصیلات، نیکی بدل کا تصور اور اسلام کی

سربلندی جیسے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں تو "میزبانی نامہ" میں فارسیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے جو بیجاپور کی نمایاں خصوصیت ہے۔

بقول جمیل جالبی:

"اس (میزبانی نامہ) میں شاعری بھی زیادہ ہے اور تخیل کی پرواز بھی۔ پوری مثنوی میں ایک چلت پھرت، ایک ہنگامے، ایک دھوم دھام کا احساس ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس شادی میں شریک ہے۔"(۴۸)

جمیل جالبی کہتے ہیں کہ "فتح نامہ نظام شاہ" میں احمد نگر کا مقامی رنگ نمایاں ہے جبکہ سلطنت نظام شاہ سے وابستگی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ تالی کوٹ جس میں چار بادشاہ رام راج کے مقابل تھے مگر شوقی جنگ تالی کوٹ کی فتح کا سہرا نظام شاہ کے سر باندھا ہے۔

"فتح نامہ نظام شاہ" کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ یہ جنگ کسی فرضی داستان یا قصے کا ثمر نہیں بلکہ یہ عین تاریخی واقعہ ہے۔ اس سے قبل بھی دکنی ادب میں بہت سی مثنویاں مختلف قصص پر مبنی ملتی ہیں۔ مگر ان میں یا تو تاریخی حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے یا پھر فضی واقعات تاریخ سے منسوب کر دیئے گئے مگر "فتح نامہ نظام شاہ" حقیقی تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ اس مثنوی کے تمام کردار اصل ہیں۔ اسی طرح "میزبانی نامہ" میں بھی جن شخصیات و کردار کا ذکر ملتا ہے وہ بھی حقیقی ہیں۔

ایک اور خصوصیت ان مثنویوں کی یہ ہے کہ ان میں اول الذکر میں جنگی ہتھیاروں کے نام اور آخر الذکر میں برتنوں، کھانوں اور رسم ورواج کے سلسلے میں مستعمل بے شمار اشیا کے نام اور استعمال ملتا ہے۔ یہ نہایت جزوی اور معمولی اشیا تھیں۔ حتی کہ ان کے نام تک کسی اور جگہ نہیں ملتے۔ اس لحاظ سے شوقی کا کلام الفاظ وبیان کا نہایت عمدہ ذخیرہ بھی ہے۔ جس کی تفہیم جمیل جالبی نے کمال محنت سے ممکن بنائی۔ فاضل مولف نے غیر مانوس الفاظ کی باقاعدہ ایک فرہنگ کتاب کے آخر میں ترتیب دی ہے۔ جس سے کلامِ شوقی کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔

دونوں مثنویوں میں نیکی اور بدی کا اصلاحی تصور ملتا ہے جیسا کہ عام طور پر نیکی کی فتح اور برائی کی شکست کا تصور انسان میں اخلاقی خوبیوں کا باعث بنتا ہے۔

"فتح نامہ نظام شاہ" میں اسلوب کا اتار چڑھائو حسن شوقی کے قادر الکلام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جہاں گھمسان کی لڑائی ہے وہاں الفاظ بھی پر شکوہ اور جاندار استعمال ہوئے ہیں۔ جہاں بدی کی مذمت ہے وہاں اسی لحاظ سے اسلوب دھیما مگر نصیحت آموز نظر آتا ہے۔ ایک بڑے شاعر کی یہ بھی خوبی ہوتی ہے کہ کرداروں کے لب

ولہجے ان کی شخصیت کے مطابق ہوں جیسے رام راج کی گفتگو کے لیے سنسکرت آمیز الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے جبکہ نظام شاہ کی گفتگو کے الفاظ میں فارسیت کا رنگ غالب ہے۔ گویا رام راج اور نظام شاہ نیکی اور بدی کے نمائندہ کردار ہیں یہ جنگ حقیقتاً کشور کشائی کے لیے نہ تھی بلکہ اصل وجہ اسلام کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی تھا۔ شوقی کو رزم وبزم دونوں کے بیانیہ پر عبور تھا۔ جس کی مثال یہ دونوں مثنویاں ہیں۔ ان دونوں مثنویوں میں الگ الگ رنگ ملتا ہے جبکہ حسن شوقی کی غزلیں ان دونوں مثنویوں کے اسلوب سے مختلف نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی دسویں صدی کے اس شاعر حسن شوقی کے اسلوب کو روایت سے جدیدیت کی طرف گامزن قرار دیتے ہیں جس میں فارسی آہنگ کی ہلکی ہلکی آنچ اس کے کلام بیان کو منفرد بناتی نظر آتی ہے۔

حسن شوقی کی غزل:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی کی تقریباً تیس غزلیں جس میں سے زیادہ تر نو دریافت تھیں زیر تذکرہ کتاب میں شامل کیں۔ ہم اس سے قبل "فتح نامہ نظام شاہ" اور "میزبانی نامہ" پر نظر کر چکے ہیں جس میں اول الذکر ہندی روایت کی عکاسی، جبکہ آخر الذکر جدیدیت کی رو میں فارسی آہنگ کی مظہر ہے۔

دسویں صدی ہجری کے شاعر حسن شوقی کا جو کلام دستیاب ہوا ہے وہ اس قدر چنیدہ ہے کہ سب کا سب انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ حسن شوقی کو اس کے کلام کی سلاستِ بیان اور اسلوب نگارش نے صف اول کا شاعر بنا دیا ہے۔ جہاں ان کے متذکرہ بالا مثنویاں منظر نگاری اور جزئیات نگاری رزم وبزم کا مرقع ہیں وہیں اس کی غزلیں معاملہ بندی اور ہجر ووصال کے معاملات کے بیان میں اپنی مثال آپ ہیں۔

مقام تعجب تو یہ ہے کہ ولی دکنی جو اردو غزل کی روایت کا بانی تھا وہ خود حسن شوقی کا مقلد تھا اور خود کو فخریہ شوقی کے اسلوبِ سخن کا نمائندہ گردانتا تھا۔

بر جا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دجے
پار رکھ شوق میرے شعر کا شوقی حسن آوے (۴۹)

شوقی چار صدی قبل کا شاعر ہے۔ اس طویل دور میں زبان نے کئی صورتیں بدلیں۔ اردو زبان تراش خراش، رد وقبول، ترک واختیار کے مقصد ومنازل سے گزر کر آج جس شکل میں ہمارے سامنے ہے اس کے مقابلے میں چار سو سال قبل کی زبان کی تفہیم کو سمجھنا از خود کارِ دشوار تھا۔ مگر جمیل جالبی نے اس دور کی لسانی خصوصیات کو نہ صرف سمجھا بلکہ مختلف فرہنگوں کے ذریعے ان کے مفاہیم ومطالب کو قابل فہم بنایا۔ مگر ہم دیکھتے

ہیں کہ چار سو سال قبل کی زبان میں بھی کچھ ایسے محاورات و تماثیل اور الفاظ ایسے ملتے ہیں کہ جو آج بھی ہماری مروجہ زبان کا حصہ ہے۔ شوقی کے کلام میں ایک خاص آہنگ پایا جاتا ہے جو شعری ربط کو دوچند کر دیتا ہے۔

اب ہم حسن شوقی کے "دیوان حسن شوقی" میں شامل غزلوں پر ایک نظر ڈالیں گے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں کہ:

"حسن شوقی کی غزلیں اسی روایت کی ابتدا ہیں جس کے فراز پر ولی دکنی کی غزل کھڑی ہے۔ ان غزلوں کو جدید معیار سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن یہ غزلیں اپنے معیار کے اعتبار سے جدید غزل کی ابتدائی روایت اور رنگ وروپ کا ایک حصہ ہیں۔"(۵۰)

حسن شوقی کی غزل میں بقول جمیل جالبی غزل کا وہی بنیادی تصور بدرجہ اتم نظر آتا ہے جس کے تحت غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ حسن شوقی نے اپنی غزل میں اولین التزام یہ ہی رکھا۔

حسن شوقی فارسی رنگ غزل میں ڈوب کر پوری سچائی کے ساتھ ان شعرا کا ذکر بھی بے دریغ کرتا ہے جن کی شاعری اور اسلوب سے وہ متاثر تھا۔

جب عاشقاں کی صف میں شوقی غزل پڑے تو
کوئی خسروی، ہلالی، کوئی انوری کہتے ہیں (۵۱)

ہمارا حسن ہے شوقی مسلم ذہن کوں تیرے
سبق پہ عنصری کا یا درس کچہ انوری کا ہے (۵۲)

شوقی کی غزل میں مرکزی تصور "عشق مجازی" کا ہے۔ یہاں فارسی غزل کی تتبع میں شمع و پروانہ، گل وبلبل، زاہد وناصح، زلفِ پیچاں، گل پیرھن، شیریں فریاد اور عذرا اور امق کے روایتی استعارات بھی جابجا مستعمل نظر آتے ہیں۔

کہیں وامق کہیں عذرا کہیں مجنوں کہیں لیلیٰ
کہیں خسرو کہیں شیریں کہیں فرہاد ہوے ہے

یا یہ شعر:

دربزمِ ماہ رویاں خورشید ہے سریجن
میں شمع ہوں جلوں گی وہ انجمن کہاں ہے (۵۳)

جمیل جالبی کی رائے میں حسن شوقی کی غزل میں وصال کی خوشبو، محبوب کی ادائیں، رمز و کنایات، چہرے کے خط و خال کا بیان اور محبوبانہ ادائوں کی تفصیلات اس قدر اہتمام سے بیان ہوئیں ہیں کہ نئی نئی تراکیب نے اردو غزل میں راہ پائی اور یہی طرز بیان وسیع تر ہو کر ولی دکنی کی غزل میں اپنی معراج پاتا ہے۔

شوقی کی غزل میں فارسی غزل کے اثرات نے عورت کو محبوب بنا دیا ہے جب کہ ہندوی آہنگ کی غزل میں مرد محبوب اور عورت محب ہوتی تھی۔

حسن شوقی کی غزلوں کے ساتھ ساتھ اس کے قریب ترین عہد کے نامور شعرا محمود، خیالی اور فیروز جیسے شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ بات حیران کن حد تک واضح ہوتی ہے کہ ان چاروں شعرا نے جس روایت کو صنف غزل میں ترویج دی وہیں آگے چل کر شاہی، نصرتی، اور ہاشمی سے ہوتی ہوئی ولی دکنی تک پہنچ کر غزل کے واضح شکل میں سامنے آئی۔

ان چاروں شعرا نے ایک دوسرے کی زمین میں اشعار کہے ہیں۔ غالباً اس عہد میں غزل کا جو رنگ وروپ اور معیار تھا وہ اس عہد کے حساب سے جدید اور منفرد تھا۔ اس دور میں کسی کی زمین میں غزل کہنا دراصل اس بات کی دلیل تھی کہ وہ شاعر اتنا متاثر کن ہے کہ اس کی شاعری ایک معیار کی صورت اس کے ذہن میں مرکوز ہو گئی ہے۔

حسن شوقی صرف اپنے ہی زمانے کا شاعر نہ تھا بلکہ وہ مستقبل کا شاعر تھا۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ مستقبل کے شعری رجحانات پر مسلسل شوقی کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے فکری اثرات اور افکار کی توسیع مسلسل ارتقا پذیری کی طرف مائل ہے۔ جمیل جالبی کہتے ہیں کہ:

> "جیسے دسویں صدی ہجری کی غزل پر محمود، فیروز اور خیالی کا سایہ پڑتا نظر آتا ہے اسی طرح نصف سے زیادہ گیارہویں صدی ہجری تک حسن شوقی کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ حسن شوقی کی زبان اس زمانے کی دکن کی عام بول چال کی زبان ہے اس میں ان تمام بولیوں اور زبانوں کے اثرات کی ایک کھچڑی سی پکتی دکھائی دیتی ہے جو آئندہ زمانے میں یک جاں ہو کر اردو کی معیاری شکل متعین کرتے ہیں۔"[۵۴]

گویا نصرتی سے شروع ہونے والا فارسی روایت کے انجذاب کا عمل حسن شوقی سے ہوتا ولی دکنی تک ایک باقاعدہ تسلسل سامنے آتا ہے گویا صدیوں کے ردو قبول کے نتیجے میں روایت سے بتدریج جدت تک جو پختگی اردو لسان وکلام میں نظر آتی ہے اس کے تسلسل میں شوقی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگرچہ شوقی کا ذکر کسی اہم قدیم تذکرے یا تاریخ میں مفقود ہے مگر کچھ شعرا نے اپنے کلام میں حسن شوقی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جن میں ابن نشاطی اپنی مایہ ناز تصنیف "پھول بن" میں کہتا ہے کہ:

حسن شوقی اگر ہوتے فی الحال
ہزارا بھیجتے رحمت مجہ اپر ال (۵۵)

سید اعظم بیجاپوری نے "فتح جنگ" ۱۰۷۷ھ میں لکھا ہے کہ:

سلاست میں جیوں شعر شوقی حسن
نہر فن منیں نصرتی کے بچن (۵۶)

پھر نصرتی جیسا قادر الکلام شاعر بھی اپنے قصیدے "علی نامہ" میں اپنی شاعرانہ عظمت کے اظہار کے لیے حسن شوقی کو معیار تسلیم کرتا ہے۔

دس پانچ بہت اسی دھات میں کے ہیں تو شوقی کیا ہوا
معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس بستار کا

اشرف بھی اپنے کلام میں شوقی کا حوالہ یوں دیتا ہے:

سارے لوگاں کتے اشرف کا شعر سن کر
کیا پھر جیا ہے شوقی یاراں مگر دکن میں

جمیل جالبی ادبی تحقیق میں یوں رقم طراز ہیں کہ حسن شوقی کا رنگ دسویں صدی ہجری کے شعرا، مشتاق، لطفی، محمود، فیروز اور خیالی کے رنگ سے مل کر ایک نئے روپ میں ملتا ہے اور غزل کا یہ روپ شاہی نصرتی، ہاشمی، اشرف، سالک، یوسف، تائب اور قریشی سے ہوتا ہوا ولی کی غزل میں پوری آب و تاب کے ساتھ آموجود ہوتا ہے۔

شوقی کے بعد آنے والے شعرا نے اشرف، شاہی، وجہی وغیرہ نے شوقی کی زمین میں جابجا غزلیں کہی ہیں۔ حتی کہ اشرف کے یہاں تو تضمین کے اشعار بھی جابجا ملتے ہیں۔

عجب دستے ہیں تو شاعر تخلف پر تکلف ہے
ہوئے مدہوش حیرت سوں مگر وحشیاں کی یو صف ہے
سمجھنا غور سوں شوقی کہ یو تفسیر مصحف ہے
جہاں کے شاعراں بھیتر عجب عاجز یو اشرف ہے

اسی ملک دکن میں نے مگر شوقی حسن نکلے

"ادبی تحقیق" میں جمیل جالبی نے شوقی کے رنگ میں شاعری کرنے والے یوسف کے ایک دوغزلہ کا ذکر کیاہے۔ بعنوان "درجواب حسن شوقی" اس میں شوقی کا سا انداز نمایاں ہے۔

توں شاہ دلبری ہے جو نامیں برتری ہے
یاماہ مشتری ہے یامہر ہے فلک کا

دیوان حسن شوقی میں "درجواب شوقی" کے تحت ایک اور شاعر سالک کی غزل کے چند اشعار دیکھیں تو شوقی کا سا انداز بیان محسوس ہوتا ہے:

تجہ لٹ لٹلتا ناک جب مجہ دل کوں آلٹ پٹ ہوا
بس چڑتداں تے تار سا سب دل میرا کھٹ کھٹ ہوا
تجہ زلف کا ہو کفر سوں اسلام تے بیٹھا ہے کہ
تسبیح سالک توڑ کر کلجانو ابھا بھٹ ہوا(۵۷)

اسی "درجواب شوقی" میں قریشی کی غزل بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جو شوقی کی زمین میں کہی گئی ہے:

سکی تجہ بن کہ جوں باوبگولا ہر کدر پھرتا
جو لیلیٰ بن کہ جوں مجنوں دیوانہ ہر کدر پھرتا
سکی تجہ نے کہ دل ہر چند پھرادوں ہر طرف اپنا
نہیں پھرتا کہ جوں قبلے نما قبلے اودھر پھرتا
قریشی کو بلا پیارے انجل او جل کہے ہنس کر
سیاناہو اپس سہتی کہ کیوں تو بے خبر پھرتا(۵۸)

اس کے علاوہ تائب نے بھی حسن شوقی کو استاد مانا ہے۔ یہ مصرعہ دیکھیں:

"استاد کے بچن سوں خورشید ہو پڑیایو"

یہ مصرعہ تضمین ہے جو کہ تائب نے شوقی کی مشہور غزل "شہ پری کتے، مشتری کتے" میں استعمال کیا ہے۔

متذکرہ حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حسن شوقی اپنے عہد کا نابغہ تھا جس نے نہ صرف اپنا آپ منوایا بلکہ بعد میں آنے والوں کے لیے ایک منفرد راہ ہموار کر دی۔

ج۔ دیوان نصرتی:

شاعر کا تعارف:

"تذکرہ شعرا دکن" نے نصرتی کا نام محمد نصرت لکھا ہے اور چمنستان شعرا کی پیروی میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ حاکم کرناٹک کے قرابت داروں میں سے تھا۔ لیکن کوئی حوالہ یا ثبوت اس کے لیے پیش نہیں کیا۔

"گلشن عشق" میں یہ شعر ملتا ہے جو نصرتی کے نام کے حوالے سے تصدیق کرتا ہے:

دکھن میں توں ہے آج نصرت قریں
بلند شعر کے فن میں سحر آفریں(۵۹)

"اور جہاں تک نصرتی برہمن ہونے کا تعلق ہے تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ نسل در نسل مسلمان تھا۔"(۶۰)

حضرت گیسو دراز کی مدح میں کہے گئے شعر میں اس بات کی توثیق موجود ہے۔

بحمد اللہ کرسی بہ کرسی مری
چلی آتی ہے بندگی میں تری

ان کے ابائو اجداد فن سپاہ گری سے وابستہ تھے۔ نصرتی اپنے خاندان کا پہلا شخص تھا جو شاعری کی طرف آیا۔ علی عادل شاہ ثانی اپنے زمانہ شہزادگی سے ہی اس کو پسند کرتا تھا۔ لہٰذا جب تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو نصرتی کو طلب کیا۔

میرا رشہ جو بوجک رہے جوہری
وہ شہزادگی میں اتھا مشتری
دھر نہار اکثر اثر میر کی
رکھیا مجھ طرف نت نظر مہر کی(۶۱)

نصرتی اپنے والد کے بارے میں "گلشن عشق" میں کہتا ہے کہ:

جو تھا منج پدر اک شجاعت مآب
قدیم یک سلحدار جمع رکاب
اوشہ کام پر زندگانی منے

کمر بستہ تھا جانفشانی منے (۶۲)

نصرتی کے سن پیدائش کا علم نہ ہو سکا۔ نصرتی کے والد نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا اور بچپن ہی سے قابل اساتذہ سے علوم سیکھنے کا موقع ملا۔

بقول لچھمی نرائن شفیق مولف چمنستان الشعرا:

"نصرتی "حاکم کرناٹک" کے قرابت داروں میں سے تھا۔" (۶۳)

بقول نصری الدین ہاشمی، نصرتی علی عادل شاہ کے عہد حکومت میں بیجاپور آیا اور جلد ہی دربار شاہی میں رسائی حاصل کر لی۔ مگر خود نصرتی کے بیان سے اس بات کی تردید ہوتی ہے۔ وہ شہزادہ علی عادل شاہ کا جلیس تھا جس کا ذکر خود مثنوی میں کیا ہے۔ اس بات سے یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ علی عادل شاہ کے دورِ حکومت میں نصرتی بیجاپور میں مقیم تھا۔ نصرتی نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ وہ ولی عہد سلطنت علی عادل شاہ کا ہم نشین رہا اور شہزادے کے ساتھ بھی اسے تحصیل علم کا موقع ملا۔

مثنوی کی داخلی شہادتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی میں نصرتی نے اپنا آبائی پیشہ سپاہ گری اپنایا مگر بعد ازاں ولی عہد عادل شاہ کے مصاحبت کے عہدے سے سر فراز ہوا۔

جو میں یک اصل میں سپاہی تھا
خدا در گہے بادشاہی اتھا
منجے تربیت کر توں ظاہر کیا
شعور اس ہند کا دے شاعر کیا (۶۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ:

"علی عادل شاہ بچپن ہی سے نصرتی کو پسند کرتا تھا اور جب وہ تخت شاہی پر مسمکن ہوا تو اس نے نصرتی کو بلا بھیجا۔" (۶۵)

سیر اشاہ یو جگ رہے جوہری
وہ شہزادگی میں اتھا مشتری
نوے چاند سا شہر جو بالا اتھا
چونت بدر دن دن اجالا اتھا
میری طبع کی کھن کوں قابل پچھان
نہ کوئی کھن ہے کہ اس مقابل پچھان

دھرن ہار اکثر اثر مہر کی
رکھیا منج طرف نت نظر مہر کی
جو بخشا جج اس مہر تھے آب و تاب
ہر اک فصل رنگیں ہوا آفتاب
رتن پو جو دیپک رتن کے ہوئے
سزاوار شیہ انجمن کے ہوئے(۲۶)

نصرتی کہتا ہے کہ تربیت کے بغیر انسان کا ہنر ظاہر نہیں ہو سکتا۔ تعلیم و تربیت سے ذاتی جوہر بر آمد ہوتا ہے۔ جس طرح "رتن" کی رنگینی سورج کی کرنوں کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ اسی طرح استاد کی تربیت کے بغیر کوئی انسان قابل نہیں بن سکتا۔ نصرتی اس بات کے لیے خدا کا شکر گزار ہے کہ اسے علی عادل شاہ جیسا استاد ملا۔

نصرتی کی اصل صلاحیتیں اور ہنر علی عادل شاہ کے عہد میں کھل کر سامنے آیا۔ اس کی وجہ غالباً علی عادل شاہ کی پذیرائی تھی جس کا برملا اظہار نصرتی یوں کرتا ہے:

بلد بھیج بندے کو اس حال میں
نظر کر مرے بے بہا مال میں
پرکھتا چلیا یوں رتن سر بسر
تھکے دیکھ پارکھ یو اہل نظر
وہیں جگ میں بندہ رہنے بے نیاز
رکھیا اپنی خدمت میں کر سرفراز

علی عادل شاہ ثانی غالباً بچپن ہی سے نصرتی سے قلبی لگاؤ رکھتا تھا لہٰذا جب وہ بادشاہ بنا تو نصرتی اپنا مصاحب بنایا۔ علی عادل شاہ کے عہد حکومت میں نصرتی کی تخلیقی صلاحیتیں اپنے عروج پر تھیں۔ اسی دور میں اس نے غزلوں، رباعیات و قصائد کے علاوہ اپنی شاہکار مثنوی "گلشن عشق" لکھی۔ "علی نامہ" بھی اسی دور کی یادگار ہے۔

جبکہ ۱۰۸۳ء میں "تاریخ اسکندری" لکھی جو سکندر عادل شاہ کا دور حکومت تھا۔ سکندر عادل شاہ بیجاپور کا آخری فرمانروا تھا۔

نصرتی کا سال وفات عبدالجبار ملکاپوری نے ۱۰۹۵ھ لکھا ہے مگر نصیر الدین ہاشمی نے فہرست اردو مخطوطات، کتب خانہ سالار جنگ میں درج ذیل قطعہ تاریخ وفات رقم کیا:

ضرب شمشر سوں بو دنیا چھوڑ
جا کے جنت میں خود ہو رہے؟

سال تاریخ آملا یک نے
یو کسی "نصرتی شہید اا ہے" (۱۰۸۵ھ)

اردو شہر پارے میں محی الدین قادری زور نے ۱۰۸۱ھ سن وفات لکھا ہے۔ مگر "تاریخ اسکندری" کا سال تصنیف ۱۰۸۳ھ ہے جس کا اظہار مثنوی کی داخلی شہادت سے ہوتا ہے کہ:

سہس ہور اسی پر جو تھے تین سال
کرے یک میں بر سب زمانے نے حال (۶۷)

لہٰذا ۱۰۸۱ھ مسترد ہو جاتی ہے اور یوں ۱۰۸۵ھ ہی قرین قیاس ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کے قطعہ تاریخ وفات سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ نصرتی کو قتل کیا گیا تھا۔

اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ نصرتی کی اپنے ہم عصر شعرا سے غالباً معاصرانہ چشمک رہتی تھی۔ نصرتی کی ایک ہجو بھی اس خیال کو تقویت دیتی ہے جو کہ دیوان نصرتی میں شامل ہے۔ مزید ایک غزل میں بھی اس قسم کا کچھ اشارہ ملتا ہے کہ کسی ماہر نجوم نے نصرتی کو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کی پیش گوئی بھی کی تھی۔

کہتے ہیں مجہ منجم اب تجہ خطر ہے جیتو کا
اس راس پر پڑیا ہے یک اخترِ جلالی (۶۸)

نصرتی کے قریبی ساتھیوں میں قاضی سید کریم اللہ، شاہ ابو المعالی اور شاہ نور اللہ جیسے مشاہیر وقت شامل تھے۔ البتہ دکھنی شعرا سے بھی نصرتی خاصا شکوہ کناں نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود کو دکھنی روش سے الگ سمجھتا تھا۔

دکھن کے شاعراں کی میں روش پر شعر بولیا نئیں
ہوا کہا سب گزر گئے یو دیکھیو حاضر وہ دفتر ہے

دراصل چونکہ نصرتی کا خاندان دکن میں آکر آباد ہوا تھا۔ ان کے آبائو اجداد دکن کے رہنے والے نہیں تھے اس لیے جو خاص دکن کے رہنے والے لوگ تھے وہ غالباً نصرتی کو اس بات کا احساس دلاتے رہتے تھے یا پھر معاصرانہ چشمک نے اس قدر بیزار کر دیا کہ نصرتی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:

یارانِ دکھن کس سوں وفاتی نہ کریں
ہوتیں توبلند بخت بھلائی نہ کریں
خوبی سوں تو میں ان کی کیا قطع نظر
اُکار ہے گر پھر کو برائی نہ کریں (۶۹)

مگر یہ صرف اختلاف رائے کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ معاملہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ جو نصرتی کے قتل پر ختم ہوا۔

کتاب کا تعارف:

"دیوان نصرتی" نام کی کتاب جمیل جالبی نے ۱۹۷۲ء میں مدون کر کے قوسین لاہور سے شائع کرائی۔ یہ کتاب ملک الشعرا ملا نصرتی کے نادر ونایاب کلام پر مشتمل کتاب ہے جس کی ابتدا میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک مفید و مبسوط مقدمہ لکھا ہے اور کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ بھی دی ہے جس سے کتاب کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔

اس کتاب میں جن موضوعات کو شامل کیا گیا ہے ان میں ایک مثنوی تاریخ اسکندری، تین قصائد، دو مخمسات، ایک ہجو، چند غزلیں، کچھ رباعیات وقطعات اور آخر میں نصرتی کی ایک فارسی غزل بھی شامل ہے۔

بقول مولوی عبدالحق:

"تاریخ اسکندری" نامی مثنوی کا صرف ایک ہی معلوم نسخہ ہے جو کہ انجمن ترقی اردو پاکستان کا مخزونہ ہے۔ مثنوی کا نام خود نصرتی نے ایک شعر میں بتایا ہے:

کہناریو تاریخ اسکندری
لگے جس کی گفتاریوں سرسری

"تاریخ اسکندری" نامی یہ مثنوی ۱۰۸۳ھ کی تصنیف ہے۔ اس مثنوی میں بہلول خان کی فتح کا حال نظم کیا گیا ہے۔ جبکہ اس کے علاوہ گلشن عشق ۱۰۶۸ھ کی تصنیف ہے اور "علی نامہ "۱۰۷۶ھ میں تصنیف ہوئی۔ اب تک نصرتی کی یہ ہی تین تصانیف سامنے آئی ہیں۔

"تاریخ اسکندری" اس دوروزہ لڑائی کے حال پر مشتمل ہے جس کا پس منظر کچھ یوں ہے۔

جب ۱۰۸۳ھ، ۱۶۷۲ء میں علی عادل شاہ کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا سکندر عادل شاہ محض چار سال کا خورد سال بچہ تھا۔ تخت نشینی کے بعد آس پاس کے وزرا اور امیروں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

جب علی عادل شاہ مرض الموت کا شکار ہوا تو مایوس ہو کر اس نے عبد الحمد کو بلا کر کہا کہ شہزادہ کو تخت پر بٹھا کر سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لو۔ اس طرح کسی کو مخالفت کی جرات نہ ہو گی۔ عبد المحمد بارہ سال سے نظام حکومت نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔ اس کی معاملہ فہمی اور وفاداری مسلم تھی۔ مگر عبد المحمد نے معذرت کر کے امانت کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہیں سے بیجاپور کی سلطنت کا زوال شروع ہوا۔

واضح رہے کہ محمد عادل شاہ نے ۱۶۳۶ھ میں مغلوں سے مصالحت کے بعد اپنی سلطنت کی توسیع و فروغ اور انتظام و انصرام کی طرف توجہ کی۔ اس نے بیس سالہ دور حکومت میں سلطنت کی حدود بحیرہ عرب سے خلیج بنگال تک جا پہنچی۔ یہ بیجاپور کی سلطنت کا سنہری دور تھا۔ محمد عادل شاہ نے جب انتقال کیا اور "حکومت علی عادل شاہ کے ہاتھ آئی اس ملک کا سالانہ محصول چھ کروڑ چھیاسی لاکھ (۶ کروڑ ۸۶ لاکھ) سالانہ تھا۔ اس کے علاوہ باج گزار ریاستوں سے سوا پانچ کروڑ خراج آتا تھا۔ فوج میں اسی ہزار سوار اور اڑھائی لاکھ پیدل شامل تھے۔ فوج میں ۵۳۰ جنگی ہاتھی تھے۔ سلطنت بیجاپور کی سرحدوں کی حدود باج گزار ریاستوں سمیت بمبئی، مدراس، کرنول اور ریاست میسور کے وسیع علاقے تک پھیل گئی تھیں۔

اسی وسیع و عریض سلطنت کی متان حکومت سنبھالتے وقت علی عادل شاہ ثانی کی عمر ۱۸ برس تھی۔ یہ دور بڑا پر آشوب تھا۔ اندرونی خلفشار کے ساتھ ساتھ مغلوں کی بیجاپور پر چڑھائی اور امرا کی غداریوں نے علی عادل شاہ ثانی جو کہ نصرتی کا ہم نشین بھی تھا کو مسلسل دس سال تک مختلف مہمات میں مصروف رکھا۔ نصرتی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "علی نامہ" میں انھی دس سالوں کے درمیان درپیش مہمات کا تاریخی صحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

نصرتی نے تاریخی واقعات کو اس قدر ذمہ دار سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تاریخ اور "علی نامہ" کے مثنوی و قصائد کے واقعات کی ترتیب و صحت میں کوئی فرق نہیں بلکہ کہیں کہیں جو کچھ تاریخ میں بھی درج نہیں کیا جا سکتا وہ نقشہ نصرتی نے اپنے کلام میں کھینچا ہے۔ شاعرانہ لوازم، میدان کارزار کا منظر نامہ، شکوہ الفاظ اور ایسی فصاحت و بلاغت کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔

ان دس سالہ مہمات میں شیواجی کی منافقت پر مبنی سیاست کو بھی بڑا دخل رہا جب بیجاپوری حکومت سے چپقلش ہوتی تو مغلوں سے جا ملتا اور بیجاپور کے خلاف سازشیں شروع کر دیتا اور جب مغل سختی سے پیش آتے تو بیجاپوری سلطنت کی منت سماجت کر کے ان کے ساتھ مل جاتا۔ اس کی اس روش نے مغلوں اور بیجاپوری سلطنت کے درمیان بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیں جو آخر تک فرو نہ ہو سکیں۔

نصرتی نے "علی نامہ" کے ہر باب کے عنوان کے طور پر ایک شعر کہا ہے۔ ان تمام عنوانیاں شعروں کو جمع کر لیا جائے تو ایک مکمل قصیدہ بن جائے اور مثنوی کا تمام خلاصہ اس میں سما جائے۔

نصرتی نے مثنوی میں چاروں صحابہ کی بھی تعریف کی ہے اور مدح سلطان کے بعد قاضی کریم اللہ، شاہ نور اللہ (جنھوں نے اس عہد کی تاریخ فارسی زبان میں لکھی) اور شاہ ابو المعالی کی بہت تعریف لکھی ہے۔ قاضی کریم اللہ کی ترغیب پر ہی دراصل نصرتی نے یہ مثنوی لکھنے کا بیڑہ اٹھایا جو دس سالہ مہمات کی تاریخ پر مبنی ہے۔

نصرتی نے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ اول محمد عادل شاہ، دوم علی عادل شاہ ثانی اور سوم سکندر عادل شاہ۔ سکندر عادل شاہ کی تخت نشینی کے وقت اس کی عمر محض چار برس تھی۔ علی عادل شاہ نے جو حکومت چھوڑی تھی اس میں بے شمار مسائل تھے۔ کم سن شہزادے کے بس کی بات نہ تھی۔ وفاداروں نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے ہر طرف سازشوں کا جال بن دیا۔ خود غرض اور کم حوصلہ لوگوں نے عنان حکومت سنبھال لی تو اطراف وجوانب کے امرا نے بغاوت کر دی جن میں سر فہرست دیرنہ دشمن شیوا جی بھونسلہ تھا۔ شیوا جی نے بیجاپور کے سرحدی قلعہ پنالہ پر قبضہ کر لیا اور پھر سلطنت پر قبضے کے خواب دیکھنے لگا۔ خواص خان (نام نہاد نگرانِ حکومت) نے عبد الکریم بہلول خان کو سر کوبی کے لیے بھیجا۔ غنیم کے لشکر کی کثرت کے باوجود بہلول خان فتح یاب ہوا اور شیوا جی کو شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

اس دو روزہ لڑائی اور بہلول خان کی فتح کو ہی نصرتی نے "تاریخ اسکندری" کا موضوع بنایا ہے۔ یہ نصرتی کا آخری قابل ذکر ادبی کارنامہ ہے۔

"تاریخ اسکندری" کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا سوائے "بساطین السلاطین" کے، مولف بساتین السلاطین میرزا ابراہیم زبیری نے اپنی کتاب میں "تاریخ اسکندری" کا مختصر اًذکر کیا ہے۔ جو کچھ یوں ہے:

"ملک الشعرا میاں نصرتی در تاریخ اسکندری کہ بزبان ھندی منظومہ پر داختہ است کہ بجنگ امران مشہور گشتہ است داد تہور وشجاعت عبد الکریم خان وسخنوری فضاحت ولاغت خویش آنچناں دادہ است کہ سخندانان انصاف کیش وھنر شناسان معانی اندیش گوہرہائے تحسین وآفرین بر آں نثاری می کنند۔"(۷۰)

اس کے بعد مثنوی کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔

سرانا جتا سو خدا کوں سرے
کہ وہ عین حکمت ہے جوں ان کرے (۷۱)

بعد ازاں ایک شعر میں کتاب کا نام اور سن تالیف رقم کرنے کے بعد نئے بادشاہ کی تخت نشینی کا ذکر کیا ہے۔

جو ملک دکن میں ھوا شاہ نو
لباس آپ دنیا کری تازہ نو[۷۲]

ارکان سلطنت کی خود غرضی اور لالچ کا نقشہ کھینچا گیا ہے اس کے بعد غنیم کے لشکر کی دست درازیوں اور بداعمالیوں کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں بہلول خان کی روانگی کا حال، دشمن سے سامنا، میدان کارزار کا حال، جنگ کے واقعات، نواب بہلول کی بہادری، دوسرے دن کی جنگ کا حال، گرمی کی شدت نتیجہ خیز حملہ آور آخری باب میں فتح یافتن نواب بہلول خاں کے عنوان کے تحت مثنوی تمام ہوئی۔

یہی بات کر شکر حق لیا بجا
کھر ارن پہ رہ شادیانے بجا[۷۳]

نصرتی نے ان اشعار پر مثنوی کا اختتام کیا:

منگے جیوں رھنانام ھر کار مگار
زمانے پر ایک نقش ہو یاد گار
وہیں نصرتی دھر کہ سرتے رمس
لکھیا فتح نواب نامے کا جسی[۷۴]

یعنی ہر کام کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کا نام دنیا میں یاد گار رہے اس خیال سے ہی نصرتی نے ہمت کر کے نواب کی فتح کی خوشی منانے کے لیے یہ فتح نامہ لکھا ہے۔

"تاریخ اسکندری" کے تقابل ہم کسی طور بھی "علی نامہ" سے نہیں کر سکتے کیونکہ "علی نامہ" میں مسلسل رزمیہ اور قصائد کا بیان ہے کئی لڑائیوں کا ذکر ہے جہاں نصرتی کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے اظہار کا کھل کر اظہار کرنے موقع ملا ہے۔ یہ یہی وجہ ہے کہ "علی نامہ" میں شامل قصائد و فتح نامے اس کی شاعری کا بہترین حوالہ ہیں۔

مگر "تاریخ اسکندری" محض ایک دو روزہ لڑائی کا منظر نامہ ہے جو آخری فرمانروائے بیجاپور کی اولین برائے نام فتح تھی۔ سکندر عادل شاہ کی کم سنی کے باعث حکومت کے وفادار بہلول خان نے یہ مہم سر کی۔ یہ سکندر عادل شاہ کے دور حکومت کی پہلی فتح تھی اس لیے سارے بیجاپور میں خوشی منائی گئی۔

بہلول خان نے جس بہادری اور استقلال سے شیوا جی کا مقابلہ کیا کہ اس کا لشکر منتشر ہو گیا اور شیوا جی بد ترین شکست سے دوچار ہوا، انھی واقعات کو نصرتی نے اپنی مثنوی "تاریخ اسکندری" کا موضوع بنایا ہے۔ اس مثنوی کو "فتح نامہ بہلول خان" بھی کہا جاتا ہے۔

"تاریخ اسکندری" محض دو روزہ جنگ کا فتح نامہ ہے جبکہ "علی نامہ" تقریباً دس سالہ مہمات کی کہانی ہے۔ "علی نامہ" کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ ان مہمات میں فوجوں کے مقابلے، مقامات، لشکر آرائی، فتح و شکست کے واقعات اور میدان کارزار کا بیانیہ، نصرتی نے تاریخی صحت کے ساتھ حقائق کی بنیاد پر لکھا۔ یہ صرف ایک شاعرانہ شاہکار ہی نہیں بلکہ تاریخی حقائق کا ایسا مجموعہ ہے جو کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں ملتا۔ جنگ کا آنکھوں دیکھا منظر نامہ، اور پھر بیان نصرتی کا دونوں خصائص کی یکجائی نے "تاریخ سکندری" اور "علی نامہ" کی تشکیل کی۔

"دیوان نصرتی" میں تین قصائد بھی شامل ہیں جن میں اول "قصیدہ چرخیہ" ہے۔ قدیم دکنی ادب میں قصدیے کی ایک قسم "چرخیات" کہلاتی ہے۔ ۱۳۴ اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ معراج نبویؐ کے بیان میں ہے۔ "یہ وہ قصائد ہیں جن کی تشبیب فلکیات سے متعلق ہوتی ہے۔"(۷۵)

نصرتی کے "قصدہ چرخیہ" کی ابتدا بھی اسی طرز پر ہوتی ہے کہ سورج کے طلوع و غروب، چاند ستاروں کی پر کیف تشبیہات اور استعاروں سے معراج کے بارے میں قاری کا ذہن تیار کرتا ہے۔ ابتدائی اشعار دیکھیں:

تخت پہ جب ان پتی سیج پہ کیتا گون
نس کا سپہدار تب گرم کری انجمن
صبح کا فراش چک شمع سے روشن کرے
ریگ سے تاریاں کی نت مانج گگن کا لگن

عناصرِ فلکیات کو طرح طرح کی تلمیحات کے بیان کے بعد معراج رسول ﷺ کا بیان ہے اور قصیدے کے اختتام پر بادشاہ وقت محمد عادل شاہ کی مدح میں اشعار ہیں۔ قصدے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نصرتی کی شاعری کے ابتدائی زمانے کی کاوش ہے۔

(نصرتی کے وہ قصائد خاص طور پر رزمیہ بیانیہ کے اختصاص کا حوالہ ہیں جو اس نے "علی نامہ" میں شامل کیے ہیں۔ وہ قصائد خصوصاً شوکت الفاظ اور بلند خیالی کا مرقع ہیں۔ نصرتی کے قصائد میں دوسرے شعرا کی طرح مبالغہ آمیزی بھی ہے۔ لیکن یہ مبالغہ آرائی طبیعت پر بوجھ نہیں ڈالتی۔ تشبیہات واستعارات کا بیان بھی بر محل ہے جو نصرتی کو صنف اول کے شعرا میں شامل کرنے کے لیے کافی ہے۔)

یہ "قصیدہ چرخیہ" محمد عادل شاہ کے دور حکومت (۱۰۳۷ھ۔۱۰۶۷ھ) میں لکھا گیا۔ اگرچہ یہ نصرتی کے شاعرانہ عہد کی ابتدا تھی۔ مگر بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"قصیدہ چرخیہ نہ صرف فنی اعتبار سے بلکہ روانی کلام کی شیرینی اور جذبہ خلوص کی وجہ سے ایک خاصے کی چیز ہے۔"(۷۶)

اسی قصیدے میں اگرچہ شاعر نے باضابطہ محمد عادل شاہ (شاہ وقت) کا نام نہیں لیا مگر استعاراتی طور پر کیا خوب مدح کی ہے۔ حمد و نعت کے بعد اشعار دیکھیں:

حمد ہے منصم کیرا خلق پہ اس دور کے

ہے جو او "رسے رسول" "خسروے ملک دکھن"

لطف سوں دھریا الاء شاہ کی شاہی تلک

جگ میں جگت پر اچھے عیش پرم کے پٹن (۷۷)

محمد عادل شاہ سنی العقیدہ بادشاہ تھا۔ اس لیے قصیدے میں خلفائے راشدین کی ثناء بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

جس کوں اٹل یار میں جئو کے وفادار ہیں

سب میں بڑے چار ہیں دین کو قائم رکھن

صادق ابو بکر، امیر والی عادل عمر

شرف کے عثمان شرف شاہ، علی صنف شکن (۷۸)

چار سو سال سے قبل کی زبان سلاست اور روانی بیان قابل تحسین ہے۔ چند لفظوں میں وسیع مضمون کا بیان نصرتی کا خاصہ ہے۔ تخیل پرواز اور شیری بیانی وہ اوصاف ہیں جنھوں نے نصرتی کے کلام کو آفاقیت سے ہم کنار کر کے اردو ادب کا پہلا قصیدہ نگار بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق نصرتی کے قصائد کی کل تعداد تیرہ ہے اور ہر قصیدہ رفت بیان، شوکت الفاظ اور قوت بیان کا مرقع ہے۔

"قصیدہ چرخیہ" بالخصوص اپنے شعری لحن، تخیل اور معنی آفرینی کے باعث ایک شاہکار قصیدہ ہے۔ اس قصیدہ کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ اس قصیدے میں الفاظ و اصطلاحات بھی فلکیات سے متعلق لائے گئے ہیں اور

نفس مضمون بھی عناصر چرخ کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی قدیم اردو ادب کے حوالے سے قصیدہ گوئی کے ضمن میں نصرتی کا مقام سودااور ذوق سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

"دیوان نصرتی" میں ایک قصیدہ بعنوان "گھوڑا مانگنے کی درخواست بادشاہ سے" بھی شامل ہے جو کہ خالصتاً ڈاکٹر جمیل جالبی کی دریافت ہے اور اس سے قبل اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر شاہِ وقت کی مدح کے بعد اپنی طلب بیان کی گئی ہے۔ وہی شکوہ الفاظ، روانی، سلاست اور زور بیان اس قصیدے میں بھی نظر آتا ہے۔ بادشاہ کی مدح، پچھلے گھوڑے کی شان، پھر اس کی بیماری اور اس کا علاج کے بعد مر جانا، اور اب اپنی ضرورت کے تحت بادشاہ کی توجہ دلا کر خیر خواہی چاہنا جیسے موضوعات پر مشتمل یہ قصیدہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

چاکے سو آب خضر وہی مادوان پیر
جو... ہوئی تھی سکندر کو راہ بر
دادی اتھی وہ اشقر جمشید کی بڑی
رستم کا رخش اس کے پسر کا تھا بڑ پسر
بس تھا ادب کرے لگوں اس پاک ذات کا
رسوا رہو سکیا نہ بزرگی کوں اس کی ڈر (۷۹)

ایک عام سی سات پر سلاست، روانی اور تخیل آفرینی کے دریا بہا دینا نصرتی کا ہی خاصہ ہے۔ آخری شعر دیکھیں:

امید ہے کرم تے جو ایسا ترنگ پانو
دایم اچھے جو طبع تے میرے وہ جلد تر

اس کے بعد ایک قصیدہ بھی ہے۔ جو نصرتی کے مخصوص رنگ میں ہے۔ شوکت الفاظ اور زور بیان ویسا ہی ہے جس طرح عموماً اس کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔

"دیوان نصرتی" میں دو مخمسات بھی شامل ہیں۔ قابل ذکر ایک ہجو ہے جو کہ معاصر شعرا کی منفی خصوصیات وابتذال پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے اصناف سخن میں ہجو ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں مخالف کے عیوب بیان کیے جاتے ہیں۔ عام لفظوں میں جس طرح قصیدہ میں کسی کے محاسن کا ذکر ہوتا ہے اسی طرح ہجو میں عیوب بیان کیے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نصرتی کے ہم عصر شعرا نے اس کو اس قدر عاجز کر رکھا تھا کہ وہ ان کے

لیے ہجو لکھنے پر آمادہ ہو گیا اور اس ہجو میں دل کھول کر مخالفین کو برا بھلا کہا گیا ہے۔ نصرتی کے کلام میں اس ضمن میں کئی جگہ ایک دکن کی بے وفائی اور جفا کا ذکر ملتا ہے۔

یاران دکن کس سوں وفائی نہ کریں
ہوئیں تو بلند بخت بھلائی نہ کریں
خوبی تو میں ان کی کیا قطع نظر
اپکار ہے گر پھر کو برائی نہ کریں (۸۰)

اور ظاہر ہے کہ یہ دو ایک دن کی بات نہیں کافی عرصہ تک یہ صورت حال رہی ہو گی جس کا انجام کارِ نصرتی کے قتل پر منتج ہوا۔ بہر حال نصرتی نے "سخنور" کے عنوان سے ایک ہجو کہی تھی جو "دیوان نصرتی" میں شامل ہے۔

"گلشن عشق" کے آخری باب میں بھی کچھ ایسے اشعار ملتے ہیں۔

کریں بے سمجھ یا جو حاسد اوداس
تو دونوبی معذور ہیں میرے پاس
مسرس شعر ادیکھے کوں کاں خوش لگائے
کرالوان نعمت دو کھی کوں نہ بھالے
ادیکھیا ادک ہو حسد سوں کباب
کہے بول اتنا کہ دکھنی کتاب

سمجدار کوں خوب سودے سے کام
نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام (۸۱)

"ہجو سخنور" کے ابتدائی اشعار دیکھیں:

سخن ور شعر کہتے تے رہنا چپ آج بہتر ہے
جماعت ہرزہ گویاں کی کدھر کو نچ میں گھر گھر ہے
سخن ور کا سخن کچہ ہور بچن کچہ ہرزہ گویاں کے
مقولہ خام طفلاں کا نہ کئیں مرداں برابر ہے (۸۲)

"دیوان نصرتی" میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصرتی کے دو مخمسات بھی شامل کیے ہیں۔ پہلے مخمس میں وہی عام عاشقانہ رنگ ہے جو اکثر غزلوں میں بھی مل جاتا ہے۔ محبوب کے حسن کی تعریف اور اپنی مضمحل طبیعت اور عشق کا بیان ہے جبکہ دوسرا مخمس مراد علی عادل شاہ المتخلص شاہی کی غزل کی تضمین ہے۔ جس کا پہلا بند یہ ہے:

تجہ مکہ پہ جب پنچا عرق موتی سانر مل ذات کا
ساتو گگن پر نہیں رہیا رونق ستارے سات کا
اے مل کمی سوپٹوسوں دھن کچ فن فکر فکرات کا
تجہ گال پر نکہ کا نشاں دستا ہے مجہ اس دھات کا
روش شفق میں جگمگے جوں چاند پہلی رات کا(۸۳)

"دیوان نصرتی" میں ہی تقریباً (۲۲) بائیس غزلیات ہیں اور اٹھائیس (۲۸) رباعیات، تین قطعات اور ایک فارسی غزل بھی شامل ہے۔ جہاں تک فارسی غزل کا تعلق ہے تو روز روشن کے مولف مظفر حسین صبانے یہ غزل عشرت اصفہانی کے حوالے سے درج کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نصرتی کی اس فارسی غزل کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"مظفر حسین صبا مولف "روز روشن" نے یہ غزل عشرت اصفہانی کے نام سے درج کی ہے اور لکھا ہے کہ:

"بعضے ایں غزل دا بنام نصرتی گیلانی نوشتہ وبہ تحقیق اختر (قاضی محمد صادق خان اختر مولف تذکرہ آفتاب عالم تاب) وصاحب نگاستان سخن (نواب نور الحسن خان) کلام عشرتی اصفہانی است۔"(۸۴)

مگر ڈاکٹر جالبی اس حوالے سے جدید تحقیق میں یہ شک یوں رفع کرتے ہیں کہ:

"فرہنگ سخنوراں" میں نصرتی گیلانی کا نام نہیں لکھا۔ صرف "روز روشن" کے حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن "فرہنگ سخنوراں" میں ایک نصرتی ہندوستانی کا نام بھی آیا ہے۔ جس کو مثنوی "مہر وماہ" کا مصنف بتایا گیا ہے۔ جو ۱۰۶۸ھ تک حیات تھا۔ نصرتی گیلانی کے مطبوعہ دیوان میں یہ فارسی غزل نہیں ہے۔ امکان ہے کہ یہ غزل اسی نصرتی دکن کی ہو۔ کیونکہ نصرتی دکنی کا سال وفات ۱۰۸۵ھ ہے۔ دوسرے یہ کہ جس مثنوی کو "مہر وماہ" کہا گیا ہے وہ عاقل خان رازی

عالمگیری کی ہے جس میں اسی قصہ منوہر و مدمالتی کو نظم کیا گیا ہے جیسے نصرتی نے "گلشن عشق" میں موضوع سخن بنایا ہے۔ "مہر وماہ" فارسی زبان میں ہے اور گلشن عشق اردو میں۔"[۸۵]

ہو سکتا ہے کہ نصرتی نے یہ قصہ فارسی ادب سے ہی لیا ہو۔

ایک ہجویہ قصیدہ بھی "دیوان نصرتی" میں شامل ہے۔ اس قصیدے کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں نصرتی نے فخریہ اعلان کیا ہے کہ میں نے یہ اشعار دکھنی شعرا کی روش سے ہٹ کر کہے ہیں۔

دکھن کے شاعراں کی میں روش پہ شعر بولیا نہیں
ہوا کہا سب گذر گئے تو دیکھو حاضر و دفتر ہے[۸۶]

اگرچہ نصرتی نے اس سے قبل بارہا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے دکھنی شاعری کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ حالانکہ اس کی زبان خالص دکنی ہے۔ دراصل نصرتی جس مقام اور درجے کا شاعر تھا اس نے قصیدہ، مرثیہ، فتح نامہ، رزم اور بزم ہر طرح کی صنف میں سخن آزمائی کی ہے اور خصوصاً "تاریخ اسکندری" اور "علی نامہ" میں واقعات کا بیان اور میدان جنگ کی کیفیات کی منظر نگاری میں الفاظ کے وہ دریا بہائے ہیں کہ جس نے اس کی قادر الکلامی کو مسلم کر دیا ہے۔ اس درجے کے بیانیہ کے لیے بعض اوقات غیر مانوس الفاظ وتراکیب اور محاورات کے استعمال پر حاسدین نے تنقید کی جس کا ذکر خود نصرتی کی زبانی سنیں:

حقیقت میں جو ہوئیں کوتہ نظر
زباں پر رکھیں عیب سٹ سب ہنر[۸۷]

نصرتی کے کلام معاصرین کی تنقید بھی تنقید برائے تنقید ہی معلوم ہوتی ہے۔ وگرنہ اس جیسا الفاظ کا انتخاب اور کلام کی روانی اس دور کے دوسرے شعرا کے ہاں بھی مفقود ہے۔ نصرتی خود بھی اپنے کلام پر نازاں تھا اور اس نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے دکنی زبان میں نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے بہت سی نئی راہیں نکالیں اور وہ کچھ لکھا جو اس سے قبل دکنی ادب میں مفقود تھا حتی کہ نصرتی نے بجا طور پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ دکنی ایک کمتر حیثیت کی بے مایہ زبان تھی مگر میں نے اس کو اس قابل بنایا کہ اس پر فخر کیا سکے۔

گھڑیاں ہوں سلامت سوں یک یک بچپن
مضامین یک میں اوٹیا سخن
لگایا ہوں کے نگ طبیعت سوں اوت
دیا خوب سورج کے میرے سوں جوت

اول کے اگر لوگ برنا و پیر
کتے تھے کہ ہے شعر دکھنی حقیر
حقیقت میں ان کی طرف حق اٹھا
کہ تب شعر بے مایہ مطلق اٹھا
سزاوار تحسیں ہے یو شعر آج
نہ کوئی رکھ سکے بات حاسد کے باج(۸۸)

یہاں نصرتی نے تنقید کرنے والوں کو حاسد پن شمار کیا ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس پر جو تنقید کی جاتی ہے اس میں حقیقتاً بہتری کا عنصر ناپید تھا محض تضحیک مقصود تھی اور اس تنقید کی وجہ شاید نصرتی کا ہر دلعزیز ہونا یا پھر شاہی محلات میں رسائی اور منصب تھا۔ کیونکہ جو لوگ اپنے ہنر سے مقام نہیں پاتے وہ اسی طرح دوسروں پر تنقید کرتے ہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو نصرتی کا کلام واقعی اسے صف اول کے شعرا میں شامل کروانے کے لیے کافی تھا۔

ایک جگہ نصرتی کہتا ہے کہ:

"ہندی میں فارسی کی سی فصاحت اور حسن نہ تھا لیکن ہندی میں بھی بعض خوبیاں ایسی ہیں جو فارسی میں نہیں۔ میں نے دونوں کی خوبیوں کو دھیان میں رکھا اور ہندی شعر کو فارسی کا ہم سر بنا دیا۔"(۸۹)

فصاحت میں گر فارسی خوش کلام
دھرے فخر ہندی بچپن پر مدام
اگر شعر ہندی کے بعضے ہنر
نہ سکتے ہیں لیا فارسی میں سنور
میں اس دو ہنر کے خلاصے کو پا
کیا شعر تارہ دونوں فن ملا
ادیکھیا ادک ہو حسد سوں کباب
کہے بول اتنا کہ دکھنی کتاب
سمجھدار کوں خوب سودے سے کام
نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام(۹۰)

نصرتی کی "گلشن عشق" اس کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو علی عادل شاہ کے عہد حکومت میں لکھی گئی۔ مثنوی میں بیان کیا گیا قصہ دکن میں خاصی مقبولیت رکھتا تھا اور تحقیق کے مطابق اس قصے کو ایک غیر معروف شخص شیخ منجھن نے ہندی میں لکھا تھا۔ بعد ازاں ۱۰۲۵ھ میں عاقل خان رازی عالمگیری نے یہ ہی قصہ اپنی مثنوی "مہر وماہ" میں بیان کیا مگر نصرتی نے اسی قصے کو قدرے اضافے کے ساتھ مزید رنگین بنا دیا۔ جس میں مرکزی کرداروں کے ساتھ چند اور کردار اور ان کی کہانیاں بھی لف کر دیں۔

اس مثنوی میں مرکزی رنگ وہی ہے جو از منہ وسطیٰ کی داستانوں کا عام رنگ تھا جس میں شہزادے، پریاں، طلسمات، اتفاقات اور مہمات اور حسن و عشق کی کہانی ہوتی تھی۔ مگر نصرتی کے طرزِ بیان اور اسلوب نے مثنوی کی شہرت دوچند کر دی۔

نصرتی بیجاپوری اسلوب کا سب سے اہم نمائندہ شاعر ہے۔ اس کی شاعری پر انداز بیاں، لہجہ و آہنگ، تشبیہ و استعارات، محاورات، طرز فکر اور ہندو واسطور وروایات کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔

شاعرانہ خصوصیات:

نصرتی کے لیے شاعری خصوصاً عشقیہ شاعری ان معارف تازہ کا اظہار تھی جو شاعر کے قلب پر وارد ہوا کرتے ہیں۔ اس کے نزدیک شاعری کا مقصد واردات قلبیہ، تجربات اور فکری رجحانات کا اظہار ہے اور یہ اظہار اس درجے کا ہونا کہ دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔

ولی شاعری میں جس فکری رجحان اور روایت کے پیش رو سمجھے جاتے ہیں وہ دراصل نصرتی کی ہی مرہون منت تھی۔ ہم قصیدہ گوئی میں جس مقام پر سودا کو رکھتے ہیں قدیم اردو میں نصرتی بلاشبہ اس مقام کا اہل تھا۔ اس نے وہ تمام فنی لوازم اسی اہتمام اور ہنر مندی کے ساتھ برتے جو بعد ازاں ولی اور پھر سودا کے ہاں نظر آتے ہیں۔

جہاں ایک طرف قصیدہ گوئی میں نصرتی نے تخیل کی بلند پروازی اور لطیف شاعرانہ مبالغہ کے امتزاج کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کے حقیقی بیان سے ایک نئی جہت کا آغاز کیا۔

خواہشوں کے زیر دام عمومی سطح کا حامل ہے۔ اس عہد میں ہجر و فراق اور المیہ انجام عشق عام ہے۔ کچھ شعرا نے تو محض تصوراتی محبوب سے ہی کام چلایا۔ جن کو محبوب کا وصل نصیب ہو بھی گیا تب بھی ہجر کی کیفیت وصل کے انبساط پر حاوی نظر آتی ہے۔ غزل کا اندازِ خود کلامی اسی دور کے معاشرتی جبر کا مظہر ہے۔ دکن پر جب رفتہ رفتہ مغلوں کا غلبہ ہونے لگا تو شاعری میں بھی یہ رنگ اترتا چلا گیا اور شاعری فارسی الفاظ روایت میں مدغم ہوتی چلی گئی۔

اردو ادب کے ابتدائی صدیوں میں مختلف اصناف سخن میں اگرچہ باضابطہ اصول مرتب نہیں ہو سکے تھے مگر پھر بھی مروجہ فنی اصولوں کی پابندی کی جاتی تھی۔ اس دور کی شاعرانہ خصوصیات ہی بندشوں اور محاورات کا بر محل استعمال، عام زبان کا ادبی سطح پر استعمال، بحور و قافیہ اور خصوصاً ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی الفاظ کو شاعری میں برتنا عام تھا۔ ندرت بیان اور شعری مضمون کو بھی اہمیت دی گئی۔ مگر بنیادی طور پر ہندی روایت اور الفاظ کو ہی دکنی ادبیات میں اہمیت حاصل رہی۔ اگرچہ بدلتے وقت اور اور گزرتے زمانے اور مغلوں کے تسلط نے فارسی زبان کی آمیزش کے مواقع پیدا کر دیئے تھے مگر شمالی ہند کی طرح دکن اور اس سے متصل علاقوں میں فارسی آمیز شاعری کو شاعرانہ سقم میں گردانا جاتا رہا اور یہ صورتِ حال مغلوں کے تسلط دکن تک جاری رہی۔ بعد ازاں قدیم ادب میں فارسی کی آمیزش کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا بلکہ حسن تحریر تسلیم کیا جانے لگا۔

نصرتی نے دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ نصرتی کی غزل اگرچہ بیجاپور کے علاقے کی مناسبت سے شعری لحن فارسی سے متاثر ہے مگر الفاظ روایت ہندوی کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ نصرتی کی غزل میں معشوق عورت ہے۔ جبکہ فارسیت کے رنگ میں عورت محبوب اور مرد عاشق ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قصیدہ گوئی میں قدیم اردو کا کوئی بھی شاعر نصرتی کی برابری نہیں کر سکا تو بے جا نہ ہوگا۔ قصیدے کی تمام صفات بدرجہ اتم اس کے قصائد میں نظر آتی ہے۔

اگرچہ نصرتی درباری شاعر تھا مگر دیگر شعرا کی طرح اس کی قصیدہ گوئی صرف بادشاہوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس نے دوسرے موضوعات کو بھی اپنے قصائد میں جگہ دی۔ جن میں تقریبات، عناصر قدرت کی دلکشی کا بیان اور فتوحات کے منظر نامے اور مبارکباد کے مواقع کی منظر نگاری قصائد کی شکل میں ایک تاریخ رقم کرتی نظر آتی ہے۔

"علی نامہ" میں نصرتی کے اکثر قصائد شامل ہیں۔ "علی نامہ" میں کل سات قصیدے ہیں۔ اگرچہ "علی نامہ" میں ان مہمات کا ذکر ہے جو علی عادل شاہ کو اپنے دس سالہ دور حکومت میں درپیش رہے۔ "علی نامہ" میں علی عادل شاہ کے مخالف شیواجی کی بڑھتی ہوئی قوت اور مغلوں کی فوجی سیلاب کو سپوتاژ کرنے اور سرحدی صوبوں کی خودسری اور عذاریوں کو کچلنے کے لیے علی عادل شاہ کی فوجی کاروائیوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ ان قصائد میں فتح نامے بھی شامل ہیں اور جنگی مہمات کا احوال بھی۔

رزمیہ بیانیہ میں نصرتی خاص کمال کا حامل ہے۔ وہ الفاظ وبیان کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے کہ تمام منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ معرکہ آرائی اور جنگی واقعات کی منظر کشی کی چند مثالیں دیکھیں:

کھنا کھن تے کھڑکاں کے یوں شور اٹھیا

جوں تن میں پہاڑاں کے لرزا اٹھیا

(تلواروں کی کھنا کھن سے اس قدر شور برپا ہوا کہ پہاڑوں کے جسم میں لرزہ پیدا ہو گیا۔)

سلاحاں میں کھڑکاں جو دھنے گے

اگن ہور رگت مل برسنے لگے [۹۱]

(تلواریں جو ہتھیاروں میں دھسنے لگیں تو آگ اور خون کی ملواں بارش ہونے لگی۔ یعنی تلواروں کی ضرب سے چنگاریاں نکلتی تھیں اور جو آدمیوں پر وار ہوتا تو اس سے خون کی ندی بہنے لگتی تھی اور یہی آگ اور خون کی بارش کی تمثیل تھی۔)

غنیماں کے بھیجاں کوں کھانے شتاب

خوش آنے لگیا موں میں کھڑگاں کے آب

(دشمنوں کے بھیجے کھانے کے لیے تلواروں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔)[۹۲]

نکلتے ہیں جیوں باگ نخچیر کوں

نکل یوں میر اٹے دونو دھیر سوں [۹۳]

(جس طرح شیر شکار پر لپکتا ہے اسی طرح دونوں طرف سے فوجیں لڑنے کے لیے نکلی ہیں۔)

نصرتی ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ واقعے کی منظر نگاری اور نئی نئی تشبیہوں اور ترکیبوں کے پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ بعض محاورات کا بیان نہایت منفرد اور سادہ سا ہے۔

کچا توڑنا خار بہتر دسے

کہ چھوڑے تو ہو پختہ خنجر دسے [۹۴]

(کانٹے کا کچا ہی توڑ ڈالنا بہتر ہے، چھوڑ دیا تو پختہ ہو کر خنجر ہی بن جائے گا۔)

"علی نامہ" شاید نصرتی کی سب سے اعلیٰ تصنیف ہے۔ خود "علی نامہ" کے بارے میں نصرتی کہتا ہے کہ:

عجب فن کی بولیاں ہوں یہ مثنوی

کہ کئی بھانت ہے اس ہنر میں نوی

اور یہ کہ:

بھریاہوں تہر سوں سراسر کتاب
رکھیاہوں نزاکت سوں سب بھر کتاب

"علی نامہ" میں جو قصائد شامل ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ایک قصیدہ ۲۲ اشعار کا، دوسرا ۱۵۸۱ اشعار پر مشتمل، ۱۵۰ اشعار اور ایک ۲۱۸ اشعار کا مجموعہ، گویا کافی طویل قصائد "علی نامہ" میں شامل ہیں۔

پہلا قصیدہ قلعہ پنالہ کی فتح کے واقعات پر مبنی ہے۔ دوسرا بادشاہ کی فتح اور صلابت خان کی شکست کے بارے میں ہے۔ اس فتح کے بعد بادشاہ جب اپنے دارالحکومت بیجاپور کی طرف گامزن ہوا اور بیجاپور میں فتح کی خوشی میں جس جشن کا اہتمام کیا گیا اس موقع پر ایک قصیدہ لکھا۔ مزید اسی قصیدے کے ضمن میں ایک دوسرا قصیدہ لکھا جو باقی قصائد سے مختلف تھا۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی مختلف اور قافیہ، ردیف اور بحور کے اعتبار سے بھی دوسرے قصائد سے مختلف تھا۔ چھٹا قصیدہ مجلس عاشورہ کے حوالے سے ہے۔ ساتواں قصیدہ بڑا شاندار ہے جو فتح ملتار کے بارے میں ہے۔ یہ نہایت پر شکوہ اور طولانی ہے۔ یہ وہ قصیدہ ہے جس پر خود نصرتی بھی نازاں ہے:

سنو یک فتح کاشہ کے قصدہ بے بدل یاراں
کہ ہر یک مختصر مضمون دھرے معنی مطول کا

اس طرح نصرتی کے کل دستیاب قصائد کی تعداد تقریباً بارہ ہو جاتی ہے۔

بیجاپوری اسلوب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ سارازور قصے کی زود بیانی پر ہوتا ہے۔(یعنی جزئیات نگاری سے کس قدر اجتناب کرتے ہوئے قصے کو جلدی جلدی بیان کرنے کی کوشش) مگر نصرتی نے اس روش کو چھوڑ کر فارسی روایت کی تقلید کی جس سے ایک تو اس کے علمی شجر کا اندازہ ہوتا ہے دوسرا اس نے فارسی روایت کو ہندوی رنگ میں ڈھال کر ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی۔

دگر شعری ہندی کے بعضے ہنر
نہ سکتے ہیں لیا فارسی میں سنور
میں اس دو ہنر کے خلاصے کو پا
کیا شعر تازہ دونوں فن ملا(۹۵)

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو زبان وادب نے اپنے قدیم دور کے تقریباً پانچ سو سال سنسکرت سے فائدہ اٹھایا مگر جب تخلیق کاروں نے دیکھا کہ بدلتے حالات میں اب تبدیلی ناگزیر ہے وہ رفتہ رفتہ فارسی کو اپنانے لگے اور فارسی اس دور میں چوں کہ حکمرانوں کی زبان تھی۔ لہٰذا سرکاری سطح پر قبولیت عامہ کے حصول کے لیے بھی ناگزیر ہوتی جارہی تھی۔ مختصر یہ کہ وقت کی ضرورت کے پیش نظر نصرتی نے بھی فارسی روایت اور ہندوی ریختہ سے ایک نئی روش کا آغاز کیا۔ جس نے نصرتی کو صنف اول کے شعرا میں لا کھڑا کیا اور اس کے کلام کو آفاقی رنگ دیا۔

مگر ڈاکٹر جالبی نے ایک نہایت اہم نکتہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ نصرتی کو ایک باکمال اور ہمہ صف شاعر ہونے کے باوجود وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو اس کے بعد ولی دکنی کو تاریخ اردو ادب میں حاصل ہوا؟

اس کی وجہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق یہ رہی ہو گی کہ اظہار و بیان کی جس روایت کا نصرتی علم بردار تھا وہ تھی جس کی بنا ہندوی اسلوب تھا اور یہ اسلوب مغلوں کے دکن پر فتح کے بعد قطعی طور پر متروک ہو گیا اور فارسی روایت کی اجارہ داری قائم ہوئی۔ اگر ہم صرف دکن کی سلطنتوں تک کے قدیم اردو ادب کا تقابل کریں تو بلاشبہ نصرتی کو اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

د۔ قدیم اردو کی لغت :

دسویں صدی ہجری جاری رہنے والے ہندوی اثرات کے حامل ادب کی ابتدا مسعود سعد سلمان سے ہو کر امیر خسرو (۱۱۲۱ء۔ ۱۳۳۵ء) تک آتے آتے تلمیحات اساطیر اور تشبیہات سے لبریز ہو چکی تھی۔ گویا زبان اردو کا ایک خاص رنگ متعین ہو چکا تھا۔ زندہ زبانیں اپنی بقا کے مختلف ادوار میں مختلف رنگوں میں ڈھلتی، بنتی اور سنورتی رہتی ہیں۔ اس لحاظ سے اردو زبان بھی امیر خسرو کے بعد فارسی ادب و روایت کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ جو فارسی اثرات کو اپنے اندر سمو کر جدید زبان کا چولا بدل لیتی ہے۔ بالحاظ مجموعی یہ دور گیارہویں صدی ہجری کو محیط ہے۔ گیارہویں صدی ہجری میں خصوصاً قدیم ہندوی اور فارسی روایت بقا اور ارتقا کی جنگ میں ایک دوسرے سے متصادم نظر آتی ہیں اور بالآخر فارسی روایت ہندوی روایت پر غالب آ کر ریختہ کی شکل میں ولی دکنی تک پہنچ کر ایک نئی صورت اختیار کرتی ہے اور یہ صورت گیارہویں صدی ہجری کے آخر سے غالب تک برابر ارتقائی مراحل طے کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ حکمران بھی تھے۔ مغلوں کی حکومت میں فارسی کو سرکاری سرپرستی حامل ہونے کے سبب فارسی کی اہمیت مسلم رہی۔ مگر جب انگریزوں نے مغلوں کو شکست دے کر ہندوستان پر قبضہ کیا تو

فارسی اور فارسی روایت کے حامل ادب نے پھر سے چولا بدلا اور انگریزی آمیز مغربی روایت کے حامل زبان وادب پر گہرے اثرات مرتب کیے بالکل اسی طرح جس طرح بہمنی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی ہندوی روایت نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا تو دکن کے علاقوں میں ہندوی اثرات کی حامل اردو زبان وادب نے ترویج وترقی پائی جو آج بھی قدیم ادب کے طور پر اپنی پہچان باقی رکھے ہوئے ہے۔ اس قدیم ادب کے مطالعے کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل سمجھی جاتی ہے۔

نویں صدی ہجری کا وہ ابتدائی ادب اردو جو صوفیا اور مشائخ اسلام وعقائد کی ترویج کی خاطر ضابطہ تحریر میں لائے نظم ونثر دونوں صورتوں میں دستیاب وہ ادب ہے جو قدیم اردو کی ابتدائی شکل ہے۔ اس ادب کے گیارہویں اور بارہویں صدی کے دستیاب مذہبی رسائل خصوصی اہمیت کے حامل ہیں جو زبان اردو کے ابتدائی عہد کے عکاس بھی ہیں۔ اُردو زبان کی ابتدائی دور کے ایسے الفاظ سے لبریز ہیں جو بعد ازاں ارتقائی مراحل طے کر کے اعلیٰ درجے کی زبان کا حصہ بنے۔

بہمنی دور کی اولین ادبی تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" مانی جاتی ہے۔ اس میں شامل افلاظ آج سے تقریباً چھ ساڑے چھ سو سال قبل کی زبان کا نمونہ ہیں۔ ان الفاظ وادبیات کو سمجھنا کار دشوار ہوتا مگر ڈاکٹر جمیل جالبی کی "اردو کی قدم لغت" نے قدیم ادبیات کی تفہیم میں کچھ نہ کچھ آسانی کر دی۔ کسی بھی زبان کی لغات اس زبان کے ارتقا کی مستند دلیل ہوتی ہیں۔

قدیم اردو کی پہلی لغت سید شاہ اشرف بیابانی (۱۴۵۸ء۔۱۵۲۸ء) کی "واحد باری" ہے۔ اس منظوم لغت کا اولین ہونے کے علاوہ یہ بھی اختصاص ہے کہ اس میں عربی اور فارسی الفاظ کے مترادفات دکنی اردو میں درج کیے گئے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں شاہ محی الدین کی مرتب کردہ لغت کثیر الفوائد سامنے آئی جس میں فارسی کے مروجہ الفاظ کے معنی قدیم اردو میں درج کیے گئے تھے۔

انیسویں صدی کے ربع دوم میں نیاز علی بیگ نے "مخزن الفوائد" کے نام لغت مرتب کی جس میں فارسی الفاظ کے معنی قدیم اردو میں درج تھے۔

یہ وہ لغات تھیں جو اردو کے ابتدائی دور کی غماز تھیں پر ان کو باقاعدہ لغت نہیں کہہ سکتے۔ باقاعدہ دکنی زبان کی لغت نگاری کا سہرا عارف ابوالعلائی کی لغت "دکن کی زبان" کے سر ہے۔ یہ لغت ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں طبع ہوئی۔

۱۹۶۹ء میں مسعود حسین خان اور غلام عمر خان نے "دکنی اردو کی لغت" مرتب کی۔ اس کے علاوہ سید شعار احمد کی "دکنی لغت" (س ن)، امیر عارفی کی "دکنی فرہنگ" ۱۹۷۲ئ، اور سید ابو تراب خطائی ضامن کی "دکنی لغات" کے نام سے دکنی زبان کی لغات شائع ہوئیں۔ بعد ازاں ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی "قدیم اردو کی لغت" شائع ہوئی۔ اس ضمن میں جاوید وششٹ کی "دریائے معانی" بھی قابل ذکر ہے۔ ذخیرہ الفاظ کی وسعت کے لحاظ سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی "قدیم اردو کی لغت" سب سے وقیع لغت ہے۔

یہ لغت اپنی نوعیت کی منفرد لغت ہے۔ اس لغت میں تقریباً اٹھارہ ہزار ایسے الفاظ درج ہیں جو قدیم ادبیات میں استعمال ہوئے۔ اس لغت کا اختصاص یہ بھی ہے کہ لغت میں شامل الفاظ کے نہ صرف معنی بلکہ کو حسب ضرورت مصدر، حاصل مصدر، امر، ماضی وغیرہ کی ممکنہ اشکال بھی شامل کی گئیں ہیں جن سے مصدر اور اس کی بتدریج بدلتی ہوئی حالتوں کے بارے میں علم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اس لغت کی داستان خود یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "اس لغت کی داستان یہ ہے کہ "تاریخ ادب اردو" پر کام کرتے ہوئے مجھے سینکڑوں مخطوطات اور بیاضوں کے صحرائوں سے گزرنا پڑا۔ دوران مطالعہ اکثر ایسے لفظوں سے واسطہ پڑا جو میرے لیے اجنبی تھے۔ میں ان لفظوں کو ایک کاپی میں لکھ لیتا اور پھر سیاق وسباق کے حوالے، مختلف لغات کی مدد اور اہل علم سے گفتگو کرنے کے بعد جب ان لفظوں کے معنی متعین ہو جاتے تو ان کے سامنے لکھ دیتا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے یہ کیا کہ ہر وہ لفظ جو قدیم ادب میں استعمال ہوا اسے معنی اور حوالے کے ساتھ ایک کارڈ پر لکھ کر رکھ لیتا۔ یہ کام ۱۹۶۱ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۷۱ء میں ختم ہوا۔ جب کام ختم ہوا تو تقریباً اٹھارہ ہزار الفاظ کا ذخیرہ میرے پاس تھا۔ اس ذخیرے کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان الفاظ کو مرتب کر دیا جائے تو یہ لغت ان لوگوں کے لیے یقینا مفید ہو گی جو قدیم اردو کی مطبوعہ کتب، مخطوطات یا قلمی بیاضوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔"(۹۶)

اس لغت کی ترتیب میں اٹھارہ ہزار الفاظ میں سے قدیم ادب میں استعمال ہونے والے گیارہ ہزار الفاظ کو منتخب کر کے ان کے معنی و مصدر اور لفظ کی تغیر شدہ شکل بھی شامل کر دی گئی تاکہ طالب علم اور ماہر لسانیات الفاظ کے منبع سے بھی واقف ہو سکیں نیز یہ الفاظ برصغیر میں بولی جانے والی کن کن زبانوں اور بولیوں سے اردو میں شامل ہوئے اور کس لہجے اور تلفظ کے ساتھ ادا کیے جاتے تھے۔

تعجب کی بات ہے کہ اس لغت میں شامل سینکڑوں الفاظ آج بھی مختلف ایشیائی زبانوں میں مستعمل ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ اردو زبان نے برصغیر میں مروج تقریباً تمام زبانوں سے فیض حاصل کیا ہے اور شاید اسی خصوصیت نے اردو کو قبولیت عامہ بخشی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی "قدیم اردو لغت" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس لغت میں الفاظ کے وہی معنی دیئے گئے ہیں جو قدیم دور میں رائج تھے۔ بہت سے الفاظ کے معنی ایسے ہوں گے جو آج کے معنی سے مختلف ہیں مثلاً بانگ کے معنی اذان، جنگی کے معنی سپاہی وغیرہ۔"(۹۷)

جمیل جالبی کا یہ استدلال بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ چیزوں کی اہمیت اور اس کے بیان کرنے کے الفاظ و مفاہیم بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پھر آج کی زبان اردو اس وقت کی محدود زبان سے زیادہ وسعت اور اثر پذیری رکھتی ہے۔ اس وسعت پذیری نے جہاں نئے نئے الفاظ کو اپنے اندر سمویا ہے وہاں انہی بنیادی مصدوروں سے کئی نئے الفاظ نے بھی جنم لیا اور لفظوں کی نئی نئی شکلیں سامنے آئیں۔

"قدیم اردو کی لغت" اپنی نوعیت کی منفرد لغت ہے جس نے بہر حال قدیم ادب کی تفہیم کو سہل بنایا ہے۔ اس لغت کی اشاعت نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا ایک اور پہلو متعارف کرایا ہے جو ایک لغت نگار ہے۔ ذیل میں ہم اس لغت میں شامل کچھ الفاظ کی نشاندہی کریں گے جو آج بھی کم بیش ہماری علاقائی زبانوں یا مروجہ اردو میں مستعمل ہیں:

۔ آپ۔ آپ

۔ آبھار۔ احسان مندی

۔ آپسیں۔ باہم

۔ آپی۔ خود سے

۔ آدرش۔ مثال / نمونہ

۔ آرتی۔ مورتی کے چاروں اطراف چراغ پھرانے کی رسم

۔ آلسی / آلس۔ سستی، کاہلی

۔ آس۔ امید

۔ آڑی۔ ساتھی

۔ آسمانی۔ بلند (جیسے آسمانی جھولا)

۔ آسرواد۔ آشیرباد / دعا

۔ آکاس۔ آکاش

۔ آلکس۔ سستی، کاہلی

۔ آنٹی۔ گرہ، پھندہ

۔ آنجو، انجھو۔ آنسو

۔ آنچ۔ آگ کی آنچ

۔ آنک۔ آنکھ

۔ آنگن۔ صحن

۔ آوارہ۔ سرگرداں پھرنا

۔ اُبالاں۔ جوش دینا

۔ ابرش۔ سرخ وسفید

۔ ابرا۔ طاف کے اوپر کا کپڑا

۔ ابلق۔ چتکبرا گھوڑا

۔ ابھیمان۔ غرور، گھمنڈ

۔ آپ کاج مہاکاج۔ اپنا کام، بڑا کام

۔ اُتر۔ شمال / جنوب

۔ اتم۔ بے نظیر، بے مثال

۔ اتہاس۔ کہانی یا تاریخ

۔ اتھا۔ گہرا

۔ اِتی۔ اتنی

اور ان جیسے سینکڑوں الفاظ معمولی ردوبدل کے بعد آج کی زبان میں مروج ہیں۔

"اُردو کی قدیم لغت" میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک قابل قدر کام یہ کیا ہے کہ ایک ہی لفظ کی مختلف املائی شکلیں، مصدر، حاصل مصدر، ماضی مطلق، امر اور مرکبات اور مشتقات کی مختلف شکلیں بھی پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر:

بھاگنا یا فرار ہونا:

- نٹھا (بھاگنا)، نہاٹنا، نھاٹنا (بھاگنا، دغا دینا)
- نھاٹیا (بھاگا، دوڑا)
- نماس (بھاگ)
- نہاسنا، نھاسنا (بھاگنا، فرار ہونا، غائب ہونا، روپوش ہونا)
- نھانٹ (بھاگ)
- نھانٹنا (بھاگنا، فرار ہونا)

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ فاضل مصنف نے تمام ممکنہ املائی صورتوں کے ممکنہ معنی بیان کر دیئے ہیں۔ اسی طرح:

کد (کبھی، کب، کس وقت)

- کداں (کب)
- کدبھی (کبھی)
- کدن (طرف)
- کدھاں (کب)
- کدھاں لگ (کب تک)
- کدھن، کدہن (سمت، طرف، کس طرف)
- کدھی (کبھی)
- کدی (کبھی)

اسی طرح املا کی تمام ممکنہ اشکال کے معنی دیئے گئے ہیں جیسے:

- سبا، صبا، صباح
- وزا، وضا، وضع

۔ سور، سورتج، سرج

اگرچہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ کاوش قابل تحسین ہے کہ مگر اس نوعیت کے کاموں میں ہمیشہ بہتری کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ ہم اس طور کی کسی مساعی کو حرف آخر نہیں گردان سکتے۔

محمد علی اثر ماہر دکنیات کے مطابق کچھ اہم دکنی الفاظ ہیں جو اس لغت میں جگہ نہیں پا سکے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ بنگا (ٹیڑھا، ترچھا)

بینگی (ٹیڑھی)۔ مثال:

"نوا چاند بنگی کھرک ہے کہ جان"(۹۸)

۲۔ پہنچ (پیدائش)

پہنچنا (پیدا ہونا)۔ پہنچیا (پیدا ہوا)۔ مثال:

"پہنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں" (قطب مشتری)

نہ پہنچے نہ پہنچیا ہے اس ٹھان میں (سیف الملوک و بدیع الجمال)(۹۹)

۳۔ پھاڑ (پہاڑ)

پھاڑاں (پہاڑ کی جمع)۔ پھاڑے پھاڑ (پہاڑ ہی پہاڑ)۔ مثال:

"کنکر میں گھوس کر پھاڑ کوں کون دیکھیا ہے" (سب رس)

"دانش کے تیشے سوں پھاڑاں الٹایا تو یوں شیریں پایا (سب رس)

۴۔ درا:

درا (صاحب، مالک، آقا، کلمہ تخاطب)۔ مثال:

کیتا کہنا ڈرا ڈرا

خوب سوں خوب برے سوں برا (سب رس)

۵۔ ستی:

ستی (سے)۔ سیتی (سے)۔ مثال:

طلب کرنا اللہ کا فرض ہے

سب فرمناں ستی اول ہے (معراج العاشقین)

ہوا پرگٹ جدھاں سیتی دنیا

ہو ادین قدرت سوں (کلیات محمد قلی)[۱۰۰]

ان جیسے الفاظ کی کمی ضرور رہی مگر تحقیق میں کوئی بھی چیز حرف آخر نہیں ہوتی، دکنی ادب کے طالب علموں کے لیے یہ لغت ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر جالبی نے ہر ہر لفظ کے جتنے بھی معنی سامنے آتے گئے وہ تمام تحریر کیے ہیں۔ مثلاً:

بھان:

محسوس کرنا، معلوم کرنا، سورج، صبح، روشن، بہن، خواہر، بھانا، ڈالنا، پھینکنا، ہونا، گرانا، اچھا لگنا، پسند آنا، بہانا، دریابرد کرنا۔[۱۰۱]

ست:

عصمت، طاقت، زور، سچائی، عرق، رس، خوبی، فضیلت، نیکی، سادھو، مرد نیک، پاک، اعلیٰ۔[۱۰۲]

ست:

خلاصہ، فرزند، گنا، بدی۔[۱۰۳]

گویا ایک ہی تلفظ کی تمام ممکنہ اشکال و معنی اس لغت میں درج ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کتاب کے پیش لفظ میں اپنے ہنر کی صراحت کے ذیل میں کہتے ہیں کہ:

"اس لغت کو مرتب کرتے ہوئے میں نے حسب ضرورت مصدر، حامل مصدر، امر، ماضی مطلق، مرکبات و مشتقات کی بیشتر شکلیں شامل کر دی ہیں تاکہ قدیم ادب کا مطالعہ کرنے والے کو مصدر کی بدلی ہوئی شکلیں پہچاننے میں وقت نہ ہو... اس کے علاوہ اگر مختلف ماخذ سے ایک ہی لفظ کے مختلف معانی سامنے آئے تو ان سب معنی کو اسی لفظ کے تحت یک جا کر دیا ہے۔"[۱۰۴]

"قدیم اردو کی لغت" کی اہمیت اپنی جگہ، مگر آخر میں دی گئی "مخطوطات و مطبوعات" کی فہرست نے اس کتاب کے استناد کو مسلم کر دیا ہے یہ فہرست ان کتابوں اور مخطوطات کے مکمل حوالوں سے مزین ہے جن میں یہ الفاظ پائے گئے اور جن جن معانی میں استعمال ہوئے ان تمام کا حوالہ بھی موجود ہے۔

ان تمام خوبیوں نے "قدیم اردو کی لغت" کو قدیم ادب کے محققین کے لیے مستند ماخذ بنا دیا ہے اور کتاب کی افادیت دوچند ہو گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اُردو، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۰ء، ص ۳۴

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۱۰۳

۲۔ ایضاً

۴۔ وہاب اشرفی، تاریخ ادب اردو (ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک)، جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۷۵

۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، ص ۹۴

۶۔ ایضاً، ص ۹۴

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً، ص ۹۹

۹۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اُردو، ص ۳۵

۱۰۔ مولوی عبد الحق، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد دوم، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۳۳۸

۱۱۔ سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، ج دوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۸۴

۱۲۔ افسر صدیقی امروہوی، مخطوطات انجمن ترقی اردو، جلد اول، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ص ۳۷۰

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۹ء، (مقدمہ)، ص ۱۶

۱۴۔ سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ص ۸۵

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، (مقدمہ)، ص ۱۶

۱۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، ص ۱۱۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۱۹۔ شمس الرحمن فاروقی، اردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو)، آج پبلشرز، کراچی ۱۹۹۹ء، ص ۷۷

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۷

۲۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، پنجاب یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء، جلد اول، ص ۱۷۱

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً
۲۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، ص ۱۳۰
۲۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص ۸۵
۲۸۔ ایضاً، ص ۷۶
۲۹۔ ایضاً، ص ۷۶
۳۰۔ ایضاً
۳۱۔ ایضاً
۳۲۔ وہاب اشرفی، تاریخ ادب اردو، ص ۷۵
۳۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، ص ۱۲۷
۳۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، ص ۱۲۸
۳۵۔ محمد علی اثر، ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق (مضمون)، مشمولہ قومی زبان، کراچی، اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۶۸
۳۶۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، تحقیقی مقالات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۵
۳۷۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، مثنوی کدم رائو پدم رائو، مضمون، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ۲۰۱۶ء، الیٹ پبلشرز، کراچی، ص ۵۲۱
۳۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۳۵
۳۹۔ ایضاً
۴۰۔ ایضاً، ص ۲۳۶
۴۱۔ سخاوت مرزا، قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض (مضمون)، مشمولہ اُردو، ۱۹۵۰ء
۴۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند (جلد اول)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۷
۴۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲۲
۴۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، مرتب، دیوان حسن شوقی، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۲
۴۵۔ ایضاً
۴۶۔ ایضاً، ص ۷
۴۷۔ ایضاً، ص ۷
۴۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۹۳

۴۹۔ محمد خاور جمیل،ڈاکٹر،ڈاکٹر جمیل جالبی، بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، الیٹ پبلشرز، کراچی،۲۰۱۶ء
،
ص۴۱۵

۵۰۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ادبی تحقیق، ص۱۹۶

۵۱۔ ایضاً، ص۱۹۷

۵۲۔ ایضاً

۵۳۔ ایضاً، ص۲۰۰

۵۴۔ گوہر نوشاہی،ڈاکٹر،ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۲۶۳

۵۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ادبی تحقیق، ص

۵۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، دیوان حسن شوقی، مقدمہ، ص۶

۵۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ادبی تحقیق، ص۲۱۷

۵۸۔ ایضاً، ص۲۱۸

۵۹۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، دیوان نصرتی، قوسین، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص۴

۶۰۔ مولوی عبدالحق، (مرتب)، گلشن عشق، انجمن ترقی اردو، ص۲

۶۱۔ مولوی عبدالحق، نصرتی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص۱۲

۶۲۔ سیدہ جعفر گیان چند، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو ہند، ص۶۸

۶۳۔ ایضاً، ص۶۹

۶۴۔ ایضاً، ص۷۱

۶۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، دیوان نصرتی، قوسین، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص۵

۶۶۔ سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص۷۱

۶۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، دیوان نصرتی، ص۵

۶۸۔ ایضاً، ص۶

۶۹۔ ایضاً

۷۰۔ مولوی عبدالحق،ڈاکٹر، نصرتی، ص۲۲۴

۷۱۔ ایضاً

۷۲۔ ایضاً، ص۲۲۵

۷۳۔ ایضاً، ص۲۷۰

۷۴۔ ایضاً، ص۲۷۱

۷۵۔ مولوی عبدالحق، نصرتی، ص۲۷۲

۷۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، دیوان نصرتی، ص۱

۷۷۔ ایضاً

۷۸۔ ایضاً

۷۹۔ مولوی عبدالحق، نصرتی، ص۳۲۰

۸۰۔ ایضاً

۸۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، دیوان نصرتی، ص۵۲

۸۲۔ ایضاً، ص۵۰

۸۳۔ ایضاً، ص۷۹

۸۴۔ ایضاً، ص۷۹

۸۵۔ مولوی عبدالحق، نصرتی، ص۳۲۵

۸۶۔ ایضاً، ص۳۲۶

۸۷۔ ایضاً، ص۳۲۸

۸۸۔ ایضاً

۸۹۔ ایضاً، ص۳۲۹

۹۰۔ ایضاً، ص۲۶۹

۹۱۔ ایضاً، ص۲۹۸

۹۲۔ ایضاً، ص۲۹۹

۹۳۔ ایضاً

۹۴۔ ایضاً، ص۲۲۹

۹۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، دیوان نصرتی، ص۸

۹۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قدیم اردو کی لغت (پیش لفظ)، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص۷

۹۷۔ ایضاً

۹۸۔ حمد علی اثر، (مضمون)، ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق، مشمولہ رسالہ ارمغان، کراچی، اپریل ۱۹۹۶ء ، ص ۱۱۴

۹۹۔ ایضاً

۱۰۰۔ ایضاً

۱۰۱۔ ایضاً

۱۰۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قدیم اردو کی لغت، ص ۵۲

۱۰۳۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۸

باب پنجم

مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ:

جب غلام الدین بہمن شاہ نے ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ سلطنت چوں کہ مرکزی حکومت سے بغاوت کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی لہٰذا یہاں پر اس فکر و عمل کو فروغ دیا گیا جو اس سلطنت کی شناخت اور انفرادیت قائم کرنے میں معاون سمجھی گئی۔ اس سوچ نے مقامی زبان اور دیسی تہذیب کو پذیرائی دی۔ لہٰذا مقامی رسم و رواج اور طور طریقوں کو فروغ حاصل ہوا۔ بہمنی سلاطین نے نہ صرف مقامی تہذیب کو رواج دیا بلکہ شمالی ہند سے اختلاف کرتے ہوئے اردو زبان کو ترویج دے کر سرکاری زبان کا درجہ دیا اور اسی زبان کو ادبی سطح تک پہنچا دیا۔ علاقائیت کے فروغ نے دکنیت کو رواج دیا اور اسی زبان میں ادب تخلیق ہونے لگا۔

بہمنی سلطنت میں مختلف علاقائی زبانیں رائج تھیں ان تمام زبانوں میں اردو کی حیثیت لنگوفرینکا کی تھی جو عام زبانوں کے درمیان رابطہ کی زبان تھی۔ بہمنیوں نے اس زبان کی سرپرستی کی۔ یہ ہی وہ زبان تھی جسے معاشرتی ضرورت نے سماج کے ہر طبقے تک رسائی عطا کر دی تھی لہٰذا سرکاری سرپرستی نے اردو زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے اردو کی پہلے درباری اور بعد ازاں ادبی سطح تک پہنچا دیا۔ اس عمل سے شمال اور جنوب میں ایک حد فاصل قائم ہو گئی جو تقریباً تین سو سال کو محیط رہی اور وہ زبان جو شمال سے آئی تھی جنوبی ہند میں پروان چڑھنے لگی اور سرزمین دکن کے تہذیبی لسانی اثرات کو قبول کرتے ہوئے اس شکل میں ابھری جسے ہم "دکنی اردو" یا "قدیم اردو" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان عوامل کے تحت تخلیق ہونے والا ادب "دکنیات" کہلایا۔

اس حوالے سے صوفیائے کرام جو دکن میں رشد و ہدایت میں خاموشی سے مصروف تھے۔ اپنے مریدین کی اصلاح کے لیے کچھ رسائل عوامی زبان (اردو) میں تشکیل دیتے رہے۔ ان میں سے چند جو آٹھویں صدی ہجری یا اس سے قبل کے عہد سے تعلق رکھتے تھے، کی بازیافت سے اس دور کے لسانی ارتقا کی کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ان

بزرگان دین اور صوفیائے کرام نے مقامی زبانوں کے الفاظ کو باہم ملا کر ایک ایسی زبان کی تشکیل کی جو ابلاغ کی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ یہ ہی زبان اردو زبان کی ابتدا تھی۔

قدیم دور کا ادب کی زبان آج کی ادبی زبان سے اسی لیے مختلف ہے کہ یہ عبوری دور کا ادب ہے جس میں مختلف سیاسی، تہذیبی اور لسانی اثرات وقت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے چلے گئے اور زبان کی ایک خاص شکل بنتی گئی یہ ہی وجہ ہے کہ ہم قدیم ادب سے اگرچہ اس طور لطف اندوز نہیں ہو سکتے جس طرح جدید ادب سے، مگر قدیم اور جدید ادب میں ایک نامعلوم اور غیر محسوس ربط کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

قدیم ادب میں جن موضوعات کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان میں تصوف، کسی مذہبی قصے یا نیم تاریخی واقعے کو مروجہ لوازمات کے ساتھ رقم کیا جانا، یا پھر کسی محیر العقول کہانی کو طلسمات و مہمات کے لوازم کے ساتھ بیان کیا جاتا رہا۔ اس مقالے میں ان تینوں اقسام کی ادبیات کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف کے ذیل میں ہی بعض شخصیات کی سوانح حیات جہاں صوفیائے کرام نے اپنے مریدین کی اصلاح ور ہنمائی کی خاطر بعض رسائل لکھے ہیں۔ مریدین میں سے بعض نے اپنے مرشد یا روحانی پیشوا کے حالات درج کیے مگر اس میں حقیقت سے زیادہ احترام کا رنگ ہے۔

اس عہد کی مجموعی فکر ماورائے حقیقت، قصص اور مذہبیت کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

"کدم راؤ پدم راؤ" بہمنی دور کی واحد مستند تصنیف ہے۔ جس میں فخر دین نظامی نے ایک محیر العقل کہانی کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی بہمنی سلاطین کے سلسلے میں نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے میں لکھی گئی جس کا عہد ۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۴ء تک تھا۔

کسی بھی ادبی متن یا فن پارے کو اس کے زمان و مکان، تاریخی واقعات اور تہذیبی و ثقافتی اثرات سے مبرا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اولاً ادبی فن پارے کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کے بارے میں واقفیت ضروری ہے جب کہ فن پارے کو پرکھنے کے لیے اسی دور کے مروجہ رسم و رواج، تہذیبی اور لسانی عوامل کو نظر میں رکھ کر ہی متن کی تفہیم تک رسائی ممکن ہو پاتی ہے۔ "کدم راؤ پدم راؤ" بھی ایک ایسی ہی لسانی و تہذیبی پہیلی تھی جس کی قرات اور تفہیم دونوں بظاہر ناممکن نظر آتی تھیں۔

یہ ایک عام داستانی قصہ ہے جس سے جہاں اخلاقی نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں وہاں یہ بھی پتہ چلا کہ اس زمانے میں ہندو مسلم نہ صرف مساوات کے قائل تھے بلکہ ایک دوسرے کے مذہبی نظریات کا احترام بھی کرتے

تھے۔ کہانی میں مسلمانوں کے روایتی اور مذہبی واقعات کی بھی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ خالص ہندوی اسلوب کی حامل مخصوص ثقافتی طرزِ فکر کی علم بردار یہ مثنوی اپنے عہد کی نمائندہ ہے۔

قدامت کے اعتبار سے دوسری قابل ذکر دکنی بازیافت "نوسرھار" ہے۔ جسے اشرف بیابانی نے (۱۵۰۳ء/ ۹۰۹ھ) میں مکمل کیا۔ اس مثنوی میں واقعہ کربلا کو بنیاد بنایا گیا ہے مگر رنگینی بیان کے لیے بہت سے غیر تاریخی اور غیر مستند واقعات بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر ایک مرثیہ ہے بلکہ اب تک کہ بازیافت شدہ مرثیوں میں قدامت کے اعتبار سے سب سے قدیم مرثیہ ہے۔ اپنے موضوع سے قطع نظر لسانی نقطہ نظر سے یہ ایک اہم تصنیف ہے جو زبان کے ارتقا اور ادبی روایت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

"کدم راؤ پدم راؤ" اور "نوسرھار" کے درمیان طویل وقفہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں بھی ادبیات تخلیق ہوئی ہوں گی، مگر ہمیں جو تصانیف دستیاب ہوئی ہیں ہمیں ان ہی پر اکتفا کرنا ہے۔

"دکنیات" اصطلاحاً اس سرمایہ ادب کو کہا جاتا ہے جو جنوبی ہندوستان میں تخلیق پایا۔ مولوی عبد الحق نے حقیقتاً اس سرمایہ ادب کو عوام الناس کے سامنے پیش کیا۔ ورنہ اس سے قبل ولی دکنی کو ہی شاعری کا باوا آدم مانا جاتا تھا مگر دکنی ادب کی بازیافت کے بعد اردو ادب کی تاریخ دو سو سال کی مزید وسعت کی حامل ہو گئی۔

مولوی عبد الحق نے دکنی ادب کے بہت سے مخطوطات اور کتب اور قلمی کتب کا ذخیرہ جمع کیا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس اردو ادب کو جسے قدیم ادب یا دکنیات سے موسوم کیا گیا تھا دنیا کیس امنے لانا چاہیے۔ تاکہ دنیائے ادب کو یہ معلوم ہو سکے کہ شمالی ہند میں ادبی ترقی سے قبل دکن میں اردو زبان میں ایسے ایسے ادبی شاہکار تخلیق ہو چکے تھے جو کسی بھی زبان کی تخلیق وسعت کا ثبوت ہوتی ہے۔

نویں، دسویں اور گیارہویں صدی میں دکن میں جو ادب تخلیق ہوا اس میں تمام اصناف سخن شامل تھیں۔ نثری رسائل جن میں سے اکثر کا موضوع تصوف تھا، مثنویاں جو طویل داستانوں کے اظہار کا ذریعہ تھی اور اس عہد کی غالباً سب سے مقبول صنف سخن تھی، پھر اس عہد کی جو تصویر کشی ان مثنویوں میں ملتی ہے وہ اس کی سیاسی پس منظر اور مذہبی روایات کی بھی عکاس ہے۔ ان مذہبی رسائل اور شعری نمونوں سے اس دور کے لسانی شعور کا بھی پتہ ملتا ہے۔

ان کے موضوعات دینی مسائل، شرعی احکام اور معرفت کی باتوں کو سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں سمجھانے والے انداز میں عام فہم انداز ہے۔ البتہ دین و معرفت کی معلومات ضرور نظر آتی ہیں جب کہ بعض رسائل میں سوال و جواب والا انداز اپنایا گیا ہے۔ اصل مقصد نو مسلموں کو مذہبی مسائل اور

معرفت کے رموز سمجھانا ہے۔ سوال جواب کے اس اسلوب نے ابتدا ہی میں اردو ادب میں مکالمہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔

دکنی روایت میں شعری ادبیات، مثنویوں اور نظموں کی ابتدا میں حمد، نعت اور بعض جگہ کسی بزرگ کی منقبت یا بادشاہ کے قصیدے بھی ملتے ہیں۔ یہ روایت بھی صوفیائے کرام کے مذہبی شعرا کی دلیل ہے۔ لسانی اعتبار سے بھی مختلف زبانوں میں یگانگت کے آثار پیدا ہو کر ایک نئی بین الصوبائی زبان کی نشوونما پانے کے امکانات روشن ہوئے اور اردو علاقائی زبانوں میں مدغم ہو کر وسیع لسانی، معنوی اور اسالیبی تجربات کو برتنے کے قابل ہو گئی۔

قدیم ادب میں مذہبی ترویج کے لیے لکھے گئے رسائل اور مثنویوں میں عموماً املا کی غلطیاں اور شاعرانہ لوازم کا فقدان رہا کیوں کہ اس ادب کی تخلیق کا مقصد تعلیمات کا ابلاغ تھا نہ کر ادبی شاہکار کی تخلیق۔ اس لیے ان ادب پاروں کو اسی تناظر میں دیکھنے پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ شعر و ادب ان کے لیے ثانوی درجہ رکھتا تھا جب کہ پیغام کا ابلاغ اصل ضرورت تھا۔

تحقیق دکنیات سے قبل ولی کو شاعری کا باوا آدم مانا جاتا تھا۔ لیکن دبستان دکن کے چند محققین نے یہ ثابت کیا کہ جب شمالی ہند میں اردو ارتقائی منازل طے کر رہی تھی ٹھیک اسی وقت جنوبی ہند میں اردو سرمایہ ادب اپنے رواج کمال کو چھو رہا تھا۔

سالار جنگ کی سرپرستی اور اعانت سے "مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات" کے تحت بہت سے دکنی ادب پارے شائع ہوئے۔ جن میں کلیات، دواوین، صوفیانہ رسائل اور مثنویاں شامل تھیں۔ یہ وہ ادبی شہ پارے تھے جن کا تعلق بہمنی دور اور بعد ازاں قطب شاہی اور عادل شاہی دور سے تھا۔ ان ادبیات کی دریافت نے تاریخ ادب کو نہ صرف وسعت عطا کی بلکہ تاریخ کی اہم کڑی سامنے آئی جس نے قدیم اور جدید کے درمیانی فاصلے کے تشکیل کو قائم کیا۔

قدیم دکنی زبان میں مقامی الفاظ کی کثرت کی وجہ سے ان متون کی تفہیم کارِ دشوار تھی۔ مگر دکنی مدونین نے ان متون کو مدون و مرتب کر کے سیر حاصل مقدموں کے ساتھ ان شائع کیا۔ بعض متون کا لسانی جائزہ اور آخر میں فرہنگ شامل کرنے سے متون کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا اور اردو ادب میں اس کے مقام کے تعین میں مدد ملی۔

دکنی ادبیات میں تمام اصناف سخن کو مدونین نے مدون و مرتب کیا ہے۔ ان تخلیقات کے مرتب ہونے سے اصناف کی تاریخ اور ارتقا کی ابتدائی کڑیاں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً محمد قلی قطب شاہ کی مسلسل غزلیں جدید نظموں کی ابتدا تھیں یا یہ کہ دکن میں شاعری نثر سے بہت پہلے رواج پا کر ایک خاص معیار متعین کر چکی تھی۔

دکنی ادب میں متنوع موضوعات پر شاعری ملتی ہے۔ خصوصاً مثنویوں کی کثرت ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ مثنوی میں اظہار کے وسیع مواقع موجود ہوتے ہیں۔ دکنی ادب میں حسن و عشق کی داستانیں بھی نظم کی گئیں اور فتح نامہ کے نام سے رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ حسن شوقی کا میزبانی نامہ بھی دکنی معاشرت کا آئینہ دار نظر آتا ہے تو گلشن عشق جیسے عشقیہ قصے بھی دکنی ادب کا موضوع رہے۔ "نو سرھار" جیسی مثنوی واقعہ کربلا کے بیان میں مرثیہ نگاری کا اولین نقش بن کر سامنے آئی۔ "کدم رائو پدم رائو" بہمنی دور کی اسلوب نگارش کا نمائندہ اور اپنے عہد کے لسانی و فکری ارتقا کی عکاس ہے۔

دکنی محققین کے لیے قدیم شعرا اور مصنفین کے حالات کا حصول بھی جوئے شیر لانے کے مترادف رہا۔ اکثر قدیم مصنفین کے حالات پردہ اخفا میں ہیں۔ جن کے لیے اکثر متون کی داخلی شہادتوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ دکنیات کی ابتدا میں کی گئی تحقیق بہت اعلیٰ معیار کی حامل نہیں ہے مگر اس وقت تحقیق کے اصول و ضوابط اور سائنسی طریقے ناپید تھے۔ لہٰذا جو بھی کام اس زمانے میں ہوا وہ بہت غنیمت ہے۔ اس حوالے سے یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ دکنی محققین نے جو کتب مرتب کیں ان کی ابتدا میں طویل مقدمے شامل کیے گئے جو کہ محققین کی تمام تر معلومات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ ان مقدموں میں مصنفین یا شعرا کے حالات، سیاسی پس منظر، شخصیت، ماخذ، خصوصیات کلام، لسانی مطالعہ، دستیاب نسخوں کا تعارف اور تحقیقی طریقہ کار سب کچھ شامل کر لیا جاتا ہے، اس طرح یہ مقدمے باقاعدہ ایک تحقیقی مضمون کی صورت اختیار کر جاتے ہیں اور نہ صرف وہ مخصوص تصنیف جس پر مقدمہ تحریر کیا گیا ہو، بلکہ دوسری تصانیف کے لیے بھی ایک ماخذ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ نظامی، حسن شوقی، غواصی، وجہی، نصرتی اور ابن نشاطی وغیرہ کے حالات ان کے کلام کی داخلی شہادتوں سے ہی اخذ کیے گئے ہیں جبکہ بعض مشہور شخصیات کے کلام کے سلسلے میں اخذ کیے گئے ہیں جبکہ بعض مشہور شخصیات کے کلام کے سلسلے میں سیاسی حالات اور تواریخ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ فتح نامہ نظام شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے حالات کے ذیل میں حقیقی واقعات سے مصنفین کے حالات اخذ کیے گئے۔

گول کنڈہ (قطب شاہی) اور بیجاپور (عادل شاہی) علم و ادب کے دو اہم مراکز تھے۔ یہاں کے سلاطین نہ صرف علم پرور تھے بلکہ خود بھی اعلیٰ درجے کے عالم فاضل اور ادبی ذوق کے حامل تھے۔

دکنی زبان آج کی مروجہ زبان سے مختلف زبان تھی جس کی بنیادی وجہ مقامی زبانوں کے الفاظ کا بکثرت استعمال تھا۔ مقامی زبانوں کا اردو کے ساتھ اختلاط جہاں اردو زبان کی وسعت کا باعث بنا وہیں دیگر مقامی اور علاقائی زبانوں کی آمیزش نے متون کی خواندگی کو مشکل تر کر دیا۔ ہر زبان کے قواعد اور صرف و نحو کے اصول بھی مختلف تھے۔ جن کو ان کے عہد میں تو پڑھا جا سکتا ہو گا مگر تین ساڑھے تین سو سال بعد ان کی تفہیم مشکل ترین ہو گئی۔

فاضل محققین نے اس مسئلہ کا یہ حل نکالا کہ اکثر متون کے آخر میں دکنی الفاظ کی فرہنگ اردو معانی کے ساتھ شامل کر دی۔ دوسرے لسانی مطالعہ کے تحت اس دور کے مروج الفاظ، افعال، جملوں کی بناوٹ، جمع بنانے کے طریقے، محاورات اور ضرب الامثال وغیرہ کو مقدموں میں شامل کیا اور ضروری توضیح کی۔ اس طرح قدیم ادبیات کی تفہیم میں کچھ آسانیاں پیدا ہو سکیں۔

دکنی محققین کا ایک رجحان یہ بھی رہا ہے کہ انھوں نے مختلف شعرا کے کلام کے موازنے اور تقابل سے بھی نتائج اخذ کیے ہیں۔ شاہ قاسم علی قاسم کے حالات کے ضمن میں سخاوت مرزا نے اس عہد کے دیگر شعرا کے کلام سے بھی موازنہ کیا ہے۔ غواصی کی سیف الملوک اور ابن نشاطی کی پھول بن کا موازنہ کیا گیا۔ مولوی عبدالحق نے چمنستان الشعرا کو مرتب کرتے ہوئے متعلقہ شعرا کے تراجم تحفہ الشعرا (افضل بیگ خان تاقشال) سے حواشی میں درج کیے۔ بعض اوقات کسی نئی بات کے انکشاف پر اپنی ہی تحقیق کو رد کر کے، نئی تحقیق پر دوبارہ مقالات لکھے گئے۔

تحقیق کے عمل میں تسلسل بھی اہمیت رکھتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ دکنی محققین میں یہ تسلسل نظر آتا ہے۔ "قطب مشتری" کو مولوی عبدالحق کے بعد حمیرا جلیلی نے مرتب کیا۔ نصرتی کی "گلشن عشق" کو مولوی عبدالحق کے بعد سید محمد نے مرتب کیا۔ کلیات شاہی کو مبارز الدین رفعت اور زینت ساجدہ نے مرتب کیا۔ "نصرتی" کے حالات پر مولوی عبدالحق نے لکھا بعد ازاں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اسی موضوع پر لکھا۔ روز بہ روز نئی معلومات، نئے نسخوں اور نئے مخطوطات کی مدد سے خوب سے خوب تر کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس ضمن میں نئے امکانات کا در کھلا ہے۔

دکنیات کے اس ذخیرہ ادب سے اردو زبان کے دیگر زبانوں سے لسانی اور تہذیبی روابط کا بھی پتہ چلتا ہے۔ صرف و نحو میں مماثلت اور اختلافات بھی واضح ہوتے ہیں۔ اردو زبان اگرچہ مختلف زبانوں کا مرقع ہے مگر ہر عہد میں مختلف ارتقائی صورتیں سامنے آتی رہی ہیں۔ جو اپنے اپنے عہد میں لسانی ترقی کی دلیل ہیں۔ جب ایک

زبان کے الفاظ دوسری زبان میں خوب ہوتے ہیں تو لفظیات کے اضافے کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان اور نئی نئی معنوی وسعتیں اور اظہار بیان کی نئی نئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔

اس تحقیق میں سوانح، تذکرہ، مثنوی، شاعری اور لغت کی اضافت کو شامل کیا گیا ہے۔ سوانحی تذکرے میں تو ادبی کارفرمائیوں کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ اصل حقائق کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ مگر تذکرے کے ذیل میں جن تذکروں کو شامل تحقیق کیا گیا ہے ان میں "تذکرہ عروس الاذکار" اور "حدیقہ المرام" ہیں۔ "حدیقہ المرام" بنیادی طور پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ ہے۔ اس ترجمے نے کچھ ایسے شعرا کے حالات بھی بیان کیے ہیں جن کا ذکر کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا۔ کوئی بھی تذکرہ اس حوالے سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ مگر تذکرہ عروس الاذکار اور حدیقہ المرام عہد کے فرق کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا بھی تفرق رکھتا ہے۔ قطع نظر اس کی اکملیت کے یہ تذکرے طرز بیان اور الفاظ کے انتخاب کی بنا پر اپنے عہد کے لسانی شعور کے عکاس ہیں۔

دراصل تحقیق جس قدر توجہ کی طالب تھی ہم نے اسے وہ اہمیت نہیں دی یہ ہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں تحقیق کا معیار تسلی بخش نہیں ہے۔ تحقیق کے لیے مواد اور بنیادی کتابوں تک رسائی جیسی سہولیات ہمارے یہاں موجود نہیں ہیں۔ ہمارے ادب، ثقافت اور خصوصاً تاریخ سے متعلق بے شمار مخطوطات جو بنیادی ماخذ ہو سکتے تھے وہ انگلستان، انڈیا، آفس لائبریری، فرانس، جرمنی، ایرانی اور ہندوستان وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ ایک عام طالب علم کی رسائی وہاں تک ممکن ہی نہیں ہے۔ ہماری حکومت کو چاہیے تھا کہ ان قابل توجہ اہم مخطوطات کی مائیکر فلمز بنوا کر اپنے ملک کے مرکزی کتب خانوں میں رکھتے تا کہ ہمارے اہل علم ان سے استفادہ کر سکتے۔ ان اہم مخطوطات اور ماخذ تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم تحقیقات کے اس معیار کو قائم کرنے سے قاصر ہیں جو ہمیں ہندوستان یا مغربی مفکرین کی تحقیق میں نظر آتی ہیں۔

ہم میں سے بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ ہمارے قومی عجائب گھر، کراچی میں تقریباً بارہ تیرہ ہزار مخطوطات موجود ہیں جن کی آج تک درجہ بندی ہی نہیں ہوئی۔ ان تک رسائی ہی ناممکن ہے۔ پھر یہاں ببلو گرافی کا بھی کچھ زیادہ رواج نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے یہاں تحقیق کی وہ سہولیات میسر نہیں جن کے تحت تحقیق کے معیار کو بلند کیا جا سکتا۔

اس تناظر میں ہمارے یہاں تحقیق کا کام سست روی کا شکار ہے جب کہ معیاری تحقیق بھی نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ گزشتہ چالیس پنتالیس برسوں میں کچھ نئے رجحانات کا اضافہ ہوا ہے اور ان رجحانات میں کچھ معتبر محققین بھی سامنے آئے ہیں جنھوں نے تحقیق میں ایک معیار قائم کیا اور وہ اصول وضع کیے جو بعد کے

آنے والوں کے لیے قابل تقلید بنے۔ ان میں حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبد الحق، قاضی عبد الودود اور امتیاز علی عرشی کے نام قابل ذکر ہیں اور ان کی روایت کے مقلدین میں سخاوت مرزا، افسر صدیقی امروہوی اور جمیل جالبی، سلطانہ بخش اور حمید الدین شاہد کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اب سے چالیس پچاس سال قبل تک مختلف مخطوطات کے تعارف میں جو مقالات لکھے جاتے تھے وہ فہرست اسی ایک مخطوطے کی داخلی وخارجی شہادتوں پر انحصار کر کے لکھے جاتے تھے مگر بتدریج یہ رجحان تبدیل ہوا اور اب کسی مخطوطے یا قلمی کتاب کا تعارف کرانے کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ محقق اسی نسخے کے تمام مخطوطات کی نشاندہی کرے اور یہ کہ وہ کہاں کہاں موجود ہیں۔ اس مخطوطے کا ذکر کن کن کتابوں میں ملتا ہے۔ ممکنہ سن تصنیف کا تعین اور مصنف کے تعارف میں معتبر حوالے فراہم کرنا بھی محقق کی ذمہ داری ہے۔ مزید برآں نسخے کا لسانی تجزیہ کہ متن پر کس کس زبان کے اثرات ہیں اور متن کی زبان میں آج کی زبان میں کیا کیا اختلاف و مماثلات ہیں اور ان کی کیا وجوہ ہوسکتی ہیں۔

اب سے پچاس سال قبل تک تحقیق کا وہ معیار اور اہمیت نہیں تھی جو کہ آج ہے، پہلے وقتوں میں کسی ایک نسخے کو لے کر متن ترتیب دے دیا جاتا تھا اور اگر کوئی دوسرا نسخہ میسر آگیا تو اس سے تقابل کر کے حواشی میں اس کا حوالہ دے دیا جاتا۔ اس طریقہ میں متن کی تفہیم سے زیادہ نسخے کی پیش کش اہم لگتی تھی اور ابتدا میں تھا بھی کچھ ایسا۔ مگر اب مرتب یا مدون کی پہلی ترجیح یہ ہوتی ہے کہ مخطوطے کی زیادہ سے زیادہ نسخوں تک رسائی کو ممکن بنائے ان کے حصول کے بعد ان کی مدد سے ایک مستند متن ترتیب دے اور تعلیقات میں ضروری معلومات درج کی جائیں۔ یہ بڑا صبر آزما محنت طلب اور زیرک بینی کا متقاضی کام ہے۔ اس ضمن میں تذکروں کی از سر نو اشاعت بھی قابل توجہ ہے۔ قدیم تذکرے جوں کہ توں شائع کر دیئے گئے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر متن کی تدوین نہیں بلکہ اشاعت تھی۔ مگر اب اس رجحان میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ تذکروں اور اہم ماخذ کی مستند اور معتبر طور پر مرتب کیا جانے لگا ہے۔ اس حوالے سے مولوی عبد الحق کے مرتب کردہ تذکروں کی مثال دی جاسکتی ہے جن میں چمنستان الشعرا، مخزن نکات اور نکات الشعرا شامل ہیں۔ "عروس الاذکار" میں بھی فاضل مرتب نے کئی تسامحات کی نشاندہی کی اور "حدیقہ المرام" کے آخر میں ان شعرا کا ذکر ہے جن کو اس تذکرے میں شامل ہونا چاہیے تھا۔

گزشتہ چند برسوں میں تحقیق میں تحدید اور دائرہ کار کو متعین کرنے اور ایک مخصوص نکتہ پر تحقیق کو مرکوز کرنے کا رجحان بھی بڑھ گیا ہے۔

ایک رجحان یہ بھی سامنے آیا ہے کہ دکنیات کے مدونین طویل مقدمہ لکھنے کو بھی عالمانہ کام سمجھنے لگے ہیں۔ اگرچہ مقدمہ میں ضروری معلومات کا ذکر ہوتا ہے مگر بعض جگہ غیر ضروری طور پر بات کو طول دیا جاتا ہے۔ مقدمے کا طویل ہونا اہم نہیں ہوتا۔ جامع ہونا ضروری ہے۔ ہمارے یہاں کچھ سالوں سے تنقید کی بنیاد تحقیق پر رکھنے کا رجحان بھی تیزی سے رواج پاتا چلا گیا ہے۔ یہ رجحان مثبت نتائج کا حامل ہے۔ اس رجحان کے تحت جو بات کی جاتی ہے اس کی درستی کو پہلے ہی تنقید کے پیمانے سے گزار کر نتائج کی صحت کو مسلم کر لیا جاتا ہے جس سے مفروضات اور قیاسات پر انحصار کم ہو گیا ہے یہ ایک خوش آئند رجحان ہے۔

جدید تحقیق میں ضروری انداز نظر کو اپنایا گیا ہے اور کسی بات کو قبول کرنے سے پہلے پوری طرح پرکھ کر نتائج کا استخراج بھی ایک صحت مندانہ اور مثبت عمل ہے۔ آزادی سے قبل مدونین کے لیے اہم بات قدیم تصانیف کی اشاعت تھی اور بہت سے ایسے متون اور تصانیف سامنے آئیں جن کی تدوین نہیں بلکہ صرف تعارف کرایا گیا تھا۔ اس طرز عمل نے مخطوطات کو تصانیف کا جامعہ تو عطا کر دیا مگر اب ایک نیا رجحان یہ ہے کہ ان تصانیف کو دوبارہ مرتب و مدون کر کے شائع کیا جا رہا ہے جو کہ اصل مفہوم کی تفہیم تک رسائی کے لیے لازم تھا۔ مختصر یہ کہ یہ رجحانات آنے والے دور کے محققین اور ناقدین کے لیے مشعل راہ ہے۔ جو قاری کو قدیم ادب کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کی تحریک دیتے ہیں۔

ب۔ نتائج:

گزشتہ باب میں تحقیق دکنیات کا مجموعی جائزہ تفصیلی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تحقیق سے سامنے آنے والے حاصلات کچھ یوں ہیں:

ا۔ "دکنیات" اصطلاح ہے۔ اس قدیم ادب کی جو اردو ادب کے ابتدائی عہد میں سر زمین دکن میں تخلیق ہوا۔ یہ ہی دراصل اردو ادب کا نقطہ آغاز تھا۔

۲۔ پاکستان میں ہونے والی تحقیق دکنیات میں تقریباً تمام اصناف سخن کو مرتب و مدون کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض کو صرف اختلاف نسخ اور ایک آدھ حاشیہ تک محدود رکھا گیا جب کہ بعض ادبیات کو وقیع معلومات کے ساتھ مدون کیا گیا ہے مگر ان میں بھی مزید بہتری کے امکانات موجود ہیں۔

۳۔ سخاوت مرزا کی تحقیق کی خاص بات ان کے مقدمے ہیں جو انھوں نے اپنے وسیع علم کی بنیاد پر تحریر کیے جن میں موضوع کے مطابق اہم معلومات بہم پہنچانے کی سعی، موثر نظر آتی ہے۔ افسر صدیقی کی

تالیفات میں تدوین سے زیادہ پیش کش کا انداز ہے۔ بیاض مراثی اور سنگھاسن بتیسی کی تدوین و تالیف میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق و تدوین میں شیرانی کے اصولوں کو مد نظر رکھا ہے ان کی تحقیق میں ادب اور تاریخ کے رشتے باہم مل کر ادب کی تخلیق و بازیافت کرتے ہیں۔ بطور محقق زیر مطالعہ محققین کی تحقیق جدید تحقیقی رجحانات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے تحقیق میں تاریخ اور تہذیبی و قوعات کی واضح تفہیم کی ہے جو قدیم ادب کی تحقیق کی راہ میں ایک مثبت قدم ہے۔

۴۔ متذکرہ محققین نے تحقیق دکنیات میں ایک خاص ادبی دور کا مطالعہ کرتے ہوئے اس دور کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی عوامل کو مد نظر رکھا ہے۔ انھوں نے تاریخ میں مضمر حقائق کو خاص ادبی دور سے مربوط کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ ان کی تحقیق ان رجحانات کی کسی نہ کسی سطح پر نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ جس میں بنیادی اہمیت تو متن کو حاصل ہے مگر ادب پر اثر انداز ہونے والے محرکات اور عوامل بھی اہم ہیں۔ ان محرکات کا غائر مطالعہ تحقیق میں نئے امکانات کا دروا کرتا ہے۔

ج۔ سفارشات:

۱۔ دکنیات کی تحقیق کے لیے جن قدیم مخطوطات، کتب اور تحقیقی مقالات اور تحقیقی مواد کی ضرورت ہوتی ہے ان تک رسائی کی سہولت ہمارے یہاں موجود نہیں۔ ہمارے ادب، تاریخ اور ثقافت جیسے موضوعات سے متعلق بے شمار مخطوطات جو بنیادی ماخذ ہو سکتے تھے وہ فرانس، انگلستان، جرمنی، ایران اور ہندوستان وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ اگر ان میں سے اہم مخطوطات کی مائیکرو فلمز بنوا کر اپنے ملک کے مرکزی کتب خانوں میں رکھ دی جائیں تو اہل علم ان سے استفادہ کر کے تحقیق کے معیار کو بہتر بنا سکیں گے۔

۲۔ ہمارے قومی عجائب گھر کراچی میں قدیم کتب کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں قدیم مخطوطات موجود ہیں جن کی آج تک درجہ بندی ہی نہیں کی گئی۔ جامعات کے وہ طلبا جو تحقیق میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ اگر حکومت کے تعاون سے یا رضاکارانہ طور پر اس ذخیرہ کتب کی درجہ بندی کر کے فہرست تیار کر سکیں۔ قدیم ادب پر تحقیق کے دائرے کو مزید وسیع کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ دکنی ادب کے بے شمار مخطوطات کا وسیع ذخیرہ انجمن ترقی اردو میں بھی موجود ہے جن تک رسائی بھی ممکن ہے۔ ان میں سے اہم مخطوطات اور بیاضوں کو مرتب کیا جانا چاہیے۔

۴۔ بعض اہم تصانیف جن کو بیسویں صدی کی ابتدا میں مرتب و مدون کیا گیا تھا ان کو دوبارہ جدید تحقیقی اصولوں پر مرتب کر کے تحقیقی میدان میں نئے انکشافات کے امکان کو بعید از قیاس نہیں سمجھا جاسکتا۔

۵۔ "اردو کے لسانی رشتوں کا مقامی عناصر سے تعلق" کے موضوع پر کئی زاویوں سے تحقیق کے امکانات موجود ہیں۔

۶۔ دکنی زبان کی لغت اور اصطلاحات سازی پر کام ہونا چاہیے۔

۷۔ "دکنیات" کی وہ اہم تخلیقات جو دکنی ادب کا رابطہ جدید ادب سے مربوط کرتی ہیں ان کی دوبارہ جدید اصولوں پر تدوین و تالیف ہونے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تحقیق میں بہتری کی گنجائش بہر حال رہتی ہے۔

۸۔ دکنی صرف و نحو پر معیاری کام اردو لسانیات کے لیے نئے امکانات کے در وا کرتا ہے لہٰذا دکنی لسانیات پر کام کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

افسر صدیقی امروہوی، (مرتب) تذکرہ عروس الافکار، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۵ء

افسر صدیقی امروہوی، (مرتب)، سنگھاسن بتیسی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۸۴ء

افسر صدیقی امروہوی، (مرتب)، نوسرہار، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۸۲ء

افسر صدیقی امروہوی، (مولف)، بیاض مراثی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۵ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قدیم اردو کی لغت، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۳ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مرتب) کدم راؤ پدم راؤ، انجمن ترقی اردو، پاکستان ۱۹۷۳ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مولف)، دیوان حسن شوقی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۱ء

جمیل جالبی، ڈاکرٹ، (مرتب)، دیوان نصرتی، قوسین، لاہور، ۱۹۷۲ء

سخاوت مرزا، مخزن اسرار حقیقت، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۳۷۵ھ

سخاوت مرزا، (مترجم)، حدیقہ المرام از مہدی واصف مدراسی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۹ء

سخاوت مرزا، (مرتب)، دیوان قاسم، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۵ء

سخاوت مرزا، (مرتب)، من لگن، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۵۵ء

ثانوی ماخذ:

اسد علی خان تمنا، گل عجائب، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن ۱۹۳۶ء

افسر صدیقی امروہوی، فہرست مخطوطات، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۵ء

انور سدید، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، پاکستان رائٹرز، کواپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۶ء

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، پنجاب یونیورسٹی پریس، جلد اول، ۱۹۷۲ء

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، پنجاب یونیورسٹی پریس، جلد دوم، ۱۹۷۲ء

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، پنجاب یونیورسٹی پریس، جلد سوم، ۱۹۷۲ء

تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

ٹامس گراہم بیلی، تاریخ ادبیات اردو، سٹی بک پوائنٹ، لاہور، ۲۰۱۷ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۴ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۲ء
رئیس فاطمہ، حکیم محمد سخاوت مرزا(دکنی ادب کا معتبر محقق)، حیدر آباد، دکن، ۲۰۰۶ء
سید شاہ عطاالرحمن عطا کاکوی (مرتب)، تذکرہ چمنستان الشعرا، عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج، پٹنہ، ۱۹۶۸ء
سید فتح علی حسینی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، انجمن ترقی اردو ہند، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء
سید ہاشمی فرید آبادی، پنجاہ سالہ تاریخ، انجمن ترقی اردو، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۵۳ء
سیدہ جعفر، بیسویں صدی صدی میں اردو تحقیق، پاکستان وہندوستان میں اردو تحقیق وتنقید کا مطالعہ، ادارہ یادگار غالب، ۲۰۱۳ء
سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، جلد اول، قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۶ء
سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۶ء
سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۶ء
سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، جلد ششم، قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۶ء
شمس الرحمن فاروقی، اردو کا ابتدائی زمانہ: آج پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۹ء
شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، مطبع نول کشور، لکھنو ۱۹۶۷ء
شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۶ء
عظمت رباب، ڈاکٹر، اردو تدوین متن کی روایت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی منظوم داستانیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۲ء
قاضی نور الدین فائق، تذکرہ مخزن الشعرا، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۵ء
کلام حیدری، تذکرہ شعرائے گجرات، دی کلچرل اکیڈمی جگجیون روڈ، گیا، ہندوستان، ۱۹۸۳ء
کلیم الدین احمد، (مرتب) دو تذکرے، لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۵۹ء
گوپی چند نارنگ، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، قومی کونسل برائے فروغ اردو، زبان، ۲۰۰۱ء
گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۹۳ء
گیان چند جین، اردو کی نثری داستانیں، اترپردیش، اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۷ء
محمد خاور جمیل، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ایلیٹ پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۶ء
محمد علی اثر، ڈاکٹر، دکنی شاعری: تحقیق وتنقید، حیدر آباد، دکن، ۱۹۸۸ء
محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، (مترجم، مولوی محمد فدا)، جلد اول، مشتاق بک ڈپو، لاہور، ۲۰۱۲ء

محی الدین قادری زور، اردو شہ پارے، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد، دکن، ۱۹۲۹ء
مسیح الزمان، اردو مرثیہ کا ارتقا: ابتدا سے انیس تک، کتاب گھر لکھنو، ۱۹۶۸ء
معین الدین عقیل، ڈاکٹر، اردو تحقیق، صورت حال اور تقاضے، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء
معین الدین عقیل، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو تحقیق: موضوعات و معیار، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۷ء
مولانا حکیم سید عبد الحق، تذکرہ گل رعنا، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
مولوی عبد الحق، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد دوم، لاہور، ۱۹۶۶ء
مولوی عبد الحق، خطبات گارساں دتاسی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۵ء
مولوی عبد الحق، (مرتب)، سب رس، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۲ء
مولوی عبد الحق، (مرتب)، قطب مشتری، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۶۱ء
مولوی عبد الحق، (مرتب)، گلشن عشق، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۵۲ء
نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، اردو اکیڈمی سندھ، پاکستان، ۱۹۶۰ء
نواب شہید یار جنگ، دکن کے شاعر: اردو کے شعرا کا منظوم تذکرہ (حصہ دوم)، عوامی پریس، چھتہ بازار، حیدر آباد، دکن، س ن
نور الحسن نقوی، پروفیسر، تاریخ ادب اردو، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر اسٹڈیز، میر پور خاص، ۲۰۱۵ء
وحید قریشی، ڈاکٹر، تحقیقی مقالات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء
وہاب اشرفی، تاریخ ادب اردو (ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک)، جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء

مخطوطات:

شاہ قاسم، دیوان قاسم، انجمن ترقی اردو، پاکستان
محمود بحری، من لگن، انجمن ترقی اردو، پاکستان

لغات و فرہنگ:

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قدیم اردو کی لغت
مسعود حسین خان و غلام عمر خان، دکنی اردو کی لغت، حیدر آباد، دکن، ۱۹۶۹ء
منیر عارفی، دکنی فرہنگ، حیدر آباد، دکن، ۱۹۷۴ء

رسائل ومجلات:

اردونامہ، کراچی

اردو، کراچی

العلم، کراچی

النور، حیدر آباد، دکن

اورینٹل کالج میگزین، لاہور

برہان، دہلی

بصائر، کراچی

رسالہ اردو، اورنگ آباد

سب رس، حیدر آباد، دکن

صحیفہ، لاہور

قومی زبان، کراچی

ماہ نو، کراچی

معارف، اعظم گڑھ

نوائے ادب، بمبئی

ہماری زبان، دہلی

ضمیمہ

سر زمین دکن کا جغرافیہ اور سیاسی عوامل:

برصغیر کی جغرافیائی تقسیم پر نظر ڈالیں تو مشرق سے مغرب کی طرف بہنے والا دریا نربدا،برصغیر کو دو متوازی حصوں میں شمالاً جنوباً تقسیم کرتا ہوا نظر آئے گا۔جب کہ کوہ بندھیا چل کا پہاڑی سلسلہ بھی اس قدرتی جغرافیائی تقسیم کو تقویت دیتا ہوا نظر آتا ہے۔

بقول جمیل جالبی:

> اگر برصغیر کے نقشے پر نظر ڈالیں توکوہ بندھیا چل سے،جو گجرات کے شمال مغرب سے مشرق کو گنگا تک چلا گیا ہے،برصغیر کے شمالاً،جنوباً دو حصے ہو جاتے ہیں۔ایک شمالی ہند اور دوسرا جنوبی ہند۔(تاریخ ادبیات پاکستان و ہند،ص۳۰۲)

دکن کے لفظی معنی جنوب کے ہوتے ہیں،لہذا دریائے نربداکے پار کا جنوبی علاقہ دکن کے نام سے موسوم ہوا جب کہ شمالی حصہ شمالی ہند کہلایا۔دکن کے علاقے میں تخلیق پانے والا اردو ادب دکنیات کہلایا۔اس علاقے میں اردو ادب کی ابتدا کی وجوہات اور تہذیبی و لسانی تبدیلیوں کے نتائج کا جائزہ لینے کے لیے اس دور کے سیاسی حالات کا اجمالی جائزہ پیش کرنا نا مناسب نہ ہو گا۔

جنوبی ہند کا وہ علاقہ جہاں اولاًاردو ادب کی تخلیق ہوئی گجرات کہلاتا ہے۔گجرات دکن کا داخلی شہر ہونے کی وجہ سے فاتحین اور حملہ آوروں کی گزر گاہ رہا۔گجرات پر ۱۰۲۴ءمیں محمود غزنوی نے حملہ کیا،۱۱۷۶ء میں محی الدین محمد بن سام غوری نے حملہ کیا جب کہ۱۱۹۵ء میں قطب الدین ایبک نے گجرات فتح کیا۔مگر سب سے زیادہ جس فاتح نے اس علاقے کو تہذیبی اور لسانی اثرات سے متاثر کیا وہ علاؤ الدین خلجی تھا۔علاؤ الدین خلجی نے ۱۲۹۶ء میں گجرات فتح کیا اور اگلے چند برسوں میں اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتے کرتے پورے مالوہ اور دکن تک اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہ علاقے اس وقت کے دارلحکومت دلی سے کافی دور تھے۔لہذا ان مفتوحہ علاقوں میں حکومت کی گرفت رکھنے اور وہاں کا نظم و نسق چلانے کے لیے علاؤ الدین خلجی نے سو سو گاؤں کے حلقے بنا کر ان پر ایک ایک ترک افسر مقرر کر دیا، جو مرکزی حکومت(شمالی ہند) سے بھیجا گیا تھا۔یہ ترک امیر، امیر صدہ کہلاتا تھا۔ان ترک افسران کے ساتھ ساتھ ان کے متوسلین نے بھی بڑی

تعداد نے بھی ہجرت کی اور دکن کے مختلف علاقوں میں سکونت اختیار کر لی۔ تیس بتیس سال کے عرصے میں وہ اس ماحول میں اس طرح رچ بس گئے گویا یہ ہی ان کا وطنِ ثانی ہو۔وہ خود کو دکنی کہلانے پر فخر کرتے تھے۔یہ ہجرت تہذیبی اور لسانی طور پر بہت سی تبدیلیوں کا باعث بنی،اور اردو کے ابتدائی خط و خال ترتیب پانے لگے۔

محمد تغلق نے جب دلی کی مرکزی حکومت سنبھالی تو اس نے دکن، گجرات اور مالوہ کے علاقوں پر بہتر گرفت رکھنے کے لئے اپنا پایہء تخت ۱۳۲۷ء میں دلی سے دولت آباد منتقل کر لیا۔اس ہجرت کے نتیجے میں حکومتی عمال،وزراء اور ان کے متوسلین کی کثیر تعداد دولت آباد منتقل ہو گئی۔اس ہجرت نے شمالی ہند کے تہذیبی اور لسانی اثرات کو جنوبی ہند کی لسان و تہذیب میں مدغم ہونے کے عمل کو تیز تر کر دیا، اور اردو زبان تیزی سے اپنی ہیئت بنانے لگی۔

۱۳۴۷ء میں امیران صدہ کی بغاوت کے نتیجے میں بہمنی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔اب دکن کی حکومت ان امیران صدہ کے ہاتھ آ گئی جو بنیادی طور پر ترک تھے، مگر طویل عرصے سے دکن میں مقیم ہونے کی وجہ سے یہاں کی زبان و تہذیب کو اپنا کر خود کو دکنی کہلوانے پر فخر کرتے تھے۔یہاں انھوں نے جو حکومت قائم کی اس میں مرکز سے مختلف اپنی شناخت بنانے کی خاطر مقامی عناصر کو فروغ دیا، اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔اردو کو سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے باعث یہاں اردو ادب تخلیق ہونے لگا۔

۱۳۹۷ء میں امیر تیمور کے شمالی ہند پر حملے کے نتیجے میں بہت سے ماہرینِ علم وفن، مذہبی مبلغین اور صوفیائے کرام نے دکن کی طرف ہجرت کی۔بعد ازاں جب ۱۴۱۰ء میں امیر تیمور کے دوبارہ حملے کی خبریں دکن پہنچیں تو فیروز شاہ بہمنی نے امیر تیمور سے سفارت کی اوراسے اپنی وفا داری کا یقین دلا کر اپنے علاقوں کو محفوظ کر لیا۔یوں دکن، گجرات اور مالوہ خطۂ امن بن گئے۔جب امیر تیمور شمالی ہند کی اینٹ سے اینٹ بجارہا تھا تو دکن گوشہء عافیت تھا۔لہٰذا شمالی ہند سے بہت سے اہلِ علم و ہنر،صوفیا اور مشائخ دکن میں جمع ہو گئے۔

ایک طویل عرصے تک شمالی ہند کی مختلف ادوار میں جنوبی ہند ہجرت نے نہ صرف دکن کی تہذیب اور ثقافت کو متاثر کیا بل کہ اردو زبان کی نشو و نما کے لیے ساز گار فضا مہیا کی۔

صوفیائے کرام نے بھی عوام الناس کے درس و تبلیغ کے لیے اسی زبان کہ وسیلہء اظہار بنایا۔پھر سرکاری سرپرستی کی بنا پر تخلیقی ادب فروغ پانے لگا۔بادشاہوں کی ذاتی دلچسپی،امن و امان اور

خوش حالی وہ عوامل تھے جنھوں نے اردو ادب کی تخلیق کو مہمیز کر دیا اور دکن میں ادبی تخلیقات کی ابتدا ہوئی۔جس وقت دکن میں اردو ادب تخلیق پا رہا تھا اس وقت شمالی ہند میں اردو صرف بول چال کا ذریعہ تھی۔اگر اس زمانے میں شمالی ہند میں کوئی ادبی تخلیق ہوئی بھی ہو گی تو سرکاری سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس اہمیت کی حامل نہ تھی کہ اسے محفوظ کیا جاتا۔جب کہ دکنی ادب کسی حد تک دستبردِزمانہ سے محفوظ رہا،اردو ادب کے اولین نقوش کے طور پر ہم آج اسے دکنیات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔